تمام کتابیں بنا مالی فائدے کے پی ڈی ایف کی جاتی ہیں۔

مصنف کی رائے اور کتابی مواد ہمارا متفق ہونا ضروری نہیں
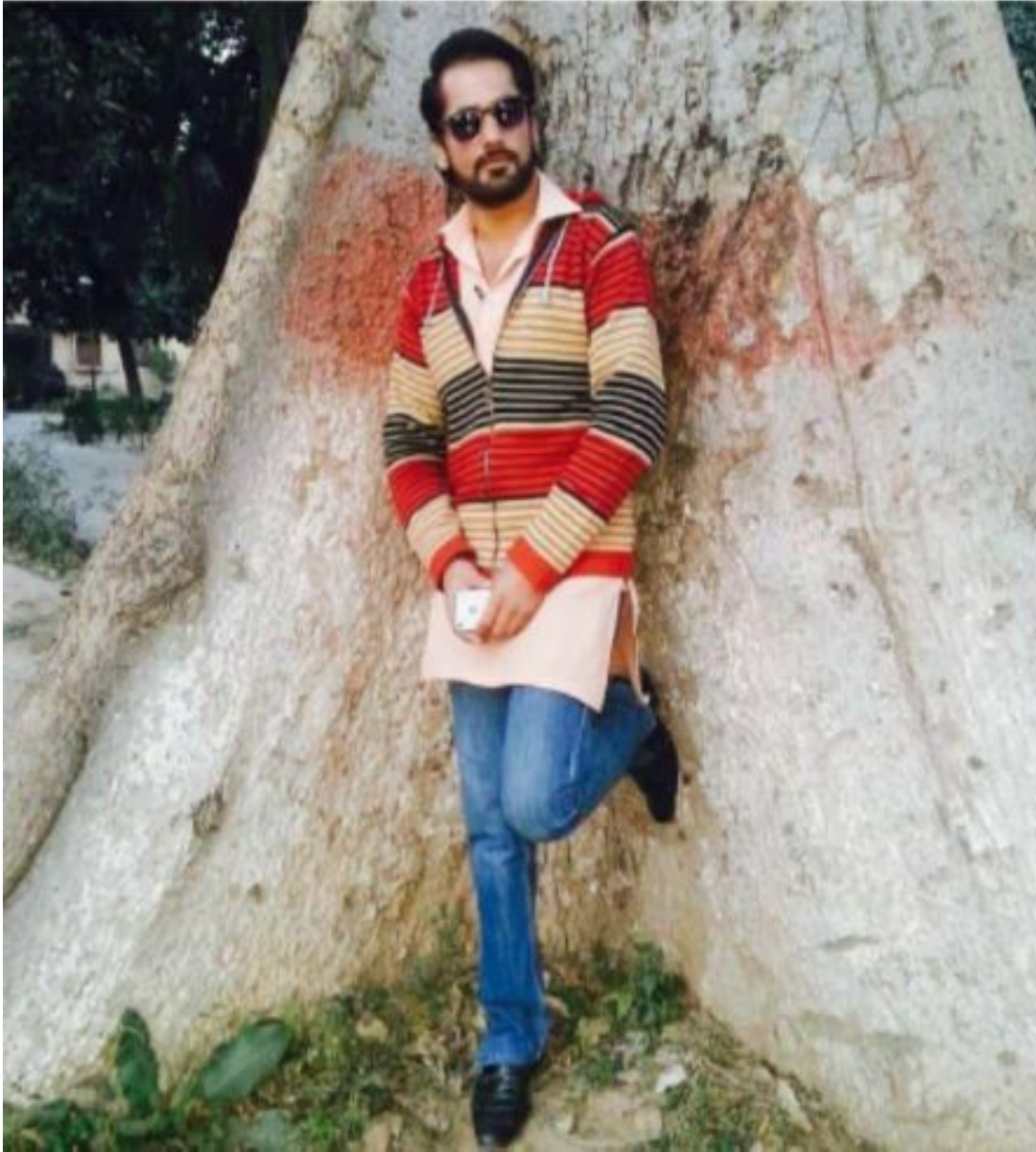
03145951212

03448183736

"آج کل" کی ڈائری سے:

دیوانِ حافظ کی فالیں

از جمشید مسیح الزماں ادیب

فارسی سے دلچسپی رکھنے والوں کا یہ عام خیال ہے کہ خواجہ حافظ کے دیوان میں کچھ ایسی کرامت ہے کہ اُسے بند کر کے جب ایک خاص طریقے سے کھولا جائے تو جو شعر صفحے کے سرے پر نکلتا ہے وہ صراحتاً یا کنایتہً اس امر کے متعلق جو اس وقت پیشِ نظر ہو، صاف خبر دیتا ہے کہ ہوگا یا نہیں۔ اس کا نتیجہ خواہش کے مطابق ہوگا یا خلاف یا فال دیکھنے والے کا خیال صحیح ہے یا غلط اور غالباً اسی خیال کے تحت لوگ اسے لسان الغیب کا لقب دیتے ہیں۔ اس قسم کے فال نکالنے کا لوگوں میں بہت رواج رہا ہے اور اب بھی بعض جگہ ایسے لوگ ملتے ہیں جنہیں اس کا یقین ہے کہ دیوانِ حافظ غیب کی بابت خبر دیتا ہے اور اچھائی برائی سے آگاہ کرتا ہے۔ ایسے سینکڑوں واقعات مشہور ہیں، جب دیوانِ حافظ کی فالیں سچ ہوئی ہیں اور اسی کے مطابق ظہور میں آیا ہے مثال کے طور پر ہم یہاں چند ایسے واقعات پیش کریں گے:

۱۔ ملا محسن نامی شاہ اسمٰعیل صفوی کے دربار کا مشہور ملا تھا اُس نے مقبرہ حافظ کے انہدام کی سعی و کوشش کی اور شاہ کو ابھارا کہ خواجہ حافظ کے کفر و زندقے کی بنا پر اس کی قبر کو بیوندِ زمین کرنا ضروری ہے تاکہ اساس الحاد ابدی طور پر مستاصل ہو جائے۔ شہریار صفوی نے "لسان الغیب" سے استمداد کیا تو یہ نکلا:

اے بگس عرصۂ سیمرغ نہ جولانگہ تست   عرض خود میبری و زحمتِ ما میداری

۲۔ شاہ طہماسپ کے پاس ایک گراں قدر انگوٹھی تھی۔ ایک دن اُسے ہاتھ میں لے کر بادشاہ سرور میں تھے کہ انگوٹھی دفعتہً گم ہو گئی۔ بادشاہ نے اس کو بدفالی تصور کیا اور انگوٹھی کی تلاش شروع ہوئی۔ ساری بساط نیچے اوپر کر ڈالی انگوٹھی نہ ملی۔ دیوانِ حافظ سے پوچھا تو یہ شعر نکلا:

دلے کہ غیب نمایست و جام جم دارد   ز خاتمے کہ دمے گم شود چہ غم دارد

بادشاہ نے حیرت سے سبحان اللہ کہہ کر زانو پر ہاتھ مارا تو معلوم ہوا کہ شلوار کے نیفے میں موجود ہے۔

۳۔ شاہ عباس کو آذربائیجان کی تسخیر کا خیال رہتا تھا۔ مگر مشکلات کی وجہ سے اس لشکر کشی میں متردد رہتا تھا۔ خواجہ حافظ کا معتقد تھا۔ لشکر کشی کے متعلق دیوانِ حافظ سے استشارہ کیا تو یہ شعر نکلا:

عراق و پارس گرفتی بہ شعرِ خود حافظ   بیا کہ نوبتِ بغداد و وقتِ تبریز است

۴۔ شیخ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ جلال الدین اکبر اور سکندر لودی کی لڑائی میں دیوانِ حافظ میں فال دیکھی گئی کہ لڑائی کا کیا انجام ہوگا۔ اس میں یہ شعر نکلا:

سکندر را نمی بخشند آبے   بہ زور و زر میسر نیست این کار

چنانچہ سکندر کو شکست ہوئی اور اکبر فتحیاب ہوا۔

۵۔ کنعاں بیگ قزلباش کے بھائی کا نام یوسف تھا۔ وہ احمد آباد گجرات کی جنگ میں گم ہو گیا۔ بڑی تلاش کی گئی مگر نہ ملا۔ کنعاں بیگ نے مایوس ہو کر خواجہ کی روح سے استمداد کی تو مندرجہ ذیل شعر نکلا:

یوسفِ گم گشتہ باز آید بہ کنعاں غم مخور   کلبۂ احزاں شود روزے گلستاں غم مخور

اور اتفاق کی بات ہے کہ دوسرے دن یوسف کی خبر مل گئی۔

۶۔ شاہانِ اودھ میں کسی کے زمانے کا یہ واقعہ مشہور ہے کہ محل میں بادشاہ کی بیش قیمت انگوٹھی یا کوئی جواہر گم ہو گیا۔ رات کے وقت اُسے چراغ کی روشنی میں تلاش کیا جا رہا تھا کہ دیوانِ حافظ میں فال دیکھی گئی تو سرِ صفحہ پر یہ بیت برآمد ہوئی:

ز فروغِ چہرۂ زلفش رہ دیں زند ہمہ شب
چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

چنانچہ جس کنیز کے ہاتھ میں شمع تھی اس کے پاس سے گم شدہ چیز برآمد ہوئی۔

۷۔ جنگِ امریکہ کے زمانے میں طہران کے دورِ حدید کے مشہور ادیب بزرگمان نے جنگ کے متعلق خواجہ سے استفسار کیا تو یہ شعر نکلا:

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم
از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

۸۔ مولانا حالی لکھتے ہیں کہ ان کے بڑے بھائی کو جب کہ وہ پولیس میں ملازم تھے۔ اکثر بیمار رہنے کے سبب ملازمت پوری ہونے سے پہلے پنشن لینے اور ڈاکٹری معائنہ کرانے پر مجبور کیا گیا۔ مگر وہ چاہتے تھے کہ جب ملازمت پوری ہو جائے، اُس وقت خود درخواست کر کے پنشن لیں۔ چنانچہ ڈاکٹری معائنے کی تاریخ سے ایک دن پہلے اُنہوں نے دیوانِ حافظ میں فال دیکھی تو یہ شعر نکلا:

ہر چند پیر و خستہ دل و ناتواں شدم
ہر گہ کہ روئے خوبِ تو دیدم جواں شدم

اُنہوں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ ڈاکٹر ان کی خواہش کے مطابق رائے دیدے گا چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

۹۔ مشہور ہے کہ ایک پری رو قبائے زر دوزی پہنے مزارِ حافظ پر آیا۔ مزار پر دیوان موجود تھا۔ اُس نے یوں ہی اُٹھا کر دیکھا تو یہ شعر نظر پڑا:

سرمست در قبائے زر افشاں چو بگذری
یک بوسہ نذرِ حافظِ پشمینہ پوش کن

پری رو ہنس پڑا اور کہا۔ "بچشم! دو بوسہ خواہم داد" اور چلا گیا۔ چند دنوں کے بعد پھر اُدھر سے گزرا تو دیوان دیکھنے کا شوق ہوا۔ اُٹھا کے دیکھا تو یہ شعر سامنے تھا:

گفتہ بودی کہ شوم مست دو بوسہ بدہم
وعدہ از حد بشد و ما نہ دو دیدیم نہ یک

نازنین حیران رہ گیا اور کہا:

"اطاعت دارم اگر سر بوسہ ہم بخواہی بدہم"

اور چلا گیا۔ عرصے کے بعد پھر جب اُدھر سے نکلا تو دیوان کھولا تو یہ بیت نکلی:

سر بوسہ کز دو لبت کردۂ وظیفۂ من
اگر ادا نہ کنی قرض دار من باشی

نازنین بے اختیار تعویذ لحد سے لپٹ گیا اور بار بار اپنے ہونٹوں سے لوحِ مزار کو مس کیا۔

۱۰۔ شیراز کے چند خوش رو باتیں کرتے حافظ کے مزار پر گئے۔ خواجہ حافظ سے پوچھنا چاہا کہ وہ ان میں سے کسے زیادہ پسند کرتے ہیں۔ دیوان کھولا تو یہ شعر نکلا:

شہریست پر کرشمہ و خوباں ز شش جہت
چیزیم نیست ورنہ خریدار ہر ششم

۱۱۔ حسین بزرگمان کا بیان ہے کہ اوائلِ شباب میں اُنہیں سعدی کا

(آگے ص: ۳۰ پر)

جوش نمبر

ایک بین الاقوامی ادبی ماہ نامہ

آجکل
نئی دہلی

ایڈیٹر: محبوب الرحمٰن فاروقی
فون: 387069

سب ایڈیٹر: ابرار رحمانی
فون 388196

جلد: ۵۳ شمارہ: ۹ قیمت: جوش نمبر: دس روپے

اپریل ۱۹۹۵ء چیت بیساکھ شک سمت ۱۹۱۷

تزئین و کتابت: رئیس الاسلام
سرورق: حسن ایس ریاض

آج کل کے مشمولات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

ڈپٹی ڈائریکٹر پروڈکشن: ایس۔ ایم۔ جمیل
بزنس ایگزیکیٹو: وی۔ ایس۔ راوت

کاغذ اور طباعت کی بڑھتی ہوئی گرانی کے سبب
ہمیں ہر ماہ بہت زیادہ خسارہ اٹھانا پڑ رہا ہے۔
اس لئے بحالتِ مجبوری مئی کے شمارے سے آج کل کی
قیمت:
فی شمارہ: پانچ روپے اور
سالانہ: پچاس روپے کی جا رہی ہے۔
قارئین اور ایجنٹ حضرات نوٹ فرمالیں۔

ترسیلِ زر کا پتہ:
بزنس منیجر پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱
مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ:
ایڈیٹر آج کل اردو، پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

ترتیب

عنوان	مصنف	صفحہ
اداریہ	م۔ ر۔ ف	۲
جوش ملیح آبادی:		
شخصیت، تاثرات، یادیں:		
جوش کی شخصیت	آلِ احمد سرور	۳
ایسا کہاں سے لاؤں	ڈاکٹر محمد حسن	۱۰
جوش صاحب	جگن ناتھ آزاد	۱۴
ملازمت کے ادوار:		
جوش اور حیدرآباد	داؤد اشرف	۱۸
جوش سرکاری ملازمت میں	محبوب الرحمٰن فاروقی	۲۴
تاثرات — خودنوشت سے چند اقتباسات	شان الحق حقی	۳۱
جوش کے خطوط:		
بنام بیدی سحر اور شنکر پرشاد	خلیق انجم	۳۵
نقادوں کی نظر میں: تجزیہ:		
جوش کی شاعری	ڈاکٹر گوپی چند نارنگ	۴۴
جوش کی شاعری پر ایک نظر	پروفیسر وارث کرمانی	۵۲
جاہ و جلال کا شاعر	مظہر امام	۵۷
کلامِ جوش میں عورت کا تصور	ڈاکٹر پریم سینی	۶۱
مراثی:		
احساسِ حسن	ڈاکٹر شکیل الرحمٰن	۶۴
حسین اور انقلاب	ڈاکٹر خالد محمود	۶۸
رباعیات:		
ایک نظر	ڈاکٹر یعقوب عامر	۷۳
دوسری نظر	ڈاکٹر منصور عمر	۷۶
خاکہ نگاری:		
جوش کی خاکہ نگاری	ارتضیٰ کریم	۸۴
صحافت:		
جوش اور صحافت	رضوان احمد	۸۶
جوش چند معاصر ناقدین کی نظر میں:		۸۹
مشتے نمونہ از خروارے:		
انتخابِ کلام	جوش ملیح آبادی	۹۱
چند مرکبات	״	
خطابات	״	۹۹
اقوال	״	
وفیات	״	۱۰۱
"کلیم" سے چند اوراق	״	۱۰۶
جوش پر ایک نئی کتاب:	ڈاکٹر ہلال نقوی / سید حسن عباس تہران	۱۱۰
جوش ایک نظر میں:	محمد رضی الدین معظم	۱۱۲
شاعرِ انقلاب	عقیل شاداب	۶۴
ہلو — بنام جوش	تسنیم فاروقی	۸۰
کہتی ہے خلقِ خدا...		۱۱۳

اداریہ

جوش ملیح آبادی شاعر بھی تھے، نثر نگار بھی۔ مدیر بھی، صحافی بھی اور مجاہدِ آزادی بھی۔ زبان کے کھرے تھے۔ مزاج سے پٹھان تھے اور اپنی پٹھانی پر انہیں ناز تھا۔ وہ مجموعۂ اضداد بھی تھے اور اعلیٰ صفات کے مالک بھی۔ ہر میدان کے وہ شہسوار تھے۔ جوش صاحب بہت بڑے شاعر تھے، بہت بڑے انسان تھے۔ بشرطیکہ انہوں نے 'یادوں کی برات' نہ لکھی ہوتی۔ وہ بھی اس لئے کہ اس کتاب کی تصنیف انہوں نے اس وقت کی جب حافظہ ان کا ساتھ چھوڑ گیا تھا، یادداشت کمزور پڑ چکی تھی۔ پرانی باتیں بھول چکے تھے، لیکن ان کا تخیل جوان تھا۔ اور اسی جوان تخیل کی بدولت 'یادوں کی برات' میں انہوں نے اپنے بارے میں جو کچھ لکھا، اپنا اور اپنے معاصرین کا جو خاکہ پیش کیا، اس نے جوش صاحب کے امیج کو کافی نقصان پہنچایا۔

وہ یوسفِ ثانی تھے۔ انہوں نے خود کسی سے کبھی عشق نہیں کیا۔ نازنینوں کے تیر چلانے سے وہ گھائل ضرور ہوتے رہے۔ وہ نرگسیت کا شکار تھے اور تاعمر اپنے سے ہی عشق کرتے رہے۔ وہ ایسے بادہ خوار تھے جو گرم سیال کے رگوں میں دوڑنے کے بعد زیادہ ہوش میں آتے۔ وہ بہر حال مجموعۂ اضداد تھے۔

ان کے حالاتِ زندگی پر نظر ڈالئے اور پھر ان کے آبائی حالات پر نظر ڈالئے جس کا تذکرہ انہوں نے بڑے طمطراق سے اپنی سوانح میں کیا ہے، دونوں ایک دوسرے کی ضد معلوم ہوتے ہیں۔ کہاں تو اتنا بڑا تعلقدار گھرانہ اور کہاں ۷۰۰ روپے کی نوکری۔ کہیں انا کا یہ عالم کہ مولانا آزاد سے ملاقات میں دیر ہونے پر لوٹ جانا اور کہاں یہ عالم کہ روپوں اور پرمٹ کے لئے اپنے دوست شنکر پرشاد کی چاپلوسی کی حد تک خوشامد۔

داستانِ عشق بیان کرنے کا انداز ایسا کہ ان سے زیادہ He-man کوئی دوسرا نہیں پیدا ہوا۔ اور دوسری طرف زن مریدی کا یہ عالم کہ بیگم کے سامنے زبان کھولنے کی ہمت نہیں۔

جوش صاحب لفظوں کے شہنشاہ اور بازیگر ہیں۔ الفاظ ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں اور ایک ہی بات کو، ایک ہی مضمون کو ہزار طرح سے کہنے کی قدرت انہیں حاصل ہے۔ انہوں نے اپنی ایک نظم میں بھی اس کا اعتراف کیا ہے کہ ان کی نازک خیالی ان کے الفاظ کی بازیگری سے بسا اوقات مجروح ہوتی ہے اور ان کی شاعری صرف لفظوں کی بازیگری ہو کر رہ گئی ہے جس میں گہرائی اور گیرائی نہیں۔ اپنے زمانے میں الفاظ اور آہنگ کی گھن گرج کی وجہ سے انہیں جو شہرت حاصل ہوئی، اس سے وہ اپنے کو اقبال سے بھی عظیم تر سمجھنے لگے اور کچھ حد تک اقبال کی شخصیت اور ذات سے انہیں حسد بھی ہونے لگا۔

دراصل جوش صاحب اول تا آخر شاعر تھے اور اردو کے ایسے شاعر جن کے اعصاب پر حسن سوار رہا ہے۔ وہ حسن کے شاعر ہیں، فطرت کی نیرنگیوں میں بھی ان کی نگاہیں حسن و شباب کو تلاش کر لیتی ہیں۔ انقلابی دور میں بھی انہیں انقلاب میں حسن ہی نظر آتا ہے۔ دیہات کا بازار ہو یا سڑک کوٹنے والی مزدورن، اس کے پسینے میں بھی وہ اس کا حسن اور شباب ہی دیکھتے ہیں۔ خطابت ان کی شاعری کی روح کو مجروح کرتی ہے اور شاعری انہیں خطیب بھی نہیں بننے دیتی۔ ان کے ابتدائی دور کے کلام میں فطرت کی نیرنگیوں کا جو تذکرہ ہے۔ اس کی مثال اردو شاعری میں کمیاب ہے۔

جوش صاحب رسالہ "آج کل" کے ایڈیٹر ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۵ء تک رہے۔ اور ان کا نام اس رسالے سے اس حد تک جڑ گیا کہ .... رسالے کی پہچان بن گیا۔ اور یہ اب بھی باقی ہے۔ لوگ اب بھی پوچھتے ہیں کہ آپ کا تعلق اسی رسالے سے ہے جس کے ایڈیٹر جوش صاحب تھے۔ ایسے میں ہم نے اپنا فرض سمجھا کہ جوش صاحب پر ایک خصوصی نمبر شائع کیا جائے۔

اس نمبر کی تحریک جناب جگن ناتھ آزاد صاحب کی وجہ سے بھی ملی جو اکثر و بیشتر ملاقات
صاحب کی ادارت کے زمانے کے
رہتے تھے اور جنہوں نے یہ وعدہ
رے واقعات کو یکجا کر کے
، ہمیں عنایت کریں گے۔ معذول
تو ہمیں نہیں ملا، البتہ اسی موضوع پر وہ ایک کتاب تحریر کر رہے ہیں، جس کے چند صفحات انہوں نے بہت اصرار کے بعد ہمیں عنایت کئے ہیں، ہم اس کے لئے اُن کے شکر گزار ہیں۔ ایک اور وجہ جوش صاحب کی وہ پرسنل فائل تھی جو تلاشِ بسیار کے بعد حاصل ہو سکی۔ اور جسے پڑھنے کے بعد ایک مسکین سرکاری نوکر کی شبیہ سامنے آتی ..... ہم اپنے ڈائرکٹر ڈاکٹر او۔ پی۔ کیجریوال کے ممنون ہیں، جنہوں نے فائل کا مطالعہ کرنے کے بعد اسے شائع کرنے کی ہمیں اجازت دی۔

آج کل کے محدود صفحات میں جوش صاحب کی شخصیت کے گوناگوں پہلوؤں، ۱۹ شعری مجموعوں پر محیط ان کی شاعری کی متنوع خصوصیات اور انتخاب پیش کرنا ناممکن ہے۔ اس خصوصی شمارے میں ہم نے کوشش کی ہے کہ جوش صاحب کی شخصیت کے وہ پہلو سامنے لائے جا سکیں جن پر 'یادوں کی برات' نے ایک دبیز پردہ ڈال رکھا ہے۔ ان کی شاعرانہ عظمت اور ان کی قدر و قیمت کے سلسلے میں اس شمارے میں آپ کو مضامین کم ملیں گے۔ یوں بھی ان کی شاعری پر ابھی تک جو کچھ بھی لکھا گیا ہے .... اس میں کوئی نیا پن نہیں آسکا ہے، وہی باتیں ہیں جنہیں بار بار دہرایا جاتا رہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ جوش صاحب کے کلام کا ایک اچھا اور بھرپور انتخاب شائع کیا جائے اور ان کی شاعری کا آج کے اس بدلے ہوئے ماحول میں از سر نو جائزہ لیا جائے۔

ہم نے کوشش کی ہے کہ جوش صاحب کی شاعرانہ خصوصیات، ان کی صحافتی زندگی، 'کلیم' میں ان کے لکھے اداریے، 'آج کل' میں لکھے گئے تعزیتی کلمات اور ان کی غزلوں (جنہیں عنوان دے کر انہوں نے نظم کہا ہے) کی آپ کو ایک جھلک دکھا سکیں۔

ہمیں اپنے اس کام میں جامعہ ملیہ کے ڈاکٹر خالد محمود سے بہت معاونت ملی ہے۔ ہم اس کے لئے اُن کے شکر گزار ہیں اور اپنے ان سبھی لکھنے والوں کے بھی جنہوں نے معاونت فرمائی۔

م۔ ر۔ ف، نئی دہلی

آلِ احمد سرور

جوش کی شخصیت: کچھ یادوں اور کچھ خطوط کی روشنی میں

مجھے یاد پڑتا ہے کہ ہائی اسکول تک آتے آتے میں نے اقبال، فانی اور جوش کا خاصا کلام پڑھ ڈالا تھا۔ جب میں ہائی اسکول میں تھا تو جوش کی نظم "بدلی کا چاند" کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا تھا۔ کالج کے زمانے میں......

ان شعرا کے علاوہ اختر شیرانی بھی اعصاب پر سوار ہو گئے تھے اور میں وقت بے وقت ان سب کا کلام نہ صرف پڑھتا تھا بلکہ اپنی بھدی اور بے سُری آواز میں گایا بھی کرتا تھا۔ جوش کی نظم 'ناسزا جوانی' کے یہ اشعار اب تک یاد ہیں.

نہایت لُطف آتا تھا خنک جاڑوں کی راتوں میں
انگیٹھی کے کنارے صبح ہو جاتی تھی باتوں میں

حیا کی شمع جل اُٹھتی حریمِ دل رُبائی میں
جھکا کر سر گھمایا دیر تک کنگن کلائی میں

یہ بھی یاد آتا ہے کہ روحِ ادب کے بعد جوش کی نظموں کا ایک مجموعہ "شاعر کی راتیں" کے عنوان سے شاید ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا تھا۔ کچھ نظموں کے اشعار اب تک یاد ہیں:

دیدنی تھا میری محفل کا سماں کل رات کو
مہرباں تھا وہ بُتِ نامہرباں کل رات کو
میں بھی لافانی ہوں مثلِ ربِّ وجہ ذوالجلال
دل کو رہ رہ کر یہ ہوتا تھا گماں کل رات کو

وہ یارِ پری چہرہ جو کل شب کو سدھارا
طوفاں تھا، تلاطم تھا، چھلاوہ تھا، شرارا

فردوس بنائے مرے ساون کے مہینے
اک گل رُخ و نسریں بدن سرو و سمن نے

اس فصل میں اس درجہ رہا بے خود و سرشار
میخانے سے باہر مجھے دیکھا نہ کسی نے
کیا لمحۂ فانی تھا کہ مُڑ کر بھی نہ دیکھا
دی کتنی ہی آوازِ حیاتِ ابدی نے

مگر جوش کو سب سے پہلے ۱۹۲۳ء میں دیکھا۔ ایک شعری نشست کے لئے جوش اور جگر آئے تھے۔ قیام رشید صاحب کے یہاں تھا۔ حسبِ معمول ان کی تقریب سے پہلے رات کو رشید صاحب کے یہاں احباب کا مجمع تھا۔ میرا اس زمانے میں روزانہ ان کے یہاں پھیرا ہوتا تھا۔ رشید صاحب نے پہلے مجاز سے اپنی تازہ نظم "انقلاب" سنانے کی فرمائش کی۔ یاد ہے جوش خاموشی سے سنتے رہے۔ مگر جگر نے یہ ضرور کہا کہ انقلاب کی کیا بھیانک تصویر ہے۔ جوش کے ساتھ لطیف الدین احمد اکبرآبادی بھی تھے۔ جوش نے پڑھنا شروع کیا تو کسی نے مصرع نہ اٹھایا۔ انہوں نے لطیف الدین احمد سے مصرعہ اٹھانے کو کہا۔ یار پری چہرہ والی نظم میں نے جوش سے اسی موقع پر سُنی۔ جگر نے وہ غزل پڑھی جس کا مطلع ہے ؎

تری خوشی سے اگر غم میں بھی خوشی نہ ہوئی
یہ زندگی تو محبت کی زندگی نہ ہوئی

دوسرے دن یونین میں جوش نے اپنی کئی نظمیں سنائیں، مگر جگر کے سامنے ان کا رنگ نہ جما۔ سہ پہر میں وہ آگرے کے لئے روانہ ہو گئے۔

دسمبر ۱۹۳۳ء میں انجمن حدیقۃ الشعر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا سالانہ مشاعرہ میرس ہال میں تھا۔ احسان دانش، روش، مجاز اور جوش باہر سے آئے تھے۔ جاں نثار اختر جو اس وقت ایم۔ اے۔ فائنل میں تھے، سکریٹری تھے۔ میں صدارت کر رہا تھا۔ کوئی گیارہ بجے جب مشاعرہ اپنے شباب پر تھا۔ مجاز اور جوش تالیوں کی گونج میں ہال میں داخل ہوئے۔ مجاز نے اپنی نظم "نذرِ علی گڑھ" پڑھی۔ یہ اب یونیورسٹی کا ترانہ ہے۔ احسان دانش پہلی دفعہ علی گڑھ آئے تھے۔ پڑھنے کا ایک خاص طرز تھا وہ بہت مقبول ہوئے۔ روش کا رنگ بھی خوب جما۔ آخر میں جوش کی باری آئی۔ انہوں نے جو قطعہ پڑھا، اُس کا پہلا اور آخری شعر یہاں لکھتا ہوں:

سرسید نگر، علی گڑھ (یوپی)

مقامِ شیخ سے واقف ہوں میں بھی — کہ یہ پاپڑ بہت بیلے ہوئے ہیں
خدا کو اور نہ جھپائیں یہ حضرت — خدا کے ساتھ یہ کھیلے ہوئے ہیں

اس پر ظفر احمد صدیقی لیکچرر شعبۂ فلسفہ (خدا انہیں غریق رحمت کرے) کھڑے ہوئے اور انہوں نے اس نظم کے لب و لہجے پر سخت اعتراض کیا۔ میں نے صدر کی حیثیت سے کہا کہ اردو شاعری شیخ اور زاہد پر طنز کی بہت پرانی روایت ہے۔ اس نظم کو بھی اسی روایت کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔ اس پر سکون ہوگیا اور میں نے جوش سے دوسری نظم سنانے کی درخواست کی۔ جوش نے نظم کا عنوان "فتنۂ خانقاہ" بتایا ہی تھا کہ رشید صاحب جو پہلی صف میں بیٹھے ہوئے تھے، کھڑے ہوگئے۔ اس عنوان سے انہوں نے یہ سمجھا کہ دوسری نظم بھی پہلی نظم کی طرح ہی ہوگی۔ اس لئے انہوں نے جوش صاحب سے دیرینہ مراسم کی بنا پر یہ درخواست کی کہ اب کسی اور موضوع پر نظم سنائیں۔ آپ کے خزانے میں کس چیز کی کمی ہے۔ رشید صاحب کی اس خواہش کے احترام میں جوش کو چاہئے تھا کہ کسی اور موضوع پر نظم سنا دیتے۔ مگر وہ برہم ہوگئے اور فرمانے لگے "میں یہاں تراویح پڑھنے نہیں آیا ہوں۔ اور یہ کہہ کر ڈائس سے اتر آئے۔ میں نے اس کے بعد دوسرے دور کے لئے احسان دانش اور روش سے پڑھنے کی درخواست کی۔ احسان نے تو معذرت کر دی۔ ہاں روش نے چند اشعار سنائے اور پھر مشاعرہ ختم ہوگیا۔ بعد میں نظم "فتنۂ خانقاہ" پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ جوش کے رنگ کی بڑے معرکے کی چیز ہے۔ اس میں اگرچہ ان کی وضع کے مطابق شیخ و ملاّ پر پھبتیاں ہیں۔ مگر حسن کی بڑی طرحدار اور جاندار مصوری بھی ہے۔ چند اشعار جو یاد آگئے، لکھتا ہوں: ؎

اک دن جو بہرِ فاتحہ اک بنتِ مہر و ماہ
پہنچی نظر جھکائے ہوئے سوئے خانقاہ
زہاد نے اٹھائی جھجکتے ہوئے نگاہ
ہونٹوں میں دب کے ٹوٹ گئی ضربِ لا الہ
ہوائی ہر نگاہ سے آواز الاماں
جیسے کوئی پہاڑ پہ آندھی میں دے اذاں
دھڑکے وہ دل کہ روح سے اٹھنے لگا دھواں
جلنے لگیں شیوخ کے سینے پہ داڑھیاں
آہستہ چل رہی تھی عقیدت کی راہ سے
یا لو نکل رہی تھی دلِ خانقاہ سے
عالم تھا وہ خرام میں اس گلعذار کا
گویا زوالِ رحمتِ پروردگار کا
آغوشِ مہر و ماہ کی گویا پلی ہوئی
سانچے میں آدمی کے گلابی ڈھلی ہوئی
طوفانِ آب و رنگ میں زہاد کھو گئے
سارے کبوترانِ حرم ذبح ہوگئے

جوش کو پھر ۱۹۳۹ء میں لکھنؤ کی ایک کانفرنس میں دیکھا۔ ۱۹۴۳ء میں گونڈے میں مسعود علی فراق نے ایک ادبی کانفرنس اور مشاعرے کا اہتمام کیا تھا۔ میں نے سجاد انصاری پر مقالہ پڑھا تھا۔ مشاعرے میں بھی اپنا کلام سنایا تھا۔ جوش فارم پر تھے۔ نئی نظمیں داد کے ڈونگروں کے درمیان سنائیں۔ جوش کی آواز میں گونج اور گرج دونوں تھے۔ موڈ ہوتا تو گھنٹوں سناتے۔ کیا مجال جو آواز ذرا بھی تھرا جائے یا کھانسنے کھنکھارنے کی نوبت آئے۔ ۱۹۴۷ء اور ۱۹۴۸ء میں جوش سے کئی بار ملاقات ہوئی۔ ایک مرتبہ ڈاکٹر رشید جہاں جن سے خاصے مراسم ہوگئے تھے اور جو میرے قریب ہی رہتی تھیں، آئیں اور کہا کہ جوش آئے ہوئے ہیں۔ وہ میرے یہاں آئے تھے۔ میں گھر پر نہ تھی۔ ادھر ان کے پینے کے قصے سن کر میں ان سے ناراض تھی۔ وہ ایک رباعی لکھ کر چھوڑ آئے (جس کا تیسرا اور چوتھا مصرعہ ہی یہ مضمون لکھتے وقت یاد رہا)

اس درد کا تو گواہ رہنا اے وقت
میں اپنے وطن میں اجنبی ہوں اب تک

چلئے اُن سے مل آئیں۔ گھنٹے آدھ گھنٹے بعد مجھے اپنے کلینک جانا ہے۔ میں رشید جہاں کے ساتھ ہولیا۔ وہ مرزا جعفر حسین کے یہاں گولہ گنج میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ محفل جمی ہوئی تھی، شغل ہو رہا تھا۔ مانی جائسی برابر بیٹھے تھے۔ ان پر فقرے کس رہے تھے اور ہنس رہے تھے۔ رشید جہاں کو آتے دیکھا تو بڑھ کر ان کا استقبال کیا اور بہت احترام سے اپنے قریب بٹھایا۔ مزاج پرسی کے بعد رشید جہاں نے معذرت کی کہ آپ جب آئے تھے تو میں پارٹی کے کام سے گئی ہوئی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے تازہ کلام کی فرمائش کی۔ جوش نے دو تین نظمیں سنائیں، جن پر ہم سب نے خوب داد دی۔ پھر رشید جہاں نے اجازت چاہی کہ کلنک پر مریض انتظار کر رہے ہوں گے۔ میں بھی اٹھا، مگر جوش نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور کہا کہ انہیں تو اپنے مریض دیکھنا ہیں۔ آپ کچھ دیر یا اور بیٹھئے۔ میں بیٹھ گیا۔ رشید جہاں کو دروازے تک چھوڑ آئے تو اطمینان سے بیٹھ کر فرمانے لگے۔ شکر ہے اب مردانہ ہوگیا اور وہی مانی جائسی سے چھیڑ شروع ہوگئی۔ انہیں تھوڑی دیر میں الہ آباد کی گاڑی پکڑنی تھی۔ لوگ اصرار کر رہے تھے کہ چلنا چاہیے مگر وہ نظموں پر نظمیں سنا رہے تھے۔ آخر دس بجے کے قریب جب دروازے پر موٹر آگئی تو وہ اسٹیشن روانہ ہوئے۔ میں گھر آگیا۔ اس صحبت میں انہوں نے اپنی مشہور نظم "میں حیدری ہوں حیدری" پڑھی تھی۔

لکھنؤ کے میرے قیام کے زمانے میں جوش سے کئی دفعہ ملاقات ہوئی۔ وہ دو دفعہ غریب خانے پر تشریف لائے۔ سروجنی نائیڈو کے انتقال پر انہیں بہت رنجیدہ دیکھا۔ نظیر اکبرآبادی کے بہت قائل تھے۔ ان کو اردو کا سب سے بڑا شاعر مانتے تھے۔ شمس الرحمٰن فاروقی ناقل ہیں: ایک دفعہ مسعود حسن رضوی کے سامنے یہ بات چھیڑی۔ انہوں نے فرمایا کہ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ ہم تو نظیر سے بہتر شاعر آپ کو سمجھتے ہیں۔ مگر مسعود صاحب کے متعلق ایک دفعہ مجھ سے کہا کہ "ان کی گھڑی تو مدت ہوئی بند ہو چکی" یہ اس لئے کہ مسعود صاحب ترقی پسند شاعری کے چنداں معترف نہ تھے۔ میں نے یہ بات نوٹ کی کہ وہ ان ہم عصروں کی تعریف میں بخل کرتے تھے جو عمر میں ان سے چھوٹے تھے اور ان کے بعد ان کی شہرت ہوئی۔ سجاد ظہیر کے ایک خط سے فیض کے حسب ذیل

اشعار حیدرآباد سندھ کے زنداں سے لکھنؤ بھیجے تھے۔ میں نے جوش کو بڑی تعریف کے ساتھ سنائے۔

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
لبوں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

جوش نے ہوں ہاں کر کے بات ٹال دی۔ لکھنؤ یونیورسٹی کی جوبلی کے موقع پر ایک مشاعرہ تھا۔ اچاریہ نریندر دیو وائس چانسلر صدر تھے۔ مشاعرے کی نظامت میں کر رہا تھا۔ بڑی منتوں سے جوش کو مشاعرے میں لایا گیا تھا۔ ان کے گھر سے دوست حکیم صاحب عالم جو میرا بڑا خیال کرتے تھے، میرے کہنے پر خود مشاعرہ گاہ تک پہنچا گئے تھے۔ میں جوش کو اندر لایا تو اس وقت اتفاق سے شکیل بدایونی کلام سنا رہے تھے اور انہیں بہت داد مل رہی تھی۔ جوش نے کہا "ستور صاحب، آپ مجھے کہاں لے آئے۔ یہ کیا بدمذاقی ہے۔ میں خاموش رہا۔ شکیل کے بعد ساغر نظامی نے اپنا کلام سنایا۔ پھر جوش کی باری آئی۔ اب رو ٹھے ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں مجھے تو کچھ یاد نہیں اور بیاض میں بھول آیا۔ میں نے یہ رباعی یاد دلائی۔

غنچے تیری بے بسی پہ دل ہلتا ہے
بس ایک تبسم کے لئے کھلتا ہے
غنچے نے کہا کہ اس چمن میں بابا
یہ ایک تبسم بھی کسے ملتا ہے

اس طرح یاد دلانے پر یہ رباعیاں بھی سنائیں اور اٹھ گئے [1]

جوش کے مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو سے خاصے مراسم تھے۔ جس زمانے میں وہ "آج کل" کے ایڈیٹر تھے۔ لکھنؤ ریڈیو پر مشاعرہ ہوا۔ اسٹیشن ڈائریکٹر نے جوش کو راضی کرنے کی خدمت میرے سپرد کی تھی۔ بہرحال جوش آئے۔ جگر بھی تھے۔ ریڈیو کے مشاعروں میں قاعدہ یہ ہے کہ جو کلام سنانا ہوتا ہے وہ پہلے سے ریڈیو والوں کو بھیج دیا جاتا ہے یا مشاعرے سے پہلے دکھا لیا جاتا ہے۔ جوش نے باوجود کہنے کے یہ نہ کیا۔ مشاعرے میں

اُنہوں نے ایک نظم پڑھی جس میں حالات، قانون خصوصاً حکومت کی زبان کی پالیسی پر شدید طنز تھا۔ دو شعر یاد آتے ہیں:

جس کے ہر لفظ سے سو پھول مہک اُٹھتے تھے
کاٹ دی جائے گی شاید وہ زباں اے ساقی
ٹھیکرے بیچنے والوں کے بڑھانے کو ہاتھ
بند کرتے ہیں جواہر کی دُکاں اے ساقی

مشاعرہ Live نشر ہو رہا تھا۔ یہ نظم بھی نشر ہو گئی۔ اسٹیشن ڈائرکٹر بہت گھبرائے۔ مجھ سے کہنے لگے اب میری خیریت نہیں۔ میں نے کہا کہ آپ کیوں گھبراتے ہیں۔ حکومتِ ہند اپنے انفارمیشن ڈپارٹمنٹ کے ایک افسر سے براہِ راست باز پرس کرے گی۔ آپ کا کچھ نہ بگڑے گا اور واقعی کچھ نہ ہوا۔ جوش کی ہمت و جرأت کی داد دینی چاہیئے کہ اُنہوں نے ایک طویل نظم "ماتمِ آزادی" لکھی جس میں خاص کر ایسے اشعار بھی لکھے جن میں غم کم تھا اور غصہ زیادہ۔

جتنے نمک حرام تھے کپتان ہو گئے
کھدر پہن پہن کے بداطوار آ گئے

جواہر لال نہرو نے بقول جوش مجمع میں کچھ نہیں کہا، لیکن گھر بلا کر نظم دوبارہ سنی اور داد دی۔

ریڈیو پر جس مشاعرے کا میں نے ذکر کیا ہے اس میں ایک لطیفہ یہ ہوا کہ جگر مشاعرے کے بعد ایک گوشے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ جوش اس طرف سے گزرے تو مجھ سے کہا "دیکھو شیر گھاس کھا رہا ہے۔ موڈ میں ہوتے تو جوش بڑے مزے کی باتیں کرتے تھے اور ان کے فقروں کا تو جواب ہی نہ تھا۔ اسی مشاعرے میں اُنہوں نے جگر صاحب سے کہا میری جان اردو پر یہ بپتا وقت پڑا ہے اور ہم تم دم بخود بیٹھے ہیں۔ جوش نے جو فقرہ کسا تھا وہ یہاں دُہرایا نہیں جا سکتا۔ میں نے سلیس اردو میں اس کا ترجمہ کر دیا ہے۔ جوش کے پاکستان جانے کا ہم سب کو بہت رنج ہوا۔ ہوا یہ کہ پاکستان میں کچھ ناشروں نے ان کے کئی شعری مجموعے بے اجازت چھاپ لئے تھے۔ جوش نے اس سلسلے میں ابوطالب نقوی آئی سی ایس سے رجوع کیا۔ جن سے دیرینہ مراسم تھے اور جو جوش کو بہت مانتے تھے۔ اُنہوں نے نہ صرف معاوضے میں اچھی خاصی رقم دلوا دی بلکہ سبز باغ بھی دکھایا کہ اگر آپ پاکستان آ جائیں تو آپ کے نام بہت کچھ کر دیا جائے گا۔ جوش بھرّے میں آ گئے۔ واپس آ کر مولانا آزاد اور جواہر لال نہرو سے بات کی۔ یہ بھی کہا کہ میرے بعد میرے بچوں کا ہندوستان میں کوئی مستقبل نہیں اور اردو زبان کا مستقبل بھی تاریک ہے۔ جواہر لال نہرو نے جوش سے مراسم کی بنا پر یہ کہا کہ آپ اپنے بچوں کو بھیج دیجئے اور خود ہندوستان میں رہیئے۔ ہاں بچوں سے ملنے چند ماہ کے لئے پاکستان چلے جایا کیجئے گا۔ مولانا آزاد کو ہندوستانی ہائی کمشنر کے ذریعے ساری باتیں معلوم ہو چکی تھیں۔ انہوں نے جوش سے صاف بات کی اور کہا کہ جب آپ وہاں سارے معاملات طے کر کے آ گئے ہیں تو ہم لوگوں سے رائے کیوں لیتے ہیں۔ آپ کا جانا ہی

---

[1]
جھکتا ہوں کبھی ریگِ رواں کی جانب
اڑتا ہوں کبھی کاہکشاں کی جانب
مجھ میں دو دل ہیں اک تو مائل بہ زمیں
اور ایک کا رُخ ہے آسماں کی جانب

ٹپکاتی ہوئی گھٹ جب آنسو آئی
فرقت کا جگاتی ہوئی جادو آئی
ہلکا ہلکا دُھواں کلیجے سے اُٹھا
سوندھی سوندھی زمیں سے خوشبو آئی

مناسب ہے۔ اس گفتگو کا خلاصہ کرشنا کیلانی نے جو اس وقت مولانا کے سکریٹری تھے، مجھے سنایا تھا، اس لئے اس کی صداقت میں شبہ نہیں ہے۔
اس کے بعد جوش ایک دفعہ ہندوستان آئے اور احباب نے اُن کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا۔ پاکستان میں ان سے جو وعدے کئے گئے تھے وہ کم ہی پورے ہوئے۔ کچھ عرصے انہوں نے ترقی اردو بورڈ پاکستان میں لغت کی تیاری کے سلسلے میں مدد کی۔ شاہد احمد دہلوی سے معرکہ ہوا۔ جوش نے مولوی نذیر احمد کی زبان پر نہ صرف کبھی اعتراضات کئے تھے بلکہ ان کی زبان کی اصلاح بھی کردی تھی۔ شاہد احمد دہلوی کو یہ ناگوار ہوا۔ ادھر افکار کا جوش نمبر نکلا۔ ادھر شاہد احمد دہلوی نے ساقی کا ایک خاص نمبر جوش کے خلاف نکالا۔ جوش کا نیاز سے بھی ایک معرکہ رہا تھا۔ حیدرآباد کی ایک صحبت میں جوش کے ایک عزیز نے نیاز کے متعلق کچھ ناشائستہ الفاظ استعمال کئے۔ نیاز نے قدرتی طور پر برا مانا اور "نگار" میں ایک سلسلۂ مضامین شروع کردیا جس میں جوش پر اعتراضات تھے اور ان کے مقابلے میں علی اختر حیدرآبادی کو لایا گیا تھا۔ اس مقابلے میں سبکی نیاز کی ہی ہوئی۔

جوش کا مزاج رئیسانہ تھا۔ ٹھاٹ سے رہتے تھے۔ زندگی میں خاصی باقاعدگی تھی۔ بہت سویرے اٹھ کر مشق سخن کرتے۔ پھر دور تک ٹہلنے نکل جاتے۔ دن میں شراب نہیں پیتے تھے۔ لیکن دعوت میں بیئر کا شغل ہو جاتا تھا۔ سورج غروب ہو جانے کے بعد طلوع ہوتے۔ مجاز سے انہوں نے ایک دفعہ کہا۔ "دیکھو میں گھڑی رکھ کر پیتا ہوں۔" مجاز کی رگ ظرافت پھڑکی۔ انہوں نے کہا: "میں گھڑا رکھ کر پیتا ہوں۔" عام طور پر تین یا چار پیگ سے زیادہ نہ پیتے۔ اس کے بعد ڈٹ کر کھانا کھاتے۔ دہلی کی ایک شعری نشست میں، میں بھی اتفاق سے موجود تھا۔ مختنب جارچوی، عرش، آزاد اور بسمل سعیدی وغیرہ کے بعد کوئی گیارہ بجے جوش کی باری آئی اور گھنٹے بھر تک نہایت توانا اور بلند آہنگ لہجے میں بغیر کھانسے یا کھنکھارے اپنا کلام سناتے رہے اور لوگ داد دیتے رہے۔

جوش کے مزاج میں مروت بہت تھی۔ ہر ایک کی سفارش کو تیار ہو جاتے تھے۔ لوگوں کو معلوم تھا کہ پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد ان کا کتنا خیال کرتے ہیں۔ کنور مہندر سنگھ بیدی جو اس وقت دہلی میں مجسٹریٹ تھے، ان کے دوستوں میں تھے۔ شنکر پرشاد اس زمانے میں ڈپٹی کمشنر تھے۔ وہ اور وی۔ شنکر (ہوم کرز میں جوائنٹ سکریٹری تھے) دونوں اردو شاعری کے عاشق اور جوش کے گہرے دوست تھے۔ جب جوش پاکستان گئے تو ان کے استقبال کے بجائے حفیظ جالندھری اور دوسرے شعرا نے ان پر اعتراضات شروع کردئے۔ کراچی کے قیام کا ان کا ایک شعر جو خاصا مشہور ہوا، یہ ہے:

یوں کراچی میں ہوں جس طرح سے کوفے میں حسین
سب شہادت کے ہیں آثار جبینا جور گرم

بعد میں وہ اسلام آباد آگئے۔ فیض نے مجھ سے ایک دفعہ بیان کیا تھا کہ جوش کے آخری زمانے کے لئے مناسب امداد کی سفارش انہوں نے کی تھی۔ یہیں بیاسی سال کی عمر میں ۱۹۸۲ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے انتقال کے ایک ہفتے بعد ان کے دوست فراق بھی اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

میرے کاغذات میں جوش کے چھ خط نکلے۔ پہلا بارہ دسمبر ۱۹۴۷ء کا اور چھٹا اور آخری ۲۸ نومبر ۱۹۵۳ء کا۔ پہلا خط اس دعوت نامے کا جواب ہے جو ترقی پسند مصنفین کی آل انڈیا کانفرنس کی مجلس استقبالیہ کے سکریٹری کی حیثیت سے میں نے بھیجا۔ جوش اس زمانے میں بمبئی میں تھے۔ اس کانفرنس میں شرکت کے لئے سجاد ظہیر پاکستان سے آئے تھے اور کانفرنس کے اجلاس میں نیاز فتحپوری، قاضی عبدالغفار اور فراق گورکھپوری کی صدارت میں ہوئے تھے۔ اس زمانے میں جوش مالی اعتبار سے پریشان تھے اور شاید اس وجہ سے شریک نہ ہو سکے۔ دوسرے خط میں میرے ایک مضمون پر جو "آجکل" میں اشاعت کے لئے بھیجا گیا تھا، اظہار خیال کیا ہے۔ اس خط میں یہ جملہ قابل توجہ ہے۔ "سرور صاحب نوکری کمبخت بہت ہی بری بلا ہے۔" لکھنؤ جاتے وقت میں جوش صاحب کے دفتر میں ان سے ملا تھا۔ خیال تھا کہ واپسی بھی دہلی کے راستے ہوگی۔ مگر میں جھانسی سے براہ راست لکھنؤ آگیا اور جوش صاحب سے دوبارہ ملنے کا ارادہ پورا نہ ہو سکا۔ تیسرے خط میں "آجکل" کے سالنامے کے لئے مقالے کی فرمائش کی ہے۔ چوتھے خط میں رضیہ سجاد ظہیر کی سفارش کی ہے۔ رضیہ سجاد ظہیر کرامت حسین ڈگری کالج میں لیکچرر تھیں۔ لکھنؤ یونیورسٹی میں سید محمد تقی کے انتقال کے بعد ان کی جگہ کا اشتہار ہوا تھا۔ میں سلیکشن کمیٹی کا ممبر نہیں تھا۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی صدر شعبۂ اردو و فارسی ممبر تھے۔ انہوں نے مجھ سے مشورہ کیا تو میں نے سجاد ظہیر اور جوش کے سفارشی خطوط کے باوجود ڈاکٹر محمد حسن کا نام تجویز کیا۔ مگر ستم ظریفی یہ ہوئی کہ سلیکشن کمیٹی نے باوجود مسعود صاحب کے اصرار کے عبدالاحد خاں خلیل کو منتخب کرلیا۔

پانچواں خط ریڈیو کے ایک مشاعرے کے سلسلے میں ہے۔ اسٹیشن ڈائرکٹر نے مجھ سے جوش اور جگر کو خاص طور پر لکھنے کے لئے کہا تھا۔ کیوں کہ یہ دونوں بعض اوقات ضابطے کے دعوت نامے کے باوجود شرکت نہیں کرتے تھے۔ جوش کا یہ مطالبہ کہ انہیں اسپیشل کیس بنا کر زیادہ رقم دی جائے، میرے نزدیک بے جا نہ تھا۔ کیوں کہ لکھنؤ میں وہ عام طور پر ہوٹلوں میں ٹھہرتے تھے اور صبح سے شام تک ان کے یہاں ملنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ انہوں نے بسمل ٹونکی کی بھی خاص طور پر سفارش کی تھی۔ یہ جملہ دلچسپ تھا کہ "دو شاعروں کے نام کاٹ کر بسمل صاحب کو مدعو کیا جائے۔" جوش کا خط آنے پر میں نے اسٹیشن ڈائرکٹر سے بات کی اور کہا کہ بسمل صاحب کو بھی دعوت نامہ بھیجا جائے۔ لیکن انہوں نے عذر کیا کہ جتنے شاعروں کو دعوت نامے بھیجے گئے تھے سب کی منظوری آچکی۔ اس لئے اب اس مد میں اضافے کی گنجائش نہیں ہے۔ یہی میں نے جوش صاحب کو لکھ دیا۔ مگر ان کے چھٹے خط سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بقول پروفیسر ابوبکر احمد حلیم "رنج" ہوگئے۔ انہوں نے شاید یہ سمجھا کہ میں نے سعی بلیغ نہیں کی۔ دراصل انہیں میرے اثرات کا غلط اندازہ تھا

کیوں کہ وہ کچھ آزردہ تھے۔ اس لئے انہوں نے اب کے میری تحریر میں دو غلطیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ایک امید کے بعد "ہے" کا استعمال، دوسرے "مدت" کے معنی "عرصہ" میں امید کے بعد "ہے" کے استعمال کو اور مدت کے معنی میں "عرصہ" کا استعمال جائز سمجھتا ہوں۔ جوش کا خط خاصا پاکیزہ ہوتا تھا۔ اعراب کا التزام میں نے ان کے یہاں، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے یہاں اور مسعود حسن رضوی کے یہاں ہر خط میں دیکھا۔ صرف وہ خط جس میں رضیہ سجاد ظہیر کی سفارش کی گئی ہے، "خطِ شکست" میں ہے۔

کرشن چندر نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ جب وہ اور جوش دونوں شالیمار پکچرز میں ملازم تھے تو انہوں نے جوش کو ایک دفعہ نظم لکھتے ہوئے دیکھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ "مصرعہ پر مصرعہ ٹانکتے چلے جاتے ہیں"۔ یہ جوش کی مشہور نظم "کیا گلبدنی ہے" کا تعارف ہے۔ اس کے دو بند ملاحظہ ہوں:

یہ نغمہ ہے کہ کھلتے ہوئے غنچے کی کہانی
مہکا ہوا یہ تن ہے کہ ہے رات کی رانی
لہجے کی یہ رو ہے کہ برستا ہوا پانی
لرزش میں یہ مژگاں ہے کہ پریوں کی کہانی
یہ سرخی لب ہے کہ عقیقِ یمنی ہے
کیا گل بدنی، گل بدنی، گل بدنی ہے

عشوے ہیں کہ اک فوج کھڑی لوٹ رہی ہے
چل بل ہے کہ چھاتی کو زمیں کوٹ رہی ہے
انگڑائی کا خم ہے کہ دھنک ٹوٹ رہی ہے
مکھڑا ہے کہ پربت پہ کرن پھوٹ رہی ہے
قامت ہے کہ رعنائی سروِ چمنی ہے
کیا گل بدنی، گل بدنی، گل بدنی ہے

کسی شاعر کی اہمیت اور معنویت اس بات سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ اس کے اس دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد بھی اس کی شہرت کو گہن نہ لگے۔ اپنی زندگی میں جوش کی مقبولیت مسلم تھی۔ ان کی شخصیت اور شاعری کے گرد ایک ہالہ بن گیا تھا۔ خود انہوں نے اپنے آپ کو "قبلۂ رندانِ جہاں" اور اپنی صدی کا "حافظ و خیام" کہا تھا۔ ان کے کلام کے سولہ مجموعوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ نثر میں بھی ان کی خود نوشت "یادوں کی برات" کے علاوہ مضامین کے تین اور مجموعے ہیں۔ "یادوں کی برات" میں بچپن اور جوانی کی شیریں یادوں کو جس طرحدار اسلوب میں جوش نے بیان کیا ہے اسے ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جوش نے چونکہ بہت کہا ہے، اس لئے بارہا اپنے آپ کو دہرایا بھی ہے۔ دراصل ان کی شاعری ایک علیحدہ مضمون کی متقاضی ہے۔ میں اپنے مجموعۂ مضامین "پہچان اور پرکھ" میں خاصی تفصیل سے اس پر اظہارِ خیال کر چکا ہوں۔ یہ مضمون جوش کے انتقال کے بعد اقبال انسٹی ٹیوٹ کے ایک سمینار میں پڑھا گیا تھا۔ جوش کی نظمیں "بدلی کا چاند" "نقاد" "فریبِ ہستی" "کہستانِ دکن کی عورتیں" "مولوی" "فتنۂ خانقاہ" "عشق ہوئی نیکی" "پندنامۂ مجاز" "جمال و جلال" "گرمی اور دیہاتی بازار" "کیا گلبدنی ہے" "ماتمِ آزادی" "کسے آواز دوں" میری پسندیدہ نظمیں ہیں۔ جوش فکر کے نہیں جذبے کے شاعر ہیں۔ ان کی بے پناہ خلاقی سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ غالباً نظیر کے بعد سب سے زیادہ الفاظ بھی انہوں نے استعمال کئے۔ ان کی شاعری کا جوہر ان کی تشبیہات اور استعارات میں کھلتا ہے اور ارسطو کا یہ قول ہمیں بھولنا نہیں چاہیے کہ استعارے کا خوش اسلوبی سے استعمال ہی شاعری کی کامیابی کی ضمانت ہے۔ جوش کی شخصیت بھی قدآور تھی اور شاعری بھی۔ ان کے یہاں جا بجا خس و خاشاک بھی مل جائیں گے۔ لیکن ان کی شخصیت اور شاعری دونوں میں ہمالہ کا جلال ہے، اودھ کی مٹی کی جگمگ جگمگ کرتی ہوئی کرنیں ہیں، کتابِ دل کی تفسیریں ہیں، خوابِ جوانی کی تعبیریں ہیں، میلادِ آدم کا رجز ہے اور لفظوں کے ساتھ وہ رندانہ اور قلندرانہ شوخی ہے جو فن کے مقدس صحیفوں کو آنچ عطا کرتی ہے۔ جوش کی فطرت پرستی، حسن کی ادا شناسی، زندگی کے جلال و جمال کی عکاسی، آدمیت کا احترام، لہجے کی مردانگی اور لفظوں کا وہ رقص جو کبھی کبھی شعلۂ جوالہ بن جاتا ہے، ہماری متاعِ عزیز ہے۔ یہ شعر بہت سویرے اٹھنے والا فطرت پرست جوش ہی کہہ سکتا تھا:

ہم ایسے اہلِ نظر کو ثبوتِ حق کے لئے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

جوش کے بعض اشعار آج خاص طور پر یاد آتے ہیں۔

شعر کیا جذبِ دروں کا ایک نقشِ ناتمام
مشتبہ سا اک اشارہ ایک مبہم سا کلام

بے حقیقت لے کے اندر زمزمہ داؤد کا
عارضِ محدود پہ اک عکس لامحدود کا

بادلوں سے ماہِ نو کی اک اچٹتی سی ضیا
جھانکتا قطرے کے روزن سے عروسِ بحر کا

دن ہے طوفانِ جنبش و رفتار
رات میزانِ کاکل و رخسار

دن ہے فولاد، سنگ، تیغ، علم
رات کمخواب، پنکھڑی، شبنم

دن بہادر کا بان بیر کا رتھ   رات چمپا کلی، انگوٹھی، نتھ

"تبسم اک بڑی دولت ہے میں بھی اس کا قائل ہوں
مگر یہ آنسوؤں کا ایک شیریں نام ہے ساقی

سروِ سہی نہ ساز نہ سنبل نہ سبزہ زار
بلبل نہ باغباں نہ بہاراں نہ برگ و بار
جیحوں نہ جامِ جم نہ جوانی نہ جوئے بار
گلشن نہ گلبدن نہ گلابی نہ گلعذار
اب بوئے گل نہ بادِ صبا مانگتے ہیں لوگ
وہ حبس ہے کہ لُو کی دعا مانگتے ہیں لوگ

بمبئی

۱۲ دسمبر ۱۹۴۴ء

مکرمی! دعوت نامہ پہنچا۔ شکریہ قبول فرمائیے۔ میں بسروچشم حاضر ہوں گا۔ بشرطیکہ "اُس وقت حالات" نے مساعدت کی جس کی زیادہ توقع نہیں ہے۔ بہرحال اگر میں شریک ہو سکوں گا تو یہ امر میری نہایت خوشی کا باعث ہوگا۔ اور شریک نہیں ہو سکوں گا تو صورت اس کے برعکس ہوگی۔ میں آج کل جن پریشانیوں میں مبتلا ہوں، اُن کی شرح مشکل ہے۔

امید کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوگا۔

نیازمند:
جوش

اگر میں آیا تو میرے قیام کا قطعی علیحدہ انتظام کیجئے گا۔ میں کسی مشترک جگہ نہیں ٹھہر سکوں گا اور وہ جگہ ایسی ہو جہاں غسل اور تمام دیگر معمولات کا مکمل انتظام ہو اور ہر وقت لوگ آ جا نہ سکیں۔

Ajkal
Old Secretariat,
Delhi

۴ اگست ۱۹۴۹ء

شفیقی، عرشؔ صاحب کا خیال ہے کہ آپ کے مضمون میں چونکہ ٹنڈن وغیرہ پر ہرچند صحیح، لیکن براہِ راست سخت الفاظ میں نقد کیا گیا ہے۔ اس لئے اس مضمون کا کسی سرکاری پرچے میں شائع ہونا خلافِ مصلحت ہوگا۔

اب، جب کہ آپ نے براہِ کرم اس مضمون سے سرکاری پالیسی کے خلاف حصے حذف کر دینے کی اجازت دے دی ہے، میں اس مضمون کو دو ایک روز میں منگا کر دیکھ لوں گا اور حذف کے بعد شائع کر دوں گا۔ اگر حذف کے بعد اس میں جان باقی رہ جائے گی۔ سرور صاحب، نوکری کمبخت بہت ہی بری بلا ہے۔ زمین سخت ہے۔ آسمان دور ہے۔

اب تو جاڑوں ہی میں ملاقات ہو سکے گی۔ آپ بنگلور سے پلٹے تو حسبِ وعدہ دہلی تشریف نہیں لائے۔ مجھے انتظار رہا۔

نیازمند:
جوش

"آج کل" دہلی

۱۵ مئی ۱۹۵۰ء

ضروری

مکرمی! سالنامے کے واسطے، براہِ کرم کوئی مقالہ عنایت فرما کر ہم وابستگانِ دامانِ صحافت کو شکریے کا موقع دیجئے اور اپنی بے پایاں لیاقت کا اظہار کیجئے ـــــ اور دعائیں لیجئے۔

نیازمند
جوش۔

آج کل
اولڈ سکریٹریٹ، دہلی
۳۱ جنوری ۱۹۵۲ء

حضرت سرورؔ، رضیہ سجاد ظہیر نے جو درخواست دی ہے، اس کے متعلق صرف اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ اُس پر براہِ کرم، غیر معمولی ہمدردی سے نگاہ ڈالی جائے۔ کیونکہ اپنے شوہر اور میرے محبوب دوست سجاد ظہیر کی گرفتاری کے باعث بڑی سخت مصیبت میں گرفتار ہیں۔ میں آپکا خاص طور سے شکرگزار ہوں گا اگر آپ رضیہ بیگم کی امداد فرمائیں گے۔

اُمید کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوگا۔

نیازمند
جوش

Ajkal
Old Secretariat
Delhi

$9 \frac{11}{52}$

حضرتِ سرورؔ، لکھنؤ ریڈیو والے یا تو سخت مجبور ہیں، یا بے حد گھٹیا۔ مشاعرے کی دعوت دیتے ہیں اور صرف چند ٹکوں پر ٹالنا چاہتے ہیں۔

چونکہ لکھنؤ جانے اور یارانِ قدیم سے ملنے کو بہت جی چاہتا ہے۔ اس لئے آپ کو اشارہ کرتا ہوں کہ لکھنؤ ریڈیو کے اربابِ حل و عقد کو اس امر پر آمادہ فرمائیے کہ وہ اسپیشل کیس بنا کر مجھے زیادہ دیں اور اسی کے دوش بدوش میری دو نظمیں حسبِ معمول ریکارڈ کرلیں ـــــ اس طرح لکھنؤ کے مصارفِ کثیر سے عہدہ برآ ہو سکوں گا۔

آج کل ذرا روپے سے ٹوٹا ہوا ہوں، ورنہ جیسا کہ ہمیشہ ہوتا رہتا ہے میں خود اپنی جیب سے صرف کرتا۔

خیر، میں آؤں یا نہ آؤں، آپ اس مشاعرے میں بسملؔ صاحب ٹونکی کو سو شاگردوں کے نام کارڈ کو مدعو کرائیں۔ بسملؔ صاحب کے سے اچھے لیکن بدنصیب شاعر کم پیدا ہوتے ہیں۔

نیازمند:
جوش مرحوم۔

(۷)

Telegrams: EXINFOR

PUBLICATIONS DIVISION
MINISTRY OF INFORMATION AND BROADCASTING
GOVERNMENT OF INDIA

OLD SECRETARIAT
DELHI-8 ۲۸ ۱۱/۵۳

حضرتِ نُور، خط کا جواب بہت ہی دیر سے آیا، بہر حال شکریہ ادا کرنے کے علاوہ اور کر ہی کیا سکتا ہوں، اگر آپ قطعی جواب نہ دیتے تو بھی میں آپ کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔

آپ نے بسمل صاحب کے واسطے میرا دل توڑ دیا ہے اور یہ دل کبھی جھوٹ نہیں بولتا، سچی ہمت نہیں کی ورنہ قریب قریب ناممکن تھا کہ انہیں مدعو نہ کیا جاتا۔

آپ کی اس بے التفاتی سے دل اس قدر کھٹا ہو گیا ہے کہ سفرِ لکھنؤ کے عزم میں گویا جان ہی باقی نہیں رہی ہے۔

بہرحال جب بھی ہوگا، کچھ دن کے بعد فیصلہ کرنے کے قابل ہو سکوں گا۔

امید کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوگا۔

نیازمند

جوشؔ

اپنے خط میں آپ نے "امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے" تحریر فرمایا ہے، جب میں بچہ ہی تھا، اُس وقت اپنے باپ سے مجھ کو معلوم ہو گیا تھا کہ "امید" کے بعد "ہے" کا استعمال مخلِ فصاحت ہے۔

آپ نے اس خط میں "مدت" کے معنی میں "عرصہ" لکھا ہے، خواص کو اس سے مجتنب رہنا چاہئے۔

حسناتُ خطیئۃُ الابرار، سیئاتُ العارفین۔

زاہداں از گناہ توبہ کنند — عارفاں از عبادت استغفار!!

"میری نو برس کی جان اور شاعری کے میلان پر تعجب نہ فرمائیے۔ ذرا سوچئے تو کہ وہ بچہ جس کا باپ بھی شاعر ہو، دادا بھی شاعر ہو، دو سوتیلے چچا بھی شاعر ہوں، بڑی پھوپھی، بڑی بہن اور بڑا بھائی بھی شاعر ہو، جس کا حقیقی ماموں بھی شاعر ہو، جس کے باپ کا ماموں بھی شاعر ہو، جس کی ماں مرزا غالب کی قرابت دار ہو اور اردو و فارسی کے اشعار برمحل سناتی رہتی ہو، اس کی انا خاص لکھنوی ہو اور رات کے وقت "کھلی ہے کنجِ قفس میں مری زباں صیاد" کی لوری دے دے کر اس کو سلاتی ہو، جس کے گھر میں آئے دن لکھنؤ کے شاعر آتے جاتے اور ہر تیسرے چوتھے مہینے مشاعرے ہوتے رہتے ہوں اور جو شعرا کے دیوانوں کو پتنگ اور گولیوں کی طرح کھیل کر پروان چڑھا ہو، وہ شعر نہیں کہے گا تو اور کیا کرے گا۔

بوا گلزار اور داروغہ امید علی، جب مجھے شعر کہتے پکڑ لیتے تھے تو میں دانت نکال نکال کر استدعا کرتا تھا کہ خدا کے لئے میاں تک یہ بات نہ پہنچانا۔ لیکن وہ دونوں اس قدر بے مروت و بے درد تھے کہ میری رپورٹ کرنے سے چوکتے ہی نہ تھے۔ بوا گلزار نے میری چغلیاں کھا کھا کر اس قدر روپیہ جمع کر لیا کہ سونے جھونے سے اپنی بیٹی کا نکاح کیا اور داروغہ امید علی نے اس قدر انعام پایا کہ ایک آم کا باغ لگا لیا اور بہت سی زمینیں بھی خرید لیں۔ شاعری نے مجھ کو تو برباد کر ڈالا مگر میرے مخبروں کے گھر بھر دیے۔"

("یادوں کی برات"۔ صفحہ ۹۶)

محمد حسن

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

— جوش ملیح آبادی

ادبی شخصیتوں کا ادبی وقار ان کے پڑھنے والوں سے ہوتا ہے ۔ ان کے مخاطبین جتنے بڑے ہوتے ہیں ان کا قد بھی اتنا ہی بڑا ہوتا ہے ۔ لہٰذا قوموں کے اور زبانوں کے زوال کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہ اپنے محترم فن کاروں کو ذلیل کرنے لگتی ہیں ۔ یہی عمل ہندوستان کے اردو داں مولانا ابوالکلام آزاد اور جوش ملیح آبادی کے ساتھ روا رکھے ہوئے ہیں ۔ کوئی ان کے بخئے ادھیڑ رہا ہے ، کوئی ان کی تصانیف کی جڑیں نکال رہا ہے — دراز دستی این کوتاہ آستینان ہیں ۔

جوش ملیح آبادی سے میرا تعارف پہلے پہل ۱۹۴۱ء کے لگ بھگ ہوا ۔ مرادآباد کی میونسپل پبلک لائبریری سے ان کا مجموعۂ کلام شعلہ و شبنم لے کر اس کی انقلابی نظموں اور رومانی غزلوں پر سر دُھن رہا تھا کہ انہی دنوں میری بڑی ہمشیرہ کی شادی ہوئی ۔ نہٹور ضلع بجنور کے سادات کا خاندان تھا ۔ بارات میں ایک صاحب آئے ۔ سید بہاؤالدین احمد باقوی اور ہنسوڑ آدمی تھے ۔ انہیں شعر بہت یاد تھے ۔ انہوں نے محض حافظے سے جوش کی تحتی نظم "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام" سنانی شروع کی ۔ نظم کیا تھی گویا ایک آگ کی لپیٹ تھی جو سب کے دلوں سے نکل رہی تھی اور شاعر نے اُسے سمیٹ لیا تھا ۔ یہ تھی جوش سے میری پہلی غائبانہ ملاقات ۔

۱۹۴۲ء میں پھر لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ ہونے پر جوش کا ذکر ہوتا رہا ۔ اور ان کے اشعار اکثر سننے اور پڑھنے میں آئے ۔ لیکن جوش ملیح آبادی سے پہلی ملاقات غالباً ۱۹۴۵ء میں ہوئی ۔ میں ایم ۔ اے اردو کا طالب علم تھا ۔ جوش لکھنؤ آکر قیصر باغ کے امپائر ہوٹل میں ٹھہرے تھے ۔ مجاز لکھنؤ آچکے تھے ۔ انہی کے ساتھ شام کو جوش صاحب کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا ۔

غروب آفتاب قریب تھا ۔ جوش ٹہلتے جاتے تھے اور سورج کے ڈھلنے کا بیتابی اور بے قراری سے انتظار کرتے جاتے تھے کہ جب تک سورج غروب نہ ہو وہ خود طلوع نہ ہو سکتے تھے یعنی شراب نوشی شروع نہ کر سکتے تھے ۔ ادھر سورج ڈوبا ادھر ان کی ہدایت پر ان کے چھوٹے بھائی رئیس احمد خاں نے ان کا کاٹری کا مسند و تکیہ لا کر ہوٹل کے کمرے کے وسط میں فرش پر رکھا ۔ اس پر سفید میز پوش قرینے سے بچھایا اور اگر بتیاں روشن کر کے چار شیشے کے صاف شفاف گلاس سجادیے ۔ حاضرین محفل حلقہ بنا کر بیٹھ گئے ۔ جوش صاحب نے "بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا" کہہ کر شراب کی بوتل کا کاگ اُٹھایا ۔ حاضرین محفل نے بسم اللہ کا نعرہ لگایا ۔ جوش صاحب نے ناپ کر سب کے لیے گلاسوں میں شراب کے پیگ بنائے اور امپائر ہوٹل کے اس کمرے میں فرنیچر ہٹا کر فرش پر نشست کا انتظام کیا گیا تھا ۔ اب لطیفے ، قہقہے اور پُرلطف باتیں اور بیچ بیچ میں شعر خوانی شروع ہوئی ۔ ظاہر ہے اس گفتگو میں زیادہ تر حصہ جوش کے لطیفوں اور باتوں کا تھا ۔

کچھ عرصے بعد جوش صاحب کا دوبارہ لکھنؤ آنا ہوا ۔ غالباً ۱۹۴۵ء کا زمانہ تھا ۔ میں نے ان دنوں لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں حلقۂ احباب کے نام سے ایک جماعت بنائی تھی ، جس کا افتتاح ڈاکٹر عبدالحق سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند نے دہلی سے آکر کیا تھا ۔ اس حلقے کے صدر تھے احتشام صاحب ۔ اس بار جوش صاحب آئے تو میں نے حلقۂ احباب کے سکریٹری کی حیثیت سے انہیں لکھنؤ یونیورسٹی آنے کی دعوت دی ۔ تاریخ مقرر ہو گئی ۔ جوش صاحب نے صبح آٹھ بجے آنے پر آمادگی ظاہر کی ۔ گویا یونیورسٹی کھلنے سے دو گھنٹے پہلے ۔ آج شاید کسی کو یقین نہ آئے کہ ہم نے صرف لکھنؤ یونیورسٹی کے برآمدوں اور سڑکوں پر چاک سے جلسے کا وقت اور جوش صاحب کے نام کا اعلان لکھ دیا تھا ۔ مگر صبح پونے آٹھ بجے ہی یونیورسٹی کا سب سے بڑا ہال اے ۔ پی ۔ سین ہال عمائدین شہر ، اساتذہ اور طلبا سے کھچا کھچ بھر گیا تھا ۔ جس میں وائس چانسلر سے لے کر مشہور شاعر آنند نرائن ملا تک اور شعبۂ اردو و فارسی کے صدر پروفیسر مسعود حسن رضوی سے لے کر فلسفے کے شعبے کے لیڈر (بعد کو پروفیسر اور وائس چانسلر) کالی پرشاد تک شامل تھے ۔

احتشام صاحب ہمارے صدر تھے ۔ وہ وقت سے آگئے تھے ۔ مگر جوش صاحب کا دور دور تک پتہ نہ تھا ۔ آدھا گھنٹہ گزر گیا تو مجھے دوڑایا گیا ۔ جائے قیام پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ چوک میں حکیم عالم صاحب سے ملنے علی الصباح ہی چلے گئے تھے ۔ وہاں پہنچے تو پتہ چلا کہ مہذب لکھنوی صاحب کے یہاں گئے ہیں یعنی کوچہ میر انیس ۔ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ جوش صاحب نہایت اطمینان سے تازہ کلام سنا رہے ہیں ۔ مؤدب بیٹھ گئے ۔ جب رباعیوں کا سلسلہ ختم ہوا تو عرض کی کہ آپ کو لکھنؤ یونیورسٹی جانا تھا ۔ کہنے لگے بالکل

۷ ۔ ڈی ۔ ماڈل ٹاؤن ، دہلی

بھول گیا، لیجیے

سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں

معذرت کی مگر اس وعدے کے ساتھ کہ آج تو ملیح آباد جا رہا ہوں۔ وہاں سے چار دن میں واپسی ہوگی تو اسٹیشن سے سیدھا پہلے لکھنؤ یونیورسٹی آؤں گا پھر ہوٹل جاؤں گا۔ غرض ملیح آباد سے واپسی کی تاریخ اور وقت نوٹ کیا اور مایوس واپس لوٹ آئے۔

دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ لہٰذا کوئی اعلان نہیں کیا۔ صرف یہ کیا کہ اپنے دوست احمد حسن کو لکھنؤ یونیورسٹی یونین کے ٹیلی فون پر تعینات کیا کہ جب میں چار باغ اسٹیشن سے جوش صاحب کی آمد کی اطلاع دوں تو اس وقت وہ چند احباب کو لے کر پوری یونیورسٹی کی سڑکوں اور گزرگاہوں پر جلسے کا اعلان چاک سے لکھوا دیں۔

میں احتشام صاحب کے ساتھ چار باغ اسٹیشن پہنچا۔ جوش صاحب سیکنڈ کلاس سے رئیس احمد خاں اور اپنے معتمد خاص چھوٹے داداکے ساتھ برآمد ہوئے۔ دو تانگے کئے گئے۔ ایک میں احتشام صاحب اور میں جوش صاحب کو لے کر لکھنؤ یونیورسٹی روانہ ہوئے۔ دوسرے تانگے میں رئیس احمد خاں اور چھوٹے دادا ایمبائر ہوٹل چلے گئے۔ جب ہم لکھنؤ یونیورسٹی پہنچے تو اے۔ پی۔ سین ہال بھر چکا تھا جس میں ایک تہائی تعداد اردو داں طلبا کی رہی ہوگی۔ یہ تھی اُس وقت جوش کی مقبولیت۔

۱۹۴۶ء ہی میں جوش صاحب دوبارہ لکھنؤ آئے۔ زمانہ گاندھی جناح ملاقات کا تھا۔ اس موقع پر گنگا پرشاد ہال میں صرف جوش صاحب کی طویل نظم "وقت کی آواز" سننے کے لئے ہزاروں آدمی جمع ہوئے تھے۔ یہ نظم مادرِ ہندوستان کی زبان سے اپنی دونوں بیٹیوں کانگرس اور مسلم لیگ اور بیٹے کمیونسٹ سے مخاطب ہو کر اور ٹھیٹھ ہندوستانی عورت کی زبان میں مخاطب ہو کر لکھی گئی تھی۔ نظم کی پوری فضا سیاسی تھی۔ وہ بھی ہنگامی، مگر شاعری کا اعلیٰ نمونہ تھی۔ اس نظم کا ایک بند کچھ اس طرح ختم ہوتا تھا۔

کانٹے کی رگ میں بھی ہے لہو سبزہ زار کا
پالا ہوا ہے وہ بھی نسیمِ بہار کا

یہ دورا ندیشی اور مصالحت کی آخری آواز تھی جو تقسیم ہندوستان سے ذرا پہلے سُنی گئی۔ مجمع کا جوش اور ولولہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا لگتا تھا کہ آج گنگا پرشاد ہال کی چھتیں اُڑ جائیں گی۔

اسی زمانے کا ایک قصہ اور ____! جوش صاحب کی نظم "رواں دواں بڑھے چلو" رواں دواں بڑھے چلو، بڑی مقبول ہوئی تھی۔ تھی بھی ان کے خاص رنگ کی نظم۔ لکھنؤ کی ایک ادبی محفل میں انہوں نے یہ نظم اپنے مخصوص طمطراق سے پڑھی۔ اس جلسے میں استاد محترم پروفیسر سید مسعود حسن رضوی (صدر شعبۂ اردو و فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی) بھی موجود تھے۔ جلسے کے بعد چائے پی گئی۔ سبزہ زار پر مسعود صاحب جوش صاحب کو ایک طرف لے گئے اور ان سے فرمائش کی کہ جب نظم اشاعت کے لئے کسی رسالے کو بھیجیں تو اس پر یہ نوٹ ضرور لگا دیں: یہاں 'رواں دواں بڑھے چلو' لغوی معنی میں استعمال کیا گیا ہے، محاورے کے طور پر نہیں۔

جوش صاحب کی نظر خود لفظ کے صحیح استعمال پر رہتی تھی۔ انہوں نے حیرانی سے وجہ پوچھی تو مسعود صاحب نے فرمایا "رواں دواں" کا عام استعمال وہ ہے جو شفیق لکھنوی نے "یتیموں کی فریاد" نظم میں کیا ہے۔

رواں دواں ہیں غریب الدیار ہیں ہم لوگ

یعنی وہ لوگ جن کا کوئی ٹھور ٹھکانہ نہ ہو آپ کی نظم میں یہ الفاظ لغوی معنی میں استعمال ہوئے ہیں، محاورے کے مطابق نہیں۔ مسعود صاحب کی دلیل جوش صاحب نے تسلیم کی۔

ویسے جوش صاحب خود الفاظ اور قواعد کے بڑے پابند تھے۔ ان کے سامنے کوئی اگر تاریخ پوچھنے پر عدد کا ذکر کر دے یعنی ۱۲ جنوری کہہ دے تو فوراً ٹوک دیتے تھے۔ "بارہویں کہئے جناب!"

خیر وہ زمانہ بھی گزر گیا۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ جوش جیسا جاں نثارِ محبتِ وطن اور آزادی کی لڑائی کا سُورما نوکری کے لئے کوشش کرتے آزادی کے بعد مسز سروجنی نائیڈو گورنر اتر پردیش سے مدد لینے آئے ہیں۔ پہلی بار گورنمنٹ ہاؤس ہی میں انہی کے ساتھ ٹھہرے، مگر دوسری بار حضرت گنج کے کسی ہوٹل میں مسز نائیڈو کے خرچے پر ٹھہرا دیے گئے کہ ان دنوں کھلے عام شراب نوشی گورنمنٹ ہاؤس میں نہ کی جا سکتی تھی اور جوش صاحب اپنی شامیں اسی طرح گزارتے تھے۔ اور تنہا نوشی ان کی عادت نہ تھی۔ سُنا کہ وہ گورنمنٹ ہاؤس میں مسز نائیڈو سے رسالہ "آج کل" کی ایڈیٹری کے سلسلے میں سفارش حاصل کرنے آئے ہیں۔ اسی دن جوش پر میرا مضمون انگریزی اخبار "نیشنل ہیرالڈ" میں چھپا تھا اور اس کا ذکر مسز نائیڈو نے ان سے کیا۔ اسی شام کو ان سے نیاز حاصل ہوا۔ بڑے خوش ہوئے، مگر اس خوشی میں ایک اداسی کا پرتو تھا۔

ملک کی فضا بدل چکی تھی، جوش صاحب کا مزاج نہیں بدلا تھا۔ شراب پر مرارجی ڈیسائی کا نزلہ گرا اور شراب بندی نافذ ہوئی۔ جوش صاحب نے پنڈت نہرو کی صدارت میں یوم آزادی کے لال قلعے والے مشاعرے میں خود انہی کو بطورِ خاص مخاطب کر کے ایک رُباعی پڑھی جس کا آخری مصرعہ تھا۔

تم نے چلے میں لنکا ڈھاتے

اور پھر "ماتم آزادی" والی نظم۔

اور پھر یہ نے بڑھتی ہی چلی گئی۔ ایک طرف ملک کی تقسیم کے بعد لنگڑی آزادی اور اُبھرتی ہوئی فرقہ واریت نے ان کا دل توڑ دیا۔ دوسری طرف اردو کی طرف رویے نے ان سے زمیِ گفتار چھین لی۔ کیا یہی وہ ملک تھا جس کے خواب انہوں نے عمر بھر دیکھے تھے؟ اور جب یہ وہ ملک نہیں تھا تو پھر کیا____ ہر ملک ملک ماست کہ ملکِ خدائے ماست۔

وہ پاکستان چلے گئے۔ لیکن اس وقت جب انہیں آل انڈیا ریڈیو کا مشیرِ ادبی نامزد کیا گیا تھا اور راجیہ سبھا کا رکن اعزازی بنایا گیا تھا۔ اور دہلی شہر میں نواب صاحب لوہارو نے انہیں لمبی بیوک گاڑی نذر گزاری

تھی اور ان کے ایک معتقد مند کنور مہندر سنگھ بیدی دہلی کے سربراہ، ان کے شیدائی اور ان کی شراب کے بلوں کے کفیل تھے ــــ مگر جوش صاحب کا خیال تھا کہ یہ ساری باتیں وقتی ہیں۔ ان کی کوئی زیادہ معنویت و حقیقت نہیں تھی۔

وہ چلے گئے۔ بہت دنوں بعد واپس آئے۔ میں دلی آ چکا تھا۔ پہلی ملاقات ایک جلسے میں ہوئی جو عرش ملسیانی کے ریٹائر ہونے پر الوداعیہ کے طور پر غالب کانسی ٹیوشن کلب میں ہو رہا تھا۔ جوش صاحب کے گھٹنے اب تکلیف دینے لگے تھے۔ بیٹھے بیٹھے تقریر کی۔ کہنے لگے عرش صاحب نہایت شریف آدمی ہیں۔ مجھے جب آج کل کے مدیر کی حیثیت سے ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا تو بڑا تعجب ہوا کہ نہ جانے قدرت نے انہیں کس قصور کی سزا دی ہے۔ زندگی بھر پینے کے لئے پانی اور کھانے کے لئے گھاس مقرر کر دی ہے۔ (اشارہ تھا عرش ملسیانی کے سبزی خور ہونے اور شراب کے ہاتھ نہ لگانے کی طرف) مجمع ہنسنے لگا۔ میں بھی ہنسنے لگا۔ مگر اس ہنسی کے پیچھے کتنا دکھ تھا!

پھر دہلی میں کچھ دن رہ کر چند دن کے لئے لکھنؤ گئے تھے۔ واپس آئے تو کسی نے پوچھا: "آپ لکھنؤ ہو آئے؟"

"ہاں صاحب! کیا ہو آئے۔ جہاں گئے معلوم ہوا انتقال فرما گئے۔" یہ اشارہ تھا اس طرف کہ ان کے سبھی پرانے احباب اب دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ یہ اس قدر المناک احساس کو اس قدر طربیہ لہجے میں ادا کرنے کا کلیجہ کس میں ہے!

گلزار دہلوی نے جوش صاحب کی آمد پر اپنی انجمن کا جلسہ کیا۔ اس جلسے میں جوش صاحب نے غالباً کسی سوال کے جواب میں اپنے ہندوستان سے چلے جانے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ میں ملکوں کی جغرافیائی تقسیم کا قائل نہیں ہوں اور سیاسی طور پر قائم کردہ سرحدوں کو تسلیم نہیں کرتا۔ میں اس ملک کے کسی بھی حصے میں رہوں جو کبھی میرا ملک تھا اور ہے۔ یہ بات مجھے بالکل مہمل سی لگتی ہے کہ ایک حصے میں رہا تو وہ میرا وطن ہو گیا اور اس ملک کے کسی دوسرے حصے میں رہا تو مہاجر کہلانے لگا۔" میری نظر کے سامنے ان کی نظم "وطن" پر "شعلہ و شبنم" والا نوٹ گھومنے لگا۔

اسلام آباد (پاکستان) گیا تو ہندوستان کے ہائی کمشنر نٹور سنگھ جی سے پوچھا کہ جوش صاحب سے ملنا مناسب ہوگا یا نہیں۔ میں چونکہ انجمن اساتذۂ ہند کے وفد کے رہنما کی حیثیت سے گیا تھا۔ لہٰذا نٹور سنگھ صاحب نے اس کے خلاف رائے دی۔ کہنے لگے: "آپ تو مل آئیں گے۔ مگر ضیاء الحق کی حکومت جوش صاحب کو تنگ کرے گی۔" میں نے پوچھا: "کیسے؟" کہنے لگے۔ "ممکن ہے کچھ دنوں کے لئے نل یا بجلی کاٹ دے۔" میں نے سینے پر پتھر رکھا اور جوش صاحب سے ملے بغیر چلا آیا۔

آخر وہ دن بھی آگیا جس کا ڈر تھا۔ میں نے خود شراب کی محفلوں میں 'موت' کے ذکر پر جوش صاحب کو جبیں بہ جبیں ہوتے دیکھا تھا۔

"موت: اس سے زیادہ انسان کی کوئی توہین نہیں ہو سکتی!"

آخر وہ پیوندِ خاک ہو گئے۔ وہ جوشِ حیات، وہ ولولہ، وہ زندگی سے بھرپور وجود، وہ وطن دوستی اور انسانیت سے بھرپور دل۔ وہ طور مجھے آج بھی یاد ہے جب فراق گورکھپوری نے اردو گھر میں انہیں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے اعتراف کیا تھا کہ "میں نے بغیر منہ بسورے زندگی کا سامنا کرنا اور شاعری میں زندگی کے کیف و نشاط کو نظم کرنا جوش ہی سے سیکھا۔" بقول جوش ؎

"غنچے تری زندگی پہ دل ہلتا ہے
صرف ایک تبسم کے لئے کھلتا ہے
غنچے نے کہا کہ "اس چمن میں بابا
یہ ایک تبسم بھی کسے ملتا ہے

خمریاتِ جوش

ہشیار کہ آفتاب ہونا ہے تجھے
پیغمبرِ انقلاب ہونا ہے تجھے
ہر صبح کو آتی ہے یہ ساقی کی صدا
بیدار کہ خود شراب ہونا ہے تجھے

کب شیخ ملے گا گل فشانی کر کے؟
کیا پائے گا توہینِ جوانی کر کے؟
تو آتشِ دوزخ سے ڈراتا ہے انہیں!
جو آگ کو پی جاتے ہیں پانی کر کے!

اب مطربِ وقت کا ترانہ ہے کچھ اور
بدلی ہوئی دنیا کا فسانہ ہے کچھ اور
ہاں تازگیِ طبع کی روکے ہوئے باگ
شبّیر حسن خاں یہ زمانہ ہے کچھ اور

جگن ناتھ آزاد

جوشؔ صاحب

(زیرِ تصنیف کتاب "جوشؔ صاحب اور میں" کا پہلا باب)

یوں تو حضرت جوشؔ ملیح آبادی کے ساتھ میری ملاقاتیں تقسیم ہند سے پہلے ہی شروع ہو گئی تھیں ۔ لیکن وہ جسے رفاقت کہتے ہیں ، آزادی کے بعد شروع ہوئی ۔ ۱۹۴۸ء میں جب کہ جوشؔ صاحب پبلی کیشنز ڈویژن دہلی میں شعبۂ اردو کے مدیر مقرر ہوئے اور میں اُن کا نائب مدیر۔

تقسیم ہند سے پہلے کی ملاقاتوں کی روداد بہت مختصر ہے اور میں نہیں کہہ سکتا کہ اُنہیں ملاقاتیں کہا بھی جا سکتا ہے یا نہیں ۔

غالباً ۳۵ء یا ۳۶ء کی بات ہے ۔ رابندر ناتھ ٹیگور لاہور تشریف لائے تھے ۔ اُن کے اعزاز میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا ۔ بریڈلا ہال میں ۔ اس مشاعرے میں جوشؔ صاحب کو میں نے پہلی بار دیکھا ۔ بہت ادب سے ساتھ اُنہیں سلام کیا ۔ اُن کا کلام اُن کی زبانی سننے کا بڑا اشتیاق تھا ۔ وہ شوق پورا نہ ہو سکا ۔ کیونکہ اس مشاعرے میں دو چار اشعار سننے کے بعد سامعین نے اُنہیں ہوٹ کر دیا ۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جوشؔ صاحب نے اپنی نظم "پروگرام" ترنم سے پڑھنا شروع کی ۔ ترنم اُن کا خاصا بھونڈا تھا ۔ ابھی ایک یا دو شعر پڑھے ہوں گے کہ سامعین کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور جوشؔ صاحب کو واپس اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ جانا پڑا ۔

چند برس کے بعد جوشؔ صاحب پھر لاہور تشریف لائے ۔ اب کے مجازؔ بھی اُن کے ساتھ تھے ۔ رائل ہوٹل (انارکلی) میں اُن کا قیام تھا ۔ میں اُس زمانے میں لاہور میں مقیم تھا ۔ اُن سے ملنے کے لئے گیا ۔ شام کا وقت تھا ۔ سامان نائے و نوش اُن کے سامنے موجود تھا ۔ اگرچہ ابھی نائے و نوش کا شغل شروع نہیں ہوا تھا ۔ شاید غروب آفتاب میں ابھی کچھ دیر تھی اور جوشؔ صاحب اس کے انتظار میں تھے ۔ چودھری نذیر احمد صاحب مالک مکتبۂ اردو وہاں پہلے سے موجود تھے ۔ غالباً یہ دعوت اُنہی کی طرف سے تھی ۔ اگرچہ وہ نائے و نوش میں شریک نہیں ہوئے ۔

جوشؔ صاحب کی یہ آمد بھی ایک مشاعرے کے سلسلے میں تھی اور یہ مشاعرہ کانگریس نے منعقد کیا تھا ۔ میں ڈاکٹر ٹیگور والے مشاعرے میں مدعو نہیں تھا ۔ اس میں والد محترم کے ہمراہ گیا تھا ، لیکن جوشؔ صاحب کو دیکھ نہ سکا ۔ اس مشاعرے میں 'میں' مدعو تھا ، لیکن میں گیا نہیں ۔ کیوں کہ میں اُس زمانے میں بی ۔ اے پاس کرنے کے بعد سرکاری ملازمت کی تلاش میں تھا اور اس صورت میں کانگریس کے مشاعرے میں شرکت خلافِ مصلحت تھی ۔ یہ الگ بات ہے کہ سرکاری ملازمت مل نہ سکی ۔

دوسرے روز احباب اور اخبارات کے ذریعے سے مشاعرے کی روداد معلوم ہوئی ۔ پتہ چلا کہ جوشؔ صاحب نے مشاعرہ لوٹ لیا ۔

تیسری ملاقات امرتسر کے ایک مشاعرے میں ہوئی ۔ یہ مشاعرہ جنگی مشاعرہ تھا یعنی دوسری جنگِ عظیم کے دنوں میں انگریزوں کی مدد کے لئے منعقد کیا گیا تھا ۔ ریاض قریشی ریلوے مجسٹریٹ امرتسر اس مشاعرے کے منتظم تھے اور ای ۔ پی ۔ مون ، ڈپٹی کمشنر امرتسر اس کے سرپرست ۔ یہ مشاعرہ امرتسر کے ایک سنیما ہال میں منعقد ہوا تھا ۔

یہ مشاعرہ تھا تو جنگ کے مقاصد کی حمایت میں ، لیکن جوشؔ نے اپنے کلام کی ابتدا اس قطعہ سے کی : ؎

سنو اے ساکنانِ خاکِ پستی   ندا کیا آ رہی ہے آسماں سے
کہ آزادی کا اک لمحہ ہے بہتر   غلامی کی حیاتِ جاوداں سے

اس قطعہ پر سامعین کی کیا حالت ہوئی یہ بیان کرنا مشکل ہے ۔ مشاعرہ گاہ میں گویا قیامت آ گئی ۔ لوگ اُچھل اُچھل کر داد دے رہے تھے ۔ منتظم مشاعرہ ریاض قریشی کی حالت قابلِ دید تھی ۔ اُن کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا ، ایک جاتا تھا ۔ وہ بیچارے کبھی ای ۔ پی ۔ مون کی طرف دیکھتے تھے ، کبھی جوشؔ کی طرف ۔ ڈائس پر بیٹھے ہوئے شعراء میں کھسر پھسر ہونے لگی کہ کل ریاض قریشی ملازمت سے برطرف کر دیے جائیں گے وغیرہ وغیرہ ۔ جوشؔ ملیح آبادی کل گرفتار کر لئے جائیں گے وغیرہ وغیرہ ....

اور جوشؔ ان تمام باتوں سے بے نیاز اپنی نظم سُنانے میں گُم تھے ۔ قطعہ کے بعد انہوں نے یہ نظم شروع کی تھی ۔

آج اگر بادون کا گھر سیتا کا زنداں ہے تو کیا

نظم پوری طرح سامعین کے جذبات کا ساتھ دے رہی تھی اور پھر جوشؔ کے

لے ۔ ۲۵ ۔ گورنمنٹ کوارٹرس ، گاندھی نگر ، جموں توی ، جموں کشمیر

پڑھنے کا انداز۔ قیامت پر قیامت برپا ہو رہی تھی۔

جوش صاحب کی زبانی اُن کا کلام سننے کا یہ میرا پہلا موقع تھا (بریڈلا ہال والے مشاعرے کو چھوڑ کے جہاں سننا نہ سننا برابر ہو گیا تھا) اور ظاہر ہے کہ اس تاریخی کلام خوانی سے میں کتنا متاثر ہوا ہوں گا۔

وقت گزرتا چلا گیا۔ ملک تقسیم ہو گیا اور میں ایک ریفیوجی کی حیثیت سے دہلی آ گیا۔ اپنی داستانِ ہجرت میں اپنی خود نوشت سوانح حیات "باتیں ہماری یاد رہیں"[۵] میں تفصیل سے سنا چکا ہوں۔ اس لئے اس روداد کو یہاں نہیں دہراؤں گا۔ صرف اتنا ہی بیان کروں گا کہ سردار پٹیل نے وزارتِ اطلاعات و نشریات کے سربراہ کا عہدہ سنبھالتے ہی "آج کل" مرحوم کو دوبارہ زندہ کر دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی دو اور ماہ نامے بھی معرضِ وجود میں آئے۔ "بساطِ عالم" اور "نونہال"۔ "بساطِ عالم" بین الاقوامی ذکر اذکار کے لئے وقف تھا اور نونہال بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے۔ دراصل یہ تینوں ماہ نامے شعبۂ اردو کے کام کا ایک حصّہ تھے اور شعبۂ اردو کا کام خاصا وسیع تھا۔ اردو پمفلٹوں کی اشاعت ایک بہت بڑا کام تھا جو اس شعبے کے سپرد تھا۔

جب اس شعبے کے ادارتی اسٹاف کا انتخاب ہوا تو جوش صاحب اس کے مدیرِ اعلیٰ اور عرش ملسیانی، بلونت سنگھ اور راقم الحروف اس کے نائب مدیر مقرر ہوئے۔ بعد میں پنڈت ہری چند اختر بھی نائب مدیروں کی صف میں آ کے شامل ہو گئے۔

ایک پنڈت ہری چند اختر کو چھوڑ کر باقی تمام نے مئی ۱۹۴۸ء میں اپنے اپنے عہدے سنبھال لئے اور کام کی تقسیم یوں ہوئی کہ "آج کل" عرش کے حصّے میں آیا۔ "بساطِ عالم" کی ادارت راقم الحروف کے سپرد ہوئی اور "نونہال" بلونت سنگھ کے حوالے ہوا۔ جوش صاحب کی حیثیت مدیرِ اعلیٰ کی تھی۔

پہلے ہی دن جوش صاحب سے جب تفصیلی ملاقات ہوئی تو محسوس ہوا کہ ایک باغ و بہار شخصیت کی صحبت نصیب ہوئی ہے۔ جوش صاحب تہذیب و شرافت کا بھی مرقع تھے اور لکھنوی آداب، رکھ رکھاؤ اور تکلفات کا بھی۔ پہلی بار جب میں اُن کے کمرے میں گیا اور "آداب عرض" کہا تو وہ کھڑے ہوئے۔ ہاتھ ملایا اور آداب عرض کا جواب دیا۔ اگرچہ ان کے اس طرح کھڑے ہونے سے مجھے embarassment ہوئی۔ لیکن میں نے سمجھا کہ میں چونکہ پہلی بار اُن کے کمرے میں حاضر ہوا ہوں، اُنہوں نے تکلف سے کام لیا ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ ہر روز جب بھی میں اُن کے کمرے میں داخل ہوں گا وہ اسی طرح احتراماً کھڑے ہوں گے، ہاتھ ملائیں گے، آداب عرض کہیں گے۔ اور تب اپنی کرسی پر بیٹھیں گے۔

تیسرے ہی دن میں نے اُن کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ ہر روز اس طرح زحمت نہ کیا کریں۔ آپ کی خدمت میں حاضر ہونا میرے لئے سعادت کا باعث ہے۔ آپ ہر روز کھڑے ہو کر ملتے ہیں اس سے مجھے بڑی اُلجھن ہوتی ہے ——— لیکن اُن کا یہ معمول اُس وقت تک جاری رہا جب تک میری اُن کی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

اُسی روز بات چیت کے دَوران اُن سے میں نے یہ بھی کہا کہ آپ اگر میری زبان اور میرے لب و لہجے پر نظر رکھیں اور گفتگو کے دوران میری اغلاط سے مجھے آشنا کریں تو میں آپ کا ممنون ہوں گا۔ کہنے لگے۔ "آنند صاحب' یہ کہنا آسان ہے، لیکن اس پر عمل کرنا مشکل ہے۔ ہو سکتا ہے آپ کسی وقت بُرا مان جائیں اور اس کا اثر ہمارے باہمی تعلقات پر پڑے"۔ میں نے کہا۔ جوش صاحب، نہ میں بُرا مانوں گا اور نہ ہی کبھی میرے آپ کے تعلقات میں خرابی آئے گی۔ لیکن ایک بات ہے اور وہ یہ کہ اگر میں کسی وقت آپ کی اصلاح قبول نہ کر سکوں تو آپ بھی بُرا نہیں مانیں گے۔

اس پر وہ ذرا چونکے اور کہا "کیا مطلب؟"

میں نے بڑے ادب سے عرض کیا۔ "میں زبان کے معاملے میں مولانا تاجور نجیب آبادی کا شاگرد ہوں وہ دہلی کی زبان کو سند مانتے ہیں اور آپ کے لئے لکھنؤ کی زبان سند ہے۔ اپنی اغلاط کی تصحیح کے لئے میں ہر وقت تیار ہوں، لیکن دہلی اور لکھنؤ کی زبان اور محاورے کے متعلق مجھے آزادی ہونا چاہئے کہ میں جسے چاہوں قبول کروں۔

اُن کے چہرے سے مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے میری اس بات کو اُنہوں نے پسند نہیں کیا۔ لیکن اُنہوں نے جواب میں ایسی کوئی بات نہ کہی جس سے یہ ظاہر ہو کہ میری بات اُنہیں ناگوار گزری ہے۔

کچھ دن بعد کی بات ہے کہ میں اُن کے کمرے میں داخل ہوا اور حسبِ دستور اُن سے کہا۔ "آداب عرض جناب' مزاج اچھے ہیں"۔ وہ بھی حسبِ معمول اپنی جگہ سے اُٹھے، ہاتھ ملایا۔ لیکن فوراً ہی یہ جملہ کہا۔

"دیکھئے جناب، مزاج اگرچہ مختلف کیفیتوں کا مجموعہ ہے، لیکن ہے واحد، جمع نہیں ہے"۔

میں نے کہا۔ اس اصلاح کا شکریہ۔ لیکن غالباً احترام کے خیال سے ہم لوگ "مزاج اچھے ہیں؟" کہتے ہیں۔ کہنے لگے "احترام اپنی جگہ پر بجا ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ آپ واحد کو جمع بنا دیں"۔[۶]

زبان کے معاملے میں یہ پہلا درس تھا جو مجھے جوش صاحب سے ملا۔

چند دن بعد ایک مشہور اہلِ قلم اُن سے ملنے کے لئے آئے۔ اُنہوں نے آتے ہی کہا ——— "آداب عرض ہے جوش صاحب' مزاج اچھے ہیں ———"

جب وہ ایک آدھ گھنٹہ بیٹھ کے اور بات چیت کر کے چلے گئے۔ تو میں نے کہا۔ "آپ نے دیکھا۔ ان صاحب نے بھی یہی کہا تھا۔ "مزاج اچھے ہیں؟" جھٹ سے بولے۔ "یہ لوگ یونیورسٹیوں کے پروفیسر ہیں، انہیں زبان و ادب سے کیا تعلق؟

۶؎ یہ واقعہ میں نے تفصیل سے "نشانِ منزل" میں بیان کیا ہے۔ اس لئے اس کا باقی حصہ یہاں نہیں دُہرا رہا ہوں۔

۵؎ یہ کتاب زیرِ طباعت ہے۔

اسی طرح وقت گزرتا گیا۔ ہمارا دستور یہ تھا کہ دن میں ہم تینوں عرشؔ بلونت سنگھ اور راقم الحروف اپنا اپنا کام نمٹا کر جوش صاحب کے کمرے میں جمع ہوجاتے تھے۔ اکثر تو ایسا ہوتا تھا کہ وہاں کوئی نہ کوئی صاحب پہلے سے موجود ہوتے تھے۔ اور محفل جمی ہوتی تھی یا ہمارے جانے کے بعد ایک یا دو یا تین چار اہلِ قلم آجاتے تھے اور محفل اپنے رنگ پر آجاتی تھی اور اگر باہر سے کوئی نہ ہوتا تو ہم سے ہی محفل جمانے کے لئے کہا کرتے اور جوش صاحب تو خود ایک محفل سے کم نہیں تھے وہ انجمن بھی تھے اور جانِ انجمن بھی۔

اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ جوش صاحب گھر سے کوئی نظم مکمل کرکے لاتے تھے اور فوراً ہی چپراسی کے ہاتھ ہمیں پیغام بھیجتے تھے کہ آپ سب حضرات آجائیے۔ چنانچہ ہم پہنچ جاتے تھے جوش صاحب اپنا کلام سناتے تھے اور داد کے طوفان میں محفل ختم ہوتی تھی۔

ایک دن کی بات ہے ایسی ہی ایک محفل جمی ہوئی تھی اور جوش اپنی نظم سنا رہے تھے۔ غالباً عنوان یہ تھا "سینۂ عدم میں وجود کا پیچ و تاب" طویل نظم تھی، چالیس پچاس اشعار پر مشتمل۔ تو عرش نے کہا کہ نظم لاجواب ہے۔ اور اس میں خوبی یہ ہے کہ ایک ہی بات کو پچاس بار مختلف انداز سے کہا گیا ہے۔ معلوم نہیں عرش نے یہ بات تعریفی انداز میں کہی تھی یا تنقیدی انداز میں۔ لیکن جوش یہ سُن کر بولے "ہاں یہ تو ہمارا خاص فن ہے اور پھر اس خشک فلسفیانہ موضوع کو دلکش بنانے کے لئے اسے طرح طرح سے بیان کرنا بھی بہت ضروری ہے۔" اور پھر میر انیس کا یہ مصرع پڑھا۔

اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

میرے منہ سے اتنا ہی نکلا "لیکن انیس نے یہ مصرع فلسفیانہ شاعری کے متعلق نہیں کہا"

"کیسی شاعری کے متعلق کہا ہے؟" جوش نے طنزیہ انداز سے سوال کیا۔

میں نے عرض کیا "فلسفیانہ شاعری میں کمالِ فن ایجاز ہے نہ کہ اطناب۔ جیسے ملٹن کی شاعری میں۔" عرش اور بسمل بھانپ گئے کہ میں نے مصلحتاً اقبال کا نام نہیں لیا۔ یہ دونوں ان محفلوں کے مردِ میدان تھے۔ انہوں نے کوئی اور موضوع چھیڑ کے بات کا رُخ بدل دیا۔ کیوں کہ وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ یہ بات چیت جوش صاحب کو پسند نہیں آرہی ہے۔

اقبال کا تعریفی انداز میں ذکر جوش صاحب کو اچھا نہیں لگتا تھا۔ خدا جانے اقبال کے تعلق سے کون سا احساسِ کمتری اُن کے اندر کام کر رہا تھا کہ اقبال کی بات ہوتی تھی تو اُن کی کیفیتِ انقباض اُن کے چہرے سے ظاہر ہوجاتی تھی۔ اگرچہ اقبال کے بعد اہلِ ملک نے عزت اور محبت کے خزانے انہی پر نچھاور کر دئے تھے، لیکن غالباً وہ اس قدردانی سے مطمئن نہیں تھے۔ اُن کے دل میں یہ خیال بیٹھ گیا تھا کہ وہ اقبال سے زیادہ بڑے شاعر ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ اقبال کو بڑا شاعر تسلیم ہی نہیں کرتے تھے۔ ہاں کبھی موڈ میں ہوتے تھے تو ان کے کسی شعر کی تعریف کر بھی دیتے تھے۔ مثلاً یہ شعر انہوں نے کئی بار ہمیں سنایا اور اس کی تعریف کی۔

بو علی اندر غبارِ ناقہ گم — دستِ رومی پردۂ محمل گرفت

ویسے اقبال کے اکثر اشعار پر وہ اعتراض ہی کیا کرتے تھے اور اعتراض بھی طعن و تشنیع کے انداز میں۔ یہی اعتراضات اب ان کی خود نوشت سوانح حیات "یادوں کی برات" میں شامل ہیں، لیکن کسی اور کے نام سے۔ مثلاً یہ کہ فلاں صاحب اقبال کے اشعار پر اعتراض کرتے ہوئے یہ کہا کرتے تھے کہ جرائم کئی رنگ کے ہوتے ہیں۔ سرخ، سپید، سیہ۔ اقبال کے جرائم سیہ تھے اور ان سیہ جرائم کو ایک شامیانے کے نیچے اماں ملی تھی جس کا نام تھا عفوِ بندہ نواز۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے اعتراضات سے محفل بے لطف ہوجاتی تھی۔ میں اس طرح کے اعتراضات سُن کر خاموش ہی رہتا تھا۔ خاموشی کا بڑا سبب یہ تھا بحث کرنے سے بات کے بگڑ جانے کا اندیشہ رہتا تھا اور ممکن تھا کہ بات بگڑ جانے سے یہ محفل ہمیشہ کے لئے ختم ہوجاتی اور اگر محفل برقرار رہتی اور میں اس میں شریک نہ ہوتا تو اور بری بات ہوتی۔ دوسرا جوش صاحب کو خفا کرنے کا تو میں تصور ہی نہ کر سکتا تھا۔ لیکن بعض دفعہ ایسا بھی ہوا کہ احتیاط برتنے کے باوجود صورتِ حال خراب ہوگئی۔ اس طرح کا ایک واقعہ میں یہاں درج کرتا ہوں:

جگر صاحب نے ایک غزل کہی تھی

تو مرے حالِ پریشاں پہ بہت طنز نہ کر
اپنے گیسو ہی ذرا دیکھ کہاں تک پہنچے

میں نے بھی اسی زمین میں ایک غزل کہی۔ اسی زمانے میں "الحمراء" لاہور میں ڈاکٹر محمد باقر کا ایک مقالہ شائع ہوا تھا جس میں صاحبِ مضمون نے کلامِ اقبال میں تضادات کو نمایاں کیا تھا۔ میں نے یہ مقالہ پڑھا تو اپنی غزل کے آخر میں اس قطعہ کا اضافہ کیا

بحرِ اقبال کی تہہ تک نہ پہنچنے والے — حیف گر تم سرِ سطحِ رواں تک پہنچے
عقل اور عشق تضادات نہیں ہیں ہرگز — سخت حیرت ہے جو ادراک یہاں تک پہنچے
جلوۂ عشق بجز روشنیٔ عقل نہیں
کاش یہ نکتہ تری ظلمتِ جاں تک پہنچے

انہی دنوں میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی کتاب "روحِ اقبال" جوش صاحب کے زیرِ مطالعہ تھی اور وہ اس کے حاشیے پر جا بجا طنزیہ جملے لکھ رہے تھے۔ یہ داستان میں اسی تحریر میں آگے چل کے سناؤں گا۔ پہلے اپنی غزل اور قطعہ والی بات ختم کرلوں۔

تو چونکہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی کتاب جوش صاحب کے زیرِ مطالعہ تھی، اس لئے وہ کبھی کبھار دفتر میں ہم لوگوں کے ساتھ بات چیت میں بھی اس کتاب کا ذکر لے بیٹھتے تھے اور اقبال کے اکثر تصورات زیرِ بحث آجاتے تھے۔ جوش صاحب چونکہ عشق پر عقل کی فوقیت کے "مدعی" تھے اس لئے عقل اور عشق کا موضوع بالعموم زیرِ بحث آجاتا تھا۔ اب جو عقل و عشق کے موضوع پر میرے یہ اشعار "الحمراء" میں چھپے تو میرے ایک دوست نے جا کر "الحمراء" کا یہ شمارہ کھول کر ان کے سامنے رکھ دیا اور کہا کہ آپ تو اُستاد کا ذکر بڑی محبت سے کرتے ہیں اور اس نے تو آپ کے متعلق یہاں تک کہہ دیا ہے۔

کاش یہ نکتہ ترس خلوتِ جاں تک پہنچے

جوش صاحب کانوں کے کچے تو تھے ہی فوراً اس بات پر انہوں نے یقین کر لیا کہ یہ قطعہ میں نے اُن کے بارے میں کہا ہے ۔ ادھر تو میرے مذکورہ دوست نے میرے خلاف جوش صاحب کے کان بھرے اور اُدھر مجھ سے آکے کہہ دیا کہ آج میں جوش صاحب کے کمرے میں گیا تو "الحمرا" کا وہ شمارہ جس میں آپ کے اشعار چھپے ہیں اُن کے سامنے رکھا تھا اور وہ آپ کے اشعار پڑھ رہے تھے ۔ میں گھبرا گیا کہ محققین اپنا کام کر گئے ۔ دو تین دن اسی تذبذب کے عالم میں رہا کہ جوش صاحب کو کیسے یقین دلاؤں کہ یہ اشعار میں نے آپ کے متعلق نہیں کہے ۔ چنانچہ دو تین روز تک اُن سے ملنے کی جرأت میں نے نہیں کی ۔ اب میرے مذکورہ دوست کو اپنی بات کا یقین دلانے کا اور موقع مل گیا ۔ اُنہوں نے جوش صاحب سے کہا کہ دیکھئے یہ اشعار چھپنے کے بعد آزاد آپ سے نہیں ملا ۔ جوش صاحب کو پہلے ہی یقین آچکا تھا کہ یہ اشعار میں نے اُن کے خلاف کہے ہیں ۔ اب یہ یقین اور پختہ ہو گیا چنانچہ انہوں نے ایک پرچہ لکھ کر چپراسی کے ہاتھ میرے پاس بھیجا ۔ اس میں اُنہوں نے لکھا تھا :

" میاں آزاد ! میں کوئی مونڈا نہیں ہوں کہ ذرا سی بات کا بُرا مان جاؤں ۔ آپ کو چاہیئے کہ آپ میرے پاس آئیں ہم دونوں اقبال کے نظریۂ عقل و عشق پر بحث کریں اور ایک نتیجے پر پہنچیں ۔"

مجھے جب یہ پرچہ ملا تو میں اپنے کام میں بے حد مصروف تھا ۔ میں نے جواب میں لکھ بھیجا ،

" محترم المقام :

عنایت نامہ کے لئے سراپا سپاس ہوں ۔ اس وقت بے حد مصروف ہوں کوئی ایک گھنٹہ تک حاضر ہوں گا ۔ ویسے میں یہ سمجھتا ہوں کہ ادبی بحث کا مقصد کسی نتیجے پر پہنچنا نہیں ہوتا بلکہ مختلف مسائل اور پہلوؤں کا جائزہ لینا ہوتا ہے ۔"

چنانچہ اپنا کام ختم کرنے کے بعد میں اُن کے کمرے میں حاضر ہوا ۔ جوش صاحب حسب معمول اُٹھ کر مجھ سے ملے ۔ میرے مذکورہ دوست بھی وہاں موجود تھے ۔ اور منافقت کی تصویر بنے بیٹھے تھے ۔ سب سے پہلے تو میں نے جوش صاحب کے سامنے اپنی صفائی پیش کی اور کہا یہ صحیح ہے کہ اقبال کے فکر و فن سے متعلق میرے اور آپ کے خیالات میں بہت فرق ہے ، لیکن میں کبھی اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ آپ کی طرف میرا روئے سخن اس طرح کا ہوگا ۔ یہ اشعار میں نے "الحمرا" کے ایک مقالے کے جواب میں کہے ہیں ۔ اب اس کا کیا کیا جائے کہ وہ مقالہ دو ماہ قبل چھپا تھا جب میں نے اپنے اشعار حامد علی خاں کو بھیجے تو اگلے ماہ کا شمارہ پریس میں جا چکا تھا اور اب جب میرے اشعار والا شمارہ چھپ کے آیا تو یہاں چند روز سے اقبال کے نظریۂ عقل و عشق پر بحث چل رہی تھی ۔ میں نے اُن سے یہ بھی کہا کہ میں نے اپنی غزل کے بعد قطعے کے شروع میں یہ لکھا تھا :

ڈاکٹر محمد باقر سے معذرت کے ساتھ
لیکن راجہ حامد علی خاں نے اسے بدل کے لکھ دیا :
نقادانِ اقبال سے معذرت کے ساتھ ۔

اب معلوم نہیں جوش صاحب کو میری ان تمام باتوں کا یقین آیا یا نہیں لیکن یہ سب کچھ کہہ دینے کے بعد میرے دل پر سے بوجھ ہٹ گیا ۔

جوش صاحب کی ایک بہت بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ دل میں کینہ نہیں پالتے تھے ۔ کسی بات پر اگر ناراض ہو جاتے تھے تو اُن کا غصہ تھوڑی ہی دیر رہتا تھا ۔ اس کے بعد وہ غصے والی بات کو بالکل فراموش کر دیتے تھے ۔ میرا خیال ہے میرے خلاف اُنہیں جو شکایت رہی ہوگی وہ بہت جلد اُن کے دل سے فراموش ہو گئی ہوگی ۔ کم از کم مجھے اس بات کا کبھی گمان نہیں ہوا کہ میرے خلاف مذکورہ شکایت کو وہ اپنے دل میں پالے ہوئے ہیں ۔

ابھی میں نے کہا ہے کہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی کتاب "روحِ اقبال" کا ذکر میں بعد میں کروں گا ۔ وہ بھی سن لیجئے ۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی کتاب "روحِ اقبال" کا نیا ایڈیشن چھپا تو مجھے اس کی ایک جلد مکتبہ جامعہ کی طرف سے تبصرے کے لئے ملی ۔ میں اس زمانے میں انڈین پی ۔ ای ۔ این (بمبئی) میں The literary scene کے زیرِ عنوان اردو کے بارے میں ہر ماہ باقاعدگی سے لکھا کرتا تھا ۔ اس کتاب کے اکثر مباحث سے اختلاف کے باوجود یہ کتاب مجھے پسند آئی ۔ اور میں نے جوش صاحب سے اس کا ذکر کیا ۔ اُنہوں نے مجھ سے پڑھنے کے لئے یہ کتاب مانگی اور یہ کتاب اُنہوں نے پوری توجہ سے پڑھی ۔ لیکن بنیادی بات یہ ہے کہ اُنہیں نہ اقبال کی شاعری پسند تھی اور نہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے سے خیالات رکھنے والے لوگ پسند تھے ۔ چنانچہ اُنہوں نے جا بجا حواشی سے یہ کتاب پُر کر دی ۔ اقبال کا ایک مصرع ہے :

من جواں ساقی تو پیرِ کہنِ میکدہ

اس کے حاشیے میں اُنہوں نے لکھا ہے " اتنا معلوم نہیں کہ ساقی کی یائے عرفی تخفیف میں آ رہی ہے ۔" اقبال پر طنز کرتے ہوئے قوالی " کیے واہ " بھی اُنہوں نے اسی زمانے میں کہی تھی ۔ اب اتنی مدت کے بعد مجھے یہ تو یاد نہیں رہا کہ "روحِ اقبال" پر اُنہوں نے جو حواشی لکھے تھے ، اُن کی تفصیل کیا تھی ۔ لیکن اتنا یاد ہے کہ کتاب کا کوئی صفحہ حواشی سے خالی نہیں تھا ۔ یہ حواشی والی کتاب مجھ سے میرے دوست محمد طفیل "مدیر نقوش" نے لے لی تھی ۔ معلوم نہیں اس وقت اُن کے پاس محفوظ ہے یا کہیں گم ہو گئی ہے[1]

ایک بات جس کا ذکر بہت پہلے آنا چاہئے تھا بھول گیا ہوں ۔ وہ یہ ہے

---

[1] دراصل میں نے زیرِ تحریر کتاب جس کا یہ پہلا باب ہے کئی برس پہلے لکھنا شروع کی تھی ۔ اس مدت میں طفیل صاحب کا بھی انتقال ہو چکا ہے ۔ لیکن میں اب اس تحریر میں کوئی تبدیلی نہیں کرنا چاہتا ۔ جن واقعات کے تعلق سے التباس پیدا ہونے کا اندیشہ ہوگا ، اُن کی وضاحت حاشیے میں کر دوں گا ۔
(آزاد)

کہ جب "آج کل"، "بساطِ عالم" اور "نونہال" کا کام ہم لوگوں کے سپرد ہوا تو جوش صاحب سے میں نے کہا کہ "بساطِ عالم" کے لئے پنڈت جواہر لال نہرو کا پیغام آنا چاہیے۔ چنانچہ جوش صاحب نے انہیں خط لکھا اور اس میں یہ لکھا کہ اگر آپ کا پیغام نہ ملا یا پیغام ملنے میں دیر ہوئی تو آپ کے ساتھ میری ایسی جنگ چھڑ جائے گی، جس کا فیصلہ دنیا کی کوئی یو۔ این۔ او نہیں کر سکے گی۔ اس خط کے ملتے ہی پنڈت جواہر لال نہرو کا مندرجہ ذیل پیغام آیا۔

"کچھ عرصے سے میں نے ارادہ کیا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اخباروں اور رسالوں کو پیغام نہ بھیجا کروں۔ ایسے پیغاموں کی جتنی مانگ آتی ہے اُن کا جواب دینے میں سارا کام رُک سکتا ہے۔ علاوہ اس کے اخباروں اور رسالوں کو پیغام دینے سے پہلے ان کا امتحان ہونا چاہئے۔ پہلے سے طے دینا کچھ مناسب معلوم نہیں دیتا۔

لیکن میرے پرانے دوست جوش ملیح آبادی نے اتنا اصرار کیا ہے یہاں تک کہ ایک الٹی میٹم دیا ہے۔ لہٰذا میرے لئے بالکل انکار کرنا مشکل ہو گا۔

ظاہر ہے کہ جو رسالہ جوش صاحب نکال رہے ہیں وہ دلچسپ ہو گا اور شاعرانہ ہو گا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بہت لوگوں کو نئی دنیا کے خیالات پہنچائے گا۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ اس کام میں جوش صاحب کو کامیابی ہو گی۔

نئی دلی۔ ۲۸ ؍ جون ۱۹۴۸ء جواہر لال نہرو

"بساطِ عالم" کے لئے تو پیغام آ گیا۔ "آج کل" کے لئے پیغام کی ضرورت نہیں تھی۔ دراصل یہ ایک پرانا جریدہ تھا۔ کچھ مدت بند رہنے کے بعد نئے دور میں دوبارہ شروع ہو رہا تھا۔ اس کی ادارت عرش کے سپرد تھی۔ عرش نے اُن سے کہا کہ اس میں آپ کے قلم سے ایک اداریہ ہونا چاہیے۔ جوش نے کہا۔ تھوڑی دیر میں آ کر لے جائیے۔ چنانچہ دس پندرہ منٹ کے بعد ہم تینوں عرش، بلونت سنگھ اور راقم الحروف کی طلبی ہوئی۔ جوش صاحب کے کمرے میں پہنچے۔ اداریے کے صفحے کے لئے ایک تحریر وہ سپردِ قلم کر چکے تھے۔ وہ اُنہوں نے ہمارے سامنے رکھی۔ اور ہم سے کہا۔ اس پر دستخط کیجئے۔ چنانچہ ہم سب نے اس تحریر کے نیچے اپنے اپنے دستخط کئے اور وہ تحریر یہ ہے:

"یاد ش بخیر ۱۹۲۵ء یا ۱۹۲۶ء میں دہلی سے جب میں نے "کلیم" جاری کیا تھا۔ کتنا بلند حوصلہ تھا دل میں اور کتنا زبردست سودا تھا سر میں۔ "کلیم" کو آسمانِ صحافت کا آفتاب بنا دوں گا۔ اس کا اتنا بلند معیار ہو گا کہ ایشیا اور یورپ دونوں میں اس کی نظیر نہیں مل سکے گی۔"

لیکن چند ہی مہینے گزرنے پائے تھے کہ حوصلے سرنگوں ہو گئے۔ اوّل اوّل تو صرف درجۂ اوّل ہی کے مقالے شائع کئے گئے پھر درجہ دوم کے مقالے بھی باریاب ہونے لگے۔ اور آخر میں درجہ سوم کے مضامین بھی چھپنے لگے۔ اِنّا لِلّٰہ وَاِنّا اِلَیہ راجعون!

یہ کیوں ہوا؟ بڑی تلخ داستان ہے۔ یہاں لکھے پڑھے ہی ماشاءاللہ کتنے ہیں اور جو لکھے پڑھے ہیں اُن کا مبلغ علم ذوق و ادب کیا ہے اور جو چار معیاری لکھنے والے ہیں وہ عزت و آسودگی کی زندگی سے کس قدر ہولناک فاصلے پر عمر کی تلخ گھڑیاں گزار رہے ہیں۔ شرم آتی ہے ان باتوں کو بیان کرتے۔

اس لئے، اگر میں "آج کل" کے باب میں بڑی بڑی اُمیدیں نہ دلاؤں اور بلند آہنگی کے ساتھ بڑے بڑے دعوے نہ کروں تو معذور سمجھ کر مجھے معاف فرمایا جائے۔

ہر چند جہاں تک انسانی مساعی کا تعلق ہے ہر ممکن سعی کی جائے گی کہ معنوی اور صوری دونوں حیثیتوں سے "آج کل" کم سے کم ہندوستان کا بہترین جریدہ ثابت ہو۔ لیکن مندرجہ بالا چند سطریں" بہ ثباتِ "عقل و ہوش" اس لئے لکھ دی ہیں کہ سند رہے اور بوقتِ ضرورت کام آوے۔"

گواہ شد	گواہ شد	گواہ شد	راقم:
عرش	آزاد	بلونت سنگھ	جوش
			مورخہ ۵ ؍ جولائی ۱۹۴۸ء
			بمقام دہلی۔ تحصیل و پرگنہ دہلی

●●

قطعات

مرا وجود حسیں امتزاجِ اشک و شرر
ملاحتیں بھی اگر ہیں تو ہیں صباحت کوش
مری حیات سے رومانِ خلد ہم آغوش
تو میرے دل کو عطا کر سکوں، خدا کے لئے

دنیا میں ہیں بے شمار آنے والے
آتے ہی رہیں گے روز جانے والے
عرفانِ حیات ہو مبارک تجھ کو
اے شدتِ غم پہ مسکرانے والے

ڈاکٹر سید داؤد اشرف

جوشؔ اور سابق ریاست حیدرآباد

اُردو کے بلند مرتبت اور اپنے عہد کے نمائندہ شاعر جوشؔ ملیح آبادی کا حیدرآباد سے بڑا قریبی تعلق اور گہرا لگاؤ رہا ہے۔ حیدرآباد نے جوشؔ کو جب کہ وہ ایک جواں سال اُبھرتے ہوئے شاعر تھے، ہاتھوں ہاتھ لیا تھا اور ان کی خوب قدر افزائی کی تھی۔ خود بقول جوشؔ کہ اُنہوں نے حیدرآباد میں اپنی جوانی کے بہترین ایام صرف کئے تھے اور حیدرآباد نے اُن کی شاعری کو آب و رنگ بخشا اور علم و فکر کا راستہ دکھایا۔

جوشؔ نے حیدرآباد میں اپنی عمرِ عزیز کے لگ بھگ دس سال گزارے تھے۔ انہوں نے یہاں دارالترجمہ میں ملازمت کی تھی اور جب ان پر شاہی عتاب نازل ہوا تھا تو وہ "ریاست بدر" کر دئے گئے تھے۔ حیدرآباد سے چلے جانے کے بعد اُنہیں حیدرآباد کی یاد بہت ستاتی رہی۔ اُنہوں نے متعدد بار حیدرآباد میں اپنے داخلے پر امتناع برخاست کروانے اور حیدرآباد آنے کی کوشش کی تھی، لیکن سابق ریاست حیدرآباد کے وجود تک وہ اپنی کوششوں میں کامیاب نہ ہو سکے تھے۔

یہ مضمون جوشؔ ملیح آبادی کی دارالترجمہ میں ملازمت، اُن کے ریاست حیدرآباد سے اخراج اور اُن کی دوبارہ حیدرآباد آنے کی کوششوں کا احاطہ کرتا ہے جو آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکائیوز اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ذخائر میں جوشؔ سے متعلق ریکارڈ پر مبنی ہے۔ دارالترجمہ کی ملازمت اور ریاست حیدرآباد سے اخراج سے متعلق جوشؔ کی خود نوشت سوانح "یادوں کی برات" میں جو بیانات موجود ہیں، اُن کا میں نے آرکائیوز کے ریکارڈز کی روشنی میں جائزہ لے کر حقائق کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ جوشؔ نے اپنی سوانح میں دوبارہ حیدرآباد آنے کی اپنی کوششوں کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے۔ مضمون کا یہ حصہ مکمل طور پر آرکائیوز کے ریکارڈز سے اخذ کردہ مواد کی بنیاد پر قلمبند کیا گیا ہے۔

جوشؔ ملیح آبادی نے حیدرآباد کے اس شہرۂ آفاق دارالترجمہ میں نو سال سات ماہ تک ذمہ دارانہ خدمات انجام دی تھیں جو ملک میں پہلی بار ایک ہندوستانی زبان اردو کو اعلیٰ ترین جامعاتی سطح پر ذریعۂ تعلیم بنانے کے بعد ترجمہ اور اصطلاحات کی ٹکسال کی حیثیت سے وجود میں آیا تھا۔ جوشؔ کی اس ملازمت کے بارے میں جو کچھ بھی شائع ہوا، اس سے برائے نام معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ کسی نے جوشؔ کی حیدرآباد کی ملازمت کے بارے میں یہ نہیں لکھا ہے کہ وہ کس تاریخ کو دارالترجمہ میں مترجم کی حیثیت سے رجوع ہوئے تھے۔ کتنی مدت تک وہ اس عہدہ پر کام کرتے رہے۔ ناظر ادبی کے عہدہ پر اُنہیں کب ترقی ملی۔ اُن کی مدتِ ملازمت ٹھیک ٹھیک کتنی تھی اور کس تاریخ کو عتابِ شاہی کے باعث اُنہوں نے حیدرآباد چھوڑا تھا۔ اس تعلق سے جو بھی معلومات ملتی ہیں اُن کا ماخذ جوشؔ کی خود نوشت سوانح حیات "یادوں کی برات" ہے۔ آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکائیوز اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں اس بارے میں کافی مواد موجود ہے۔ اس مواد کی چھان بین اور تحقیق کے بعد جوشؔ کی کہی ہوئی باتوں کی توثیق، توضیح اور تردید کی جا سکتی ہے۔

جوشؔ کی حیدرآباد کی ملازمت کے بارے میں لکھنے سے قبل اُن کے حیدرآباد آنے کے اسباب اور یہاں حصولِ ملازمت کے لئے ابتدائی کوششوں کو پس منظر کے طور پر بیان کرنا ضروری ہے۔ اس تعلق سے جوشؔ اپنی سوانح حیات میں ۱۹۲۲ء کے ایک خواب کا تذکرہ کرتے ہیں۔ اس خواب میں حضور اکرمؐ نے نظام دکن (سابق ریاست حیدرآباد کے آخری حکمران آصف سابع نواب میر عثمان علی خاں) کی جانب اشارہ کرتے ہوئے جوشؔ سے ارشاد فرمایا تھا کہ تم کو دس برس تک اُن کے زیرِ سایہ رہنا ہے۔ اس خواب کی تفصیلات سن کر بیگم جوشؔ حیدرآباد جانے کے لئے مصر ہو گئی تھیں۔ جوشؔ مزید لکھتے ہیں کہ دکن کا سفر اُن کے لئے خالی ایک معاشی مسئلہ ہی نہیں تھا بلکہ ان کی ایک روحانی گتھی بھی ایسی تھی جو حیدرآباد گئے بغیر کھل ہی نہیں سکتی تھی۔ ابتدا میں جوشؔ کو یہ اندیشہ تھا کہ یونیورسٹی کی کوئی اعلیٰ ڈگری اُن کے پاس نہ ہونے کی وجہ سے حیدرآباد میں اُنہیں کوئی اہمیت نہیں دی جائے گی۔ ایک اور اندیشہ یہ بھی تھا کہ شاید اُن کا مزاج ملازمت کی ذلتیں برداشت نہیں کر سکے گا۔ چنانچہ تھی احباب اور اقربا نے جو اسی بنا پر اُنہیں مشورہ دیا تھا کہ وہ حیدرآباد جانے کے ارادے کو ترک کر دیں۔ لیکن جوشؔ نے حالات کے تقاضوں اور بیوی کے اصرار پر سفرِ حیدرآباد کے لئے

اے پی۔ اسٹیٹ ریکارڈس آفس، سینٹرل آرکائیوز، تارناکا، حیدرآباد

اپنے آپ کو تیار کرلیا اور وہ مہاراجہ سرکشن پرشاد کے نام علامہ اقبال، مولانا عبدالماجد دریابادی، اکبر الٰہ آبادی اور مولانا سلیمان ندوی کے سفارشی خطوط لے کر ۱۹۲۴ء کے اوائل میں حیدر آباد پہنچے۔ حیدر آباد میں جب جوش مہاراجہ سرکشن پرشاد سے ملے تو مہاراجہ نے کہا کہ وہ آصف سابع کے معتوب ہو چکے ہیں اور اگر جوش اُن کے معتوب ہونے سے پہلے حیدر آباد آتے تو پہلے ہی روز اُن کا انتظام ہو جاتا تاہم مہاراجہ نے تین صفحات پر مشتمل ایک سفارشی خط فینانس منسٹر سر اکبر حیدری کے نام لکھ کر جوش کے حوالے کیا اور اسی وقت فون پر اکبر حیدری سے اس سلسلے میں بات بھی کی۔ مہاراجہ کی ہدایت کے مطابق جوش سر راس مسعود کے ساتھ اکبر حیدری سے ملے، لیکن دوسری ملاقات میں جب اکبر حیدری نے اُنھیں انگریزی حکومت سے سر کا خطاب ملنے پر تہنیتی قطعہ کہنے کی فرمائش کی تو جوش کے باغیانہ مزاج کو یہ بات گوارا نہ ہوئی۔ جوش نے اس فرمائش کے جواب میں اپنے ردِّ عمل کا اظہار ایک نہایت سخت جملے سے کیا اور اہم وسیلے سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ جب یہ واقعہ مہدی یار جنگ کو معلوم ہوا تو وہ جوش کو اپنے والد محترم عماد الملک کے پاس لے گئے۔ جوش کا تعارف کروانے کے بعد ان سے کلام سنانے کی فرمائش کی جس پر جوش نے اپنے ایک مسدس کے چند بند سنائے۔ عماد الملک جوش کے کلام کی روانی اور معانی سے متاثر ہوئے اور انہوں نے فوراً پورے ایک صفحے کا خط جوش کے بارے میں لکھ دیا اور مہدی یار جنگ سے کہا کہ یہ خط سر امین جنگ کے حوالے کر کے کہنا کہ اسے آصف سابع کے روبرو پیش کریں۔

جوش کے بارے میں جو پہلا فرمان مورخہ ۲۸ر شوال ۱۳۴۲ھ مطابق ۲ر جون ۱۹۲۴ء آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکائیوز میں دستیاب ہے۔ وہ عماد الملک کے سفارشی معروضہ پر جاری ہوا تھا۔ چونکہ عماد الملک نے اپنے سفارشی معروضہ میں صرف جوش کی شاعری کی خصوصیات اور خوبیاں بیان کی تھیں اور ان کے تقرر کے لئے کسی مخصوص جائداد کی نشاندہی نہیں کی تھی۔ اس لئے اس فرمان میں جوش کا عندیہ دریافت کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی پوچھا گیا تھا کہ کیا جوش کو عثمانیہ یونیورسٹی میں کوئی جگہ مل سکتی ہے۔ یہ فرمان اور عماد الملک کا سفارشی معروضہ آندھرا پردیش آرکائیوز کی ایک مسل (فائل) میں موجود ہے۔

اکبر حیدری سے دوسری ملاقات کے بعد جوش یہ سمجھنے لگے تھے کہ نہ صرف اکبر حیدری اور سر راس مسعود ان کے مخالف ہو گئے تھے بلکہ ان حضرات کے طرفدار اور پرستار بھی اُن کے بدخواہ ہو گئے تھے۔ ان کا یہ گمان صحیح بھی ہو سکتا ہے، لیکن متذکرہ مسل میں عماد الملک کے معروضے کے علاوہ انگریزی میں اکبر حیدری کا سفارشی خط موجود ہے اور فرمان مورخہ ۲۸ر شوال ۱۳۴۲ ہجری میں بھی اس خط کا حوالہ موجود ہے۔

دارالترجمہ میں تقرر کے سلسلے میں ابتدائی کارروائی کی جو تفصیل جوش نے بیان کی ہے، آرکائیوز کی ریکارڈ کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ تفصیل صحیح نہیں ہے۔ طوالت کے خوف سے بیانات کے اختلاف پر بحث کو شریکِ مضمون نہیں کیا جا رہا ہے۔

جوش اپنے تقرر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ مولوی عنایت اللہ ناظم دارالترجمہ کے ذریعے اُنھیں اطلاع ملی کہ آصف سابع نے انگریزی ادب کے مترجم کی حیثیت سے ان کا تقرر کر دیا ہے۔ اس کے بارے میں جوش نے لکھا ہے کہ فرمان میں یہ لکھا ہوا تھا کہ ہر چند اس نئے عہدے کے قیام کا کوئی جواز نہیں ہے۔ لیکن سر دست جوش کا مترجم انگریزی ادب کے عہدے پر فوراً تقرر کیا جائے اور جب ان کو ترقی مل جائے تو اس عہدے کو توڑ دیا جائے۔ آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکائیوز میں دستیاب اصل فرمان مورخہ ۲۸ جمادی الاوّل ۱۳۴۳ھ م ۲۶ر دسمبر ۱۹۲۴ء کی تحریر یہ ہے۔ "جوش ملیح آبادی کو انگلش لٹریچر کے کتب کا ترجمہ کرنے کے لئے امتحاناً دو سال کے لئے ڈھائی سو روپے ماہوار کی جگہ دی جائے۔ مگر پہلے اُن سے استمزاج کیا جائے کہ آیا وہ اس آفر کو منظور کرتے ہیں یا نہیں اور اُن سے یہ بھی کہہ دیا جائے کہ اگر ان کو یہ منظور نہیں ہے تو اس سے بڑھ کر اُن کے حق میں کچھ نہیں ہو سکتا۔ کارروائی داخل دفتر کر دی جائے گی۔"

آرکائیوز کے ریکارڈ کے مطابق جوش نے یہ خدمت قبول کر لی۔ اور وہ ۲۹ر بہمن ۱۳۳۴ ف م یکم جنوری ۱۹۲۵ء کو رجوع ہو گئے اور اس خدمت پر ۸ر آبان ۱۳۳۵ف م ۱۳ر ستمبر ۱۹۲۶ء تک برسرِ کار رہے۔

حیدر نظم طباطبائی توسیع ملازمت ختم ہونے پر ناظر ادبی کی خدمت سے علیحدہ ہوئے اور اس جائداد پر تقرر کے لئے تین اشخاص ۱۔ آغا محمد حسین ۲ر شبیر حسین خاں جوش اور ۳ر محمد علی شاہ نے درخواستیں دی تھیں۔ ناظم دارالترجمہ نے اوپر کے پہلے دو ناموں کے علاوہ دارالترجمہ کے دو اراکین مرزا ہادی رسوا اور عبداللہ عمادی کے ناموں کی بھی پرزور سفارش کی تھی۔ لیکن نواب اکبر یار جنگ، معتمد عدالت، کوتوالی و امورِ عامہ نے ان تمام امیدواروں میں سے جوش کی پرزور سفارش کرتے ہوئے یہ لکھا تھا کہ اس خدمت پر جوش کے تقرر سے سرکاری بچت بھی ہو گی یعنی ان کی موجودہ جائداد تخفیف کی جا سکتی ہے۔ اراکین مجلس اعلیٰ جامعہ عثمانیہ، سر نظامت جنگ، احمد نواز جنگ، ضیاء یار جنگ، مرزا یار جنگ بہادر، مسعود جنگ بہادر اور محمد عبدالرحمٰن خاں صدر کلیہ نے اکبر یار جنگ کی رائے سے اتفاق کیا تھا جس پر فرمان مورخہ ۸ر ربیع الاول ۱۳۴۵ مطابق ۹ دسمبر ۱۹۲۶ء جاری ہوا۔ اس فرمان کے ذریعے دارالترجمہ کے ناظر ادبی کی جائداد پر ایک سال کے لئے امتحاناً جوش کا تقرر بہ ماہوار ۵۰۰ روپے کیا گیا اور ان کی مترجمی کی جائداد تخفیف کر دی گئی۔ جوش نے ۹ر ربیع الاوّل ۱۳۴۵ھ مطابق ۱۴ر ستمبر ۱۹۲۶ء کو اس خدمت کا جائزہ لیا۔ ان کی مدتِ ملازمت ختم ہونے پر توسیع کے فرمان جاری ہوئے یہاں تک کہ وہ آصف سابع کے معتوب ہوئے اور اُنہیں ریاست چھوڑنے کا حکم دیا گیا۔ حیدر آباد سے وہ ۱۷ر جمادی الاوّل ۱۳۵۲ھ م ۱۲ر ہر ۱۳۴۳م ۲۸ر اگست ۱۹۳۴ء کو واپس ہوئے اور اس تاریخ تک دارالترجمہ میں مترجم اور ناظر ادبی کی حیثیت سے اُن کی مدتِ ملازمت ۹ر سال، ۷ر ماہ ۲۴ یوم ہوتی ہے۔

حیدر آباد دکن، اُس کی تہذیب اور اُس کی فضاؤں سے جوش کی چاہت بے پناہ محبت کا درجہ اختیار کر چکی تھی۔ اُن کی شاعری اور دیگر تحریروں میں اس کی متعدد شہادتیں ملتی ہیں۔ حیدر آباد سے گہرے لگاؤ کے باوجود جوش کے لئے حالات ایسے پیدا ہو گئے تھے کہ اُنہیں ریاست بدر ہو کر حیدر آباد

سے نکلنا پڑا تھا۔ حیدرآباد سے ان کے اخراج کے حقیقی اسباب کیا تھے۔ اس سلسلے میں اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے یا خود جوش نے لکھا ہے اس سے ساری گرہیں نہیں کھلتیں اور یہ مسئلہ ہنوز حل طلب ہے۔

جوش نے اپنی خود نوشت سوانح میں حیدرآباد سے اخراج کے سلسلے میں تفصیلات بیان کرتے ہوئے آصف سابع کے چند فرامین اور احکام کا بھی حوالہ دیا ہے۔ ان حوالوں کا آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکائیوز میں محفوظ اصل ریکارڈز کی روشنی میں جائزہ لیا گیا ہے تاکہ مستند ریکارڈز کی بنیاد پر جوش کے اخراج کے اصل واقعات اور اہم امور پر پڑے ہوئے دبیز پردے ہٹائے جاسکیں۔ جوش نے "یادوں کی برات" میں اپنے اخراج کا اصل سبب بیان کرتے ہوئے اس کی تفصیلات یوں بیان کی ہیں کہ جس روز انہوں نے اپنی نظم "غلط بخشی" جاگیرداروں اور وزیروں کے اجتماع میں سنائی تھی۔ اس کے دوسرے روز ہی یہ نظم آصف سابع تک پہنچ گئی۔ کیوں کہ اس اجتماع میں خفیہ پولیس کے لوگ بھی موجود تھے۔ آصف سابع نے اس نظم پر اپنا کوئی سخت ردِ عمل ظاہر کرنے کی بجائے بڑے خفیہ انداز میں آغا حاتی، نائب کوتوال کو جوش کے پاس بھیجا۔ جنہوں نے جوش سے کہا کہ آصف سابع نے فرمایا ہے کہ اگر جوش آصف سابع سے معافی طلب کر لیں اور اس بات کا عہد کر لیں کہ وہ آئندہ ان کے خلاف کچھ نہیں کہیں گے تو آصف سابع تہہ دل سے انہیں معاف کر دیں گے۔ آغا حاتی نے جوش کو آصف سابع کے پاس چلنے کے لئے اصرار کے ساتھ کہا، لیکن جوش نے کہہ دیا کہ وہ معافی مانگنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ بیگم جوش کے سخت اصرار کے باوجود جوش ٹس سے مس نہیں ہوئے اور پھر انہوں نے اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ آصف سابع کی خدمت میں جب یہ استعفیٰ پیش ہوا تو آصف سابع کے غصے کو بھانپ کر ان کے معتمد پیشی نے جوش کا استعفیٰ پھاڑ کر پرزے پرزے کر دیا اور اسی وقت آصف سابع نے فرمان لکھوایا کہ جوش ملیح آبادی کو ممالک محروسہ سے خارج کیا جاتا ہے۔ وہ پندرہ دن کے اندر اندر روانہ ہو جائیں اور تاحکم ثانی یہاں قدم نہ رکھیں۔ یہ فرمان لے کر آغا حاتی جوش کے پاس گئے جوش کو فرمان بتا کر کہا کہ سرکار کسی پر عتاب فرماتے ہیں تو اسے چوبیس گھنٹے کے اندر نکال دیتے ہیں، ......

.... مگر آپ کو ۲۴ گھنٹے کے بجائے پورے پندرہ دن کی مہلت دی گئی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ آپ صورت حال کو ٹھنڈے دل سے سمجھ کر معافی مانگ لیں اور یہ فرمان واپس لے لیا جائے اور اس میں حکم ثانی لکھ کر آپ کی واپسی کو ناممکن نہیں بنایا گیا ہے۔ اگر آپ میرے ساتھ چل کر معافی مانگ لیں تو یہ فرمان یقیناً منسوخ کر دیا جائے گا۔ لیکن جوش معافی نہ مانگنے کے فیصلے پر قائم رہے۔

مذکورہ بالا فرمان جاری ہونے سے قبل آغا حاتی، نائب کوتوال نے آصف سابع کا جو زبانی پیام جوش تک پہنچایا تھا، اس کے بارے میں تو کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ مگر فرمان کے جن دو نکات کی آغا حاتی نے وضاحت کی تھی، اس پر کسی قسم کے تبصرے کی بجائے آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکائیوز میں محفوظ اصل احکام مورخہ ۲ جمادی الاول ۱۳۵۳ھ م ۱۳ اگست ۱۹۳۴ء کی تحریر کو درج کرنا بہتر ہوگا۔ اس شخص کو اگرچہ بختہ متنبہ کیا گیا تھا کہ وہ اپنے اعمال کو درست کرے ورنہ اس کی علیحدگی عمل میں آئے گی مگر افسوس ہے کہ اس کا کچھ نتیجہ اچھا نہیں نکلا بلکہ سابقہ حالات ایک حد تک ابھی باقی ہیں۔ لہٰذا مناسب ہوگا کہ جس مدت کے لئے وہ یہاں ملازم تھا اس حساب سے کچھ ماہوار بطور رعایت اس کے نام جاری کر کے (جس کی مقدار سے پہلے یہاں اطلاع دی جائے) اس کو کہہ دیا جائے کہ وہ دو ہفتوں میں یہاں سے خاموشی سے وطن چلا جائے اور بغیر اجازت پھر یہاں آنے کا قصد نہ کرے۔"

اپنے اخراج کے بارے میں جوش آگے لکھتے ہیں کہ وہ حیدرآباد چھوڑنا طے کر چکے تھے، مگر اپنے افرادِ خاندان، عزیز و اقارب اور نوکروں کو ساتھ لے جانے کے لئے ان کے پاس درکار رقم موجود نہیں تھی۔ ابتدائی دس گیارہ روز یوں ہی سوچ بچار میں گزر گئے اور پیسوں کا کوئی بندوبست نہ ہو سکا۔ بالآخر وہ اپنے دوست حکیم آزاد انصاری کے مشورے پر قرض کی درخواست لئے سر اکبر حیدری کے پاس گئے جنہوں نے قرض منظور کر دیا اور جوش کو دوسرے روز پانچ ہزار روپے مل گئے۔ جوش کے اس بیان کی سرکاری ریکارڈز کی روشنی میں توثیق ضرور ہوتی ہے، لیکن رقم کی مقدار کے بارے میں جوش نے غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ انہوں نے غالباً اپنی آن بان اور مقام و مرتبہ کو ظاہر کرنے کے لئے یہ بیان کیا کہ انہیں پانچ ہزار روپے بطور قرض ادا کئے گئے تھے جب کہ محکمہ تعلیمات کی عرض داشت مورخہ ۲۸ شعبان ۱۳۵۳ھ م ۶ دسمبر ۱۹۳۴ء کی رو سے جوش کو حیدرآباد سے روانگی کے وقت ایک ہزار روپے کلدار بطور مبادلہ دئے گئے تھے۔

جوش اس سلسلے میں مزید لکھتے ہیں کہ ان کی حیدرآباد سے روانگی کے موقع پر نواب نظامت جنگ، آصف سابع کا جو فرمان لے کر ریلوے اسٹیشن آئے تھے۔ وہ فرمان انہیں حرف بحرف یاد نہیں رہا، لیکن اس کا مفہوم یہ تھا "جوش ملیح آبادی آج ہندوستان جارہے ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ وہ ......

.... جا کر اپنے قلم کو ہمارے خلاف استعمال نہ کریں اور معافی پر تیار ہوں تو ہنوز گنجائش باقی ہے۔" مگر جوش ان احکام کو نظرانداز کرتے ہوئے حیدرآباد سے روانہ ہو گئے۔ جوش کا یہ بیان سرکاری ریکارڈز کی روشنی میں سراسر غلط ہے۔ آصف سابع کے اصل احکام مورخہ ۲۱ جمادی الاول ۱۳۵۳ھ م ۲۷ اگست ۱۹۳۴ء میں جوش سے معافی مانگنے کے لئے نہیں کہا گیا ہے اور احکام کا لہجہ بھی کافی درشت ہے۔ احکام کی حسب ذیل تحریر سے قارئین خود اندازہ کر سکتے ہیں:

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ جوش ملیح آبادی کل یوم سہ شنبہ یہاں سے اپنے وطن چلا جارہا ہے۔ پس اس کو بتوسط صیغہ متعلقہ حکم سنا یا جائے کہ جو کچھ وظیفہ (از روئے سوال) اس کو ملے گا تو وہ اس شرط پر کہ وہ بیرون ممالک محروسہ سرکار عالی خاموشی سے زندگی بسر کرے یعنی وہاں رہ کر اگر یہ پھر اپنے خبث باطن کا اظہار کرے گا (جیسا کہ اس کی عادت رہی ہے) تو بعد تصدیق یہ وظیفہ بھی پاداشتاً مسدود ہو جائے گا وہ بس۔"

جوش کی بیان کردہ تفصیلات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں دارالترجمہ کی ملازمت سے ہاتھ دھونا، حیدرآباد چھوڑنا، اور غیر یقینی مستقبل کی تاریک راہوں میں بھٹکنا گوارا تھا، لیکن معافی مانگنا ہرگز گوارا نہ تھا۔ انہوں نے زور اس بات پر صرف کیا ہے کہ انہیں معافی مانگنے کے لئے مختلف طریقوں سے کہا گیا مگر وہ اپنی انا اور خودداری کو ٹھیس پہنچاتے ہوئے معافی مانگنے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ انہوں نے یہ تذکرہ بھی کہیں نہیں کیا ہے کہ حیدرآباد کے قیام کے دوران انہیں کبھی آصف سابع سے معافی مانگنا پڑا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اخراج کے واقعہ سے صرف دس ماہ قبل ایک موقع پر آصف سابع نے جوش سے جواب طلب کیا تھا جس پر جوش نے معافی نامہ داخل کیا تھا۔ معافی نامہ داخل کرنے کے باوجود جوش کے خلاف بڑا سخت فرمان صادر ہوا تھا۔ اس واقعہ کے بارے میں جوش کی بیان کردہ تفصیلات کچھ یوں ہیں کہ آصف سابع کی ایک سالگرہ کے موقع پر ایک رسالے کے مدیر نے ان کی ایک بہاریہ نظم قصیدہ بناکر شائع کردی تھی جس میں سالگرہ کی جانب کوئی ادنیٰ سا اشارہ یا آصف سابع کی مدح میں کوئی شعر نہ تھا، مگر اس کے حسب ذیل مقطع پر شاہی عتاب نازل ہوگیا ؎

کبھی جوش کے جوش کی مدح فرما
کبھی گل رخوں کی ثنا خوانیاں کر

دوسرے ہی روز فرمان شائع کیا گیا کہ معلوم ہوتا ہے "یہ قصیدہ جوش نے کسی خاص وقت (ہنگام بادہ نوشی) میں کہا ہے۔ ان کو چاہیئے کہ وہ ایسے اوقات میں سرکار کو یاد نہ کریں اگر وہ آئندہ ایسا کریں گے تو اچھا نہیں ہوگا۔" جوش نے آصف سابع کے احکام کی جو تحریر درج کی ہے وہ سراسر غیر درست ہے اس کے علاوہ انہوں نے دیگر تفصیلات بھی بیان کرنے سے احتراز کیا ہے۔ جوش نے جس مقطع کا حوالہ دیا ہے واقعی اس مقطع پر عتاب شاہی نازل ہوا تھا لیکن اس موقع پر آصف سابع کے جو احکام مورخہ ۱۹ رجب ۱۳۵۲ھ م ۵ نومبر ۱۹۳۳ء جاری ہوئے تھے وہ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:

"جوش ملیح آبادی سے جواب لیا جائے کہ انہوں نے اخبار "منشور" کے سالگرہ نمبر میں جو نظم لکھی ہے جس کا عنوان "نغمۂ جشن" قرار دیا ہے۔ اس کے مقطع میں جو الفاظ لکھے گئے ہیں وہ سراسر رئیس کی سوء ادبی پر محمول ہوتے ہیں۔ پس اُن کو چاہیے کہ وہ آئندہ سے ایسی حرکات سے باز رہیں ورنہ اُن سے سخت باز پرس کی جائے گی۔ جس صورت میں بار دیگر ایسی غلطی ہوگی وہ بس!"

ان احکام کی تعمیل میں جوش نے جو معروضہ یا معافی نامہ مورخہ ۲۷ رجب ۱۳۵۲ھ م ۱۲ نومبر ۱۹۳۳ء آصف سابع کی خدمت میں پیش کیا تھا وہ آرکائیوز کی ایک مسل میں موجود ہے۔ یہ معافی نامہ تین فل اسکیپ سائز کے کاغذات پر مشتمل ہے۔ جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ فدوی ایک شریف خاندان کا رکن ہے اور شریف اپنے محسنوں پر جان نثار کردیا کرتے ہیں۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ فدوی اپنے اتنے بڑے عظیم المرتبت محسنِ اعظم کی شان میں سوءِ ادب

کا تصور بھی اپنے ذہن میں لاتا جو محسن ہونے کے علاوہ اس کی قوم کا قدردان بھی ہے۔" جوش اپنے معافی نامہ میں آگے لکھتے ہیں کہ صبح دکن کے سالگرہ نمبر کے لئے تہنیتی نظم دینے کے بعد مدیران نظام گزٹ اور منشور نے ان سے کلام دینے کے لئے اصرار کیا۔ اسی اثنا میں وہ سخت بیمار پڑ گئے اور ایک دن بخار کی کیفیت میں اپنی ایک بہاریہ غزل مدیر منشور کو دیدی جس میں انہوں نے محض اپنی ہی ذات سے خطاب کیا ہے۔ بخار کی شدت کے باعث ان سے جو غلطی سرزد ہوئی۔ اس کا اعتراف کرتے ہوئے وہ بہ کمال ادب معافی کے خواستگار اور آصف سابع سے عفو و درگزر کرنے کی درخواست کرتے ہیں۔ جوش اپنے معافی نامے میں ایک جگہ لکھتے ہیں "فدوی کو بے پایاں پشیمانی اور ملال کے ساتھ اپنی اس غلطی کا اعتراف ہے کہ اس نے اس غزل پر "بہ تقریب سالگرہ" کی سرخی کیوں قائم کردی۔" مگر "یادوں کی برات" میں جوش کا یہ کہنا کہ اس میں نظام سابع کی سالگرہ کی جانب کوئی ادنیٰ سا اشارہ موجود نہ تھا، قطعی درست نہیں ہے۔ معافی نامہ داخل کرنے کے باوجود جو فرمان ۱۸ شعبان ۱۳۵۲ھ م ۷ دسمبر ۱۹۳۳ء کو صادر ہوا تھا اُس کا متن درج ذیل ہے:

"اُس نے اپنی دیدہ و دانستہ غلطی کو جو ایک عذر لنگ کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وہ ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ اس سے درگزر کیا جائے تاہم میں اس شرط کے ساتھ معافی دیتا ہوں کہ آئندہ اگر پھر اس سے ایسی غلطی سرزد ہوئی تو ۲۴ گھنٹے کے اندر اس کو خدمت سے علیحدہ کردیا جائے گا۔ کیونکہ مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ اس کی پرائیویٹ لائف ہرگز اطمینان کے قابل نہیں ہے اور ایسے کیرکٹر کے اشخاص کو سرکاری محکمہ میں جگہ دینا گویا محکمہ کی تذلیل ہے۔ یہی جواب اُس کو بتوسط صیغہ متعلقہ دے کر کارروائی داخل دفتر کردی جائے۔"

مذکورہ بالا فرمان میں جوش کو مشروط طور پر معاف اور آئندہ کے لئے سخت طور پر متنبہ کیا گیا تھا۔ اس واقعہ کے بعد دس ماہ کے اندر ہی جوش پر پھر شاہی عتاب نازل ہوا۔ اور وہ ریاست بدر کردیے گئے جس کی تفصیلات اوپر بیان کی جاچکی ہیں۔

جوش دارالترجمہ میں ۹ سال، ۷ ماہ ۲۴ یوم کی ملازمت انجام دینے کے بعد حیدرآباد سے واپس ہوگئے۔ ان کے وظیفے کے تعین کی نسبت ایک یادداشت مورخہ ۲۸ شعبان ۱۳۵۳ھ م ۶ دسمبر ۱۹۳۴ء صیغۂ تعلیمات کی جانب سے آصف سابع کی خدمت میں پیش کی گئی جس پر فرمان مورخہ ۱۷ شوال ۱۳۵۳ھ م ۲۳ جنوری ۱۹۳۵ء جاری ہوا۔ جس کے ذریعے جوش کے نام ایک سو روپے کلدار وظیفہ جاری کئے جانے کے احکام صادر ہوئے۔ وظیفہ کے اجراء کے احکام کے ساتھ یہ شرط بھی عائد کی گئی کہ آئندہ کسی قسم کی نازیبا حرکت کرنے پر یہ وظیفہ مسدود کردیا جائے گا۔

جو حضرات جوش کے قیام حیدرآباد کے حالات سے پوری طرح واقف نہیں ہیں وہ ٹھیک ٹھیک اندازہ نہیں کرسکتے کہ ریاست حیدرآباد کے اس دور کے حالات سے مطابقت پیدا کرنا کتنا دشوار تھا۔ جوش کے تعلق ●

سے آصف سابع کے فرامین میں درج الفاظ اور اُن کے لب و لہجے سے کوئی غلط تاثر نہیں لینا چاہیے کہ جوش کا مرتبہ بلند نہیں تھا کیوں کہ یہ لہجہ اور یہ زبان فرمان (شاہی احکام) کی سرکاری و قانونی زبان تھی۔ آصف سابع اگر جوش کے بلند مرتبے کے معترف نہ ہوتے تو اُنہیں ملازمت فراہم کرنے میں دلچسپی نہ لیتے۔ اور اندرون دو سال ترقی دے کر حمید نظم طباطبائی جیسے جید عالم و دانشور کی جگہ اُنہیں مامور نہ کرتے۔ خفگی و ناراضگی کی انتہا اور عتاب کے باوجود "ریاست بدر" کیے جانے کو ۱۹۳۵ء میں ایک سو روپے کلدار وظیفہ کی منظوری دینا جوش کے مقام و مرتبہ کے اعتراف کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیوں کہ اُس زمانے میں یہ رقم آج کے ہزاروں روپیوں پر بھاری تھی۔

جوش کو آصف سابع کے احکام کی تعمیل میں حیدرآباد کو چھوڑنا پڑا تھا۔ اس سے قبل اگرچہ انہوں نے دس سال ہی حیدرآباد میں گزارے تھے۔ لیکن حیدرآباد کی یادیں کبھی بھی ان کے دماغ سے محو نہ ہو سکی تھیں۔ جوش کی سوانح "یادوں کی برات" میں آصف سابع کے دربار کے چند واقعات کے علاوہ دارالترجمہ کا تذکرہ بھی شامل ہے۔ جس میں اُنہوں نے اپنی اور دارالترجمہ کے دیگر مترجمین کی سرگرمیوں کا ذکر کیا ہے۔ اُنہوں نے لکھا ہے کہ دارالترجمہ دفتر کم اور دارالتفریح زیادہ تھا مگر ساتھ ہی ساتھ اُنہوں نے اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے کہ دارالترجمہ سے وابستگی نے اُنہیں غیر معمولی علمی فائدہ پہنچایا تھا۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ حیدرآباد نے ان کی شاعری کو آب و رنگ بخشا اور علم و فکر کا راستہ دکھایا۔ جوش نے حیدرآباد میں گزارے ہوئے دنوں، یادگار جھلکیوں، شاعروں، رنگین شاموں اور احباب کی پرانی صحبتوں کو بڑے متاثر کن انداز میں یاد کیا ہے۔ اس دور کے حیدرآباد کے بارے میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> "ہائے کیا بیان کروں کہ اُس وقت میرا حیدرآباد کیا چیز تھا
> اتفاق اور اس پر دولت کی فراوانی۔ ہر طرف ایک چہل پہل
> تھی۔ امراء کے دروازوں پر صبح و شام نوبت بجا کرتی
> تھی۔ آئے دن جلسے، مجرے، دعوتیں اور مشاعرے ہوتے
> تھے۔"

اپنی سوانح میں "میرے چند خاص احباب" کے عنوان کے تحت بھی جوش نے حیدرآباد کے بعض واقعات بیان کیے ہیں جن سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ اُنہیں حیدرآباد سے گہری وابستگی تھی۔ حیدرآباد سے جوش کی اس گہری وابستگی اور لگاؤ کا نتیجہ تھا کہ حیدرآباد سے اخراج عمل میں آنے کے بعد اُنہوں نے دوبارہ حیدرآباد آنے اور اپنے داخلے پر امتناع کی برخواستگی کے لیے کوشش کی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنی ان کوششوں میں سابق ریاست حیدرآباد کے خاتمے تک کامیاب نہ ہو سکے تھے۔ جوش نے اپنی کتاب میں اپنی ان کوششوں اور خواہشوں کا ذکر نہیں کیا ہے جب کہ آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکائیوز کے ریکارڈز سے جن میں جوش کے مکتوب بھی شامل ہیں اس بات کا واضح اور قطعی ثبوت ملتا ہے۔

جوش کے مکتوب مورخہ ۱۹ر نومبر ۱۹۴۷ء (جس کا متن آگے بیان ہوگا) سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ جوش نے حیدرآباد سے اخراج کے بعد کئی بار یہاں کے ارباب اقتدار سے حیدرآباد میں داخلے کی اجازت کے سلسلے میں خط و کتابت کی تھی۔

ممالک محروسہ سرکار عالی میں جوش کو داخلہ دینے کی اجازت کے لیے جو پہلی سرکاری کارروائی ہوئی تھی اس کی تفصیلات یہ ہیں۔ یقیناً جوش کے مکتوب یا درخواست پر ہی کارروائی کا آغاز ہوا ہوگا۔ معتمد تعلیمات نے اس بارے میں اپنے ایک نوٹ میں لکھا کہ شبیر حسین جوش ملیح آبادی کو ایک خطاب عطیۂ شاہانہ نصیب ہوا تھا، لیکن بعد ازاں بعض عام وجوہ کی بنا پر وہ خارج البلد کیے گئے۔ اور نوکری سے بھی محروم ہوئے۔ اب اُنہیں دوبارہ سررشتہ میں لینے کا تو سوال ہی نہیں اُٹھتا۔ البتہ بر رائے سابقہ احکام شاہانہ وہ اب ممالک محروسہ سرکار عالی میں آ بھی نہیں سکتے جسے اتنے زمانے کے بعد قائم رکھنا اب شاید ضروری تصور نہ فرمایا جائے۔ معتمد تعلیمات کے نوٹ پر صدرالمہام تعلیمات نے جوش کو صرف ممالک محروسہ سرکار عالی میں داخلے کی اجازت دینے سے اتفاق کیا۔ جب یہ کارروائی باب حکومت (کابینہ) کے اجلاس منعقدہ ۲۷ر دے ۱۳۵۳ ف م ۳ر دسمبر ۱۹۴۳ء میں پیش ہوئی تو یہ قرارداد منظور ہوئی "شبیر حسین خاں جوش ملیح آبادی کے متعلق بارگاہ خسروی میں سفارش کی جائے کہ اگر وہ صرف ممالک محروسہ سرکار عالی میں داخلے کی حد تک حضور شاہانہ سے سرفراز فرمائے جائیں تو موجب ترحم ہوگا۔ البتہ ان کو ان کی پچھلی روش کی بنا پر کوئی ملازمت نہیں دی جا سکے گی۔" ایک عرض داشت مورخہ ۲ر محرم ۱۳۶۳ھ م ۳ر دسمبر ۱۹۴۳ء میں متذکرہ بالا تمام تفصیلات درج کر کے اُسے آصف سابع کے ملاحظہ اور احکام کے لیے پیش کیا گیا۔ ممالک محروسہ سرکار عالی میں جوش کے داخلے کے لیے عرض داشت میں جو سفارش پیش کی گئی تھی اُسے آصف سابع نے نامنظور کر دیا۔ اس بارے میں آصف سابع کا جو فرمان مورخہ ۲۷ر محرم ۱۳۶۳ھ م ۲۴ر جنوری ۱۹۴۴ء صادر ہوا تھا، وہ حسب ذیل ہے:۔

> "زمانہ پُر آشوب ہے اور اس شخص کا رویہ زمانۂ گزشتہ
> میں کیا تھا وہ بھی روشن ہے لہٰذا سابقہ حکم پر نظر ثانی
> نہیں ہو سکتی۔ یعنی اس کو ممالک محروسہ میں آنے کی
> اجازت نہیں دی جا سکتی۔"

عرض داشت میں کی گئی سفارش کے رد کر دیے جانے اور ان کے خلاف فرمان صادر ہونے کی اطلاع جوش کو مل ہوگی۔ اس لیے اُنہوں نے کچھ انتظار کیا اور تقریباً چار سال کی مدت گزر جانے اور ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد اُنہوں نے پھر ایک بار کوشش کی تھی کہ ممالک محروسہ سرکار عالی میں اُن کے داخلے پر سے امتناع برخاست کر دیا جائے تاکہ وہ دوبارہ حیدرآباد کے ماحول و فضا میں سانس لے سکیں اور اپنے احباب سے مل سکیں۔ چنانچہ اُنہوں نے ایک مکتوب مورخہ ۱۹ر نومبر ۱۹۴۷ء صدر اعظم ریاست حیدرآباد دکن کو لکھا تھا۔ اس مکتوب کا متن حسب ذیل تھا۔

"مکرمی

اس سے قبل بھی متعدد بار عرض کر چکا ہوں اور آج بھی اس خط کے ذریعے عرض کر رہا ہوں کہ حیدرآباد میں میرے داخلے

کے امتناع کو براہ کرم اجازت میں تبدیل کرا کے مجھے اس کا موقع دیجئے کہ وہاں کی اُن گلیوں میں پھر ایک بار گشت کر لوں جہاں میں نے اپنی جوانی کے بہترین ایام صرف کئے۔ اور ان دوستوں سے زندگی کے آخری لمحوں میں پھر ایک بار مل کر دل ٹھنڈا کر لوں جو خوابوں میں میرا تعاقب کرتے ہیں۔

کافر ہوں جو ان مندرجہ بالا باتوں کے علاوہ اور کوئی تمنا رکھتا ہوں۔ ذرا سی بات ہے۔ آپ تحریک کر دیں تو بڑی آسانی سے اس حکم کی تنسیخ ہو سکتی ہے جس نے حیدرآباد کو میرے واسطے شجر ممنوع بنا رکھا ہے۔

خدا کرے کہ آپ بہمہ وجوہ مع الخیر ہوں اور یہ خط آپ کو ایسے موڈ میں ملے کہ اسی وقت آپ میرے حسب مراد کارروائی کا آغاز فرما دیں۔

آپ کا از بادۂ فتنہ نیاز مند

جوشؔ"

درج کا مکتوب ۱۹ر نومبر ۱۹۴۷ء کا تحریر کردہ ہے۔ اس وقت مہدی یار جنگ ریاست حیدرآباد دکن کے منصرم صدر اعظم تھے۔ مہدی یار جنگ جوشؔ کے محسن اور قدردان تھے اور جوشؔ سے اُن کے مراسم دوستانہ تھے۔ یہ وہی مہدی یار جنگ ہیں جن کا تذکرہ اس مضمون کے ابتدائی حصہ میں موجود ہے۔ مہدی یار جنگ نے ہی اپنے والد عماد الملک سے جوشؔ کا تعارف کروایا تھا۔ اور عماد الملک نے جوشؔ کے لئے آصف سابع کے نام سفارشی معروضہ لکھا تھا۔ یہی مہدی یار جنگ، ۱۹۴۷ء میں منصرم صدر اعظم مقرر ہوئے جس کی اطلاع یقیناً جوشؔ کو ملی ہوگی۔ اسی لئے جوشؔ نے حیدرآباد میں داخلے پر امتناع برخاست کرانے کے لئے انہیں مذکورہ بالا خط لکھا تھا۔ جوشؔ کے اس مکتوب پر پیشی صدر اعظم کے دفتر میں، ۲ر نومبر ۱۹۴۷ء کو مسل پر کارروائی کا آغاز ہوا ہی تھا کہ دوسرے روز حیدرآباد میں وزارت تبدیل ہوگئی۔ مہدی یار جنگ ۲۱ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو چھ ماہ کے لئے منصرم صدر اعظم بنائے گئے تھے۔ مگر ۲۸ر نومبر ۱۹۴۷ء کو انٹریم گورنمنٹ کا قیام عمل میں آیا۔ لائق علی صدر اعظم مقرر ہوئے۔ اور مہدی یار جنگ سبکدوش کر دئے گئے۔ (ملاحظہ ہو جریدہ غیر معمولی مورخہ ۲۱ر اکتوبر ۱۹۴۷ء اور مورخہ ۲۸ر نومبر ۱۹۴۷ء) مہدی یار جنگ کے ہٹ جانے سے جوشؔ کی درخواست کو تائید حاصل نہ ہو سکی اور ایک مراسلہ مورخہ ۲ر بہمن ۱۳۵۷ ف م، ۲ر دسمبر ۱۹۴۷ء منجانب معتمد باب حکومت حیدرآباد جوشؔ کو روانہ کیا گیا جس میں اطلاع دی گئی:

"افسوس ہے کہ فرامین خسروی کی روشنی میں دفتر ہذا مزید کارروائی کرنے سے قاصر ہے۔"

متذکرہ بالا مراسلہ موصول ہونے پر جوشؔ نے حسب ذیل خط مورخہ ۲۱ر دسمبر ۱۹۴۷ء مددگار معتمد باب حکومت کے نام لکھا۔

"مراسلہ پہنچا۔ معلوم ہوا کہ فرمان خسروی کی روشنی میں دفتر ہذا مزید کارروائی کرنے سے قاصر ہے۔ چلئے بہت اچھا ہوا۔ انقلاب سے پیشتر حیدرآباد کی سیر میں لطف بھی نہ آتا۔

پیچ و تاب اس قدر اے موج عبث ہے تجھ کو
رول دیو یگا نہ موتی مجھے دریا تیرا

جوشؔ

جوشؔ نے اسی مکتوب میں اپنے دستخط ثبت کرنے کے بعد غالبؔ کا حسب ذیل فارسی شعر بھی تحریر کیا۔

بیا کہ قاعدہ آسمان بگردانیم
قضا ز گردش رطل گراں بگردانیم

چنانچہ جوشؔ نے حیدرآباد آنے کی اپنی دیرینہ خواہش اور آرزو کی تکمیل کے لئے پولیس ایکشن (ستمبر ۱۹۴۸ء) تک انتظار کیا کہ اب وہ انقلاب رونما ہو چکا تھا جس کی جانب شاعر انقلاب نے اپنے مکتوب میں اشارہ کیا تھا۔ حیدرآباد بدر کئے جانے کے احکام بے اثر ہو چکے تھے۔ اور اب حیدرآباد شاعر جوشؔ کا پُر جوش استقبال کرنے کے لئے بے چینی سے منتظر تھا۔

ماخذ:

یہ مضمون آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکائیوز اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے حسب ذیل ریکارڈز سے حاصل کردہ مواد کی بنیاد پر تحریر کیا گیا

1. Instalment No.81, List No.3, S.No.443

مقدمہ طلب رائے نسبت استدعا شبیر حسین جوشؔ

2. Instalment No.80, List No.4, S.No.62

مقدمہ : تقررات دارالترجمہ

3. Instalment No.84, List No.1, S.No.26

مقدمہ : نسبت تنبیہہ جوشؔ ملیح آبادی بنظر سوء ادبی مندرجہ مقطع نظم نعرہ جشن مطبوعہ سالگرہ نمبر اخبار منشور

4. Instalment No.77, List No.1, S.No.1553

مقدمہ : مکتوب حضرت جوشؔ ملیح آبادی نسبت برخواستگی امتناع دوبارہ داخلہ ممالک محروسہ سرکار عالی۔

محبوب الرحمٰن فاروقی

جوشؔ صاحب سرکاری ملازمت میں

(شخصی فائل کی روشنی میں)

("وہ غالباً ۱۹۴۸ء کا دور تھا کہ ترکاری فروخت کرنے کے ارادے کو فسخ کرکے دہلی پہنچا۔ اسٹیشن سے سیدھا پنڈت جی کے پاس گیا اور انہوں نے سردار پٹیل سے ٹیلی فون پر بات کرکے میری ملازمت کی بات پکی کرلی اور یہ وعدہ بھی کرلیا کہ وہ ریاستوں سے میری پنشن بھی مقرر کرا دیں گے اور مجھ کو میاں عظیم حسین صاحب کے پاس بھیج دیا جو اس وقت اطلاعاتِ عامّہ کے سکریٹری تھے۔

میاں عظیم حسین واقعی میاں آدمی نکلے۔ ان کی شرافت سے بے حد متاثر ہوا۔ اثنائے گفتگو میں انہوں نے مجھ سے کہا: "تنخواہ آپ کو صرف گیارہ سو ماہانہ ملے گی۔ آپ اس قلیل تنخواہ میں کیونکر زندگی بسر کر سکیں گے، میں نے کہا میاں صاحب، پنڈت جی نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ کئی ریاستوں سے میری ادبی پنشن مقرر کرا کے اس قلیل تنخواہ کی خانہ پُری کر دیں گے۔

جب انٹرویو سے پہلے میں نے اس کھچا کھچ بھرے ہوئے ہال میں قدم رکھا، جہاں "آج کل" کی ادارت کے امیدواروں کا ایک لشکر بیٹھا ہوا تھا تو میری صورت دیکھتے ہی تمام امیدواروں کے چہرے فق ہو گئے اور میرے مقابلے میں اپنی ناکامی کا یقین ان کی آنکھوں میں تیرنے لگا۔ اس بات سے میرے دل کو بہت سخت دھکا پہنچا اور میں سوچنے لگا کاش میں یہاں آ کر اتنے بڑے لشکر کی مایوسی کا سبب نہ بنتا اور عرفی کا یہ شعر سر میں گونجنے لگا۔ ~

اے متاعِ درد، در بازارِ جاں انداختہ
گوہرِ ہر سود، در جیبِ زیاں انداختہ

اور جب انٹرویو کے کمرے میں داخل ہوا تو یہ دیکھا کہ میاں عظیم حسین اور اجمل خاں کے علاوہ چار یا پانچ آدمی ایسے بھی وہاں موجود ہیں جن کو میں نہیں جانتا۔ اس کمرے میں بیٹھ کر جب میں نے اپنے پان کی ڈبیہ کھولی تو ایک صاحب نے جو صورت کے اعتبار سے مدراسی معلوم ہو رہے تھے، مجھے انگریزی میں کہا "یہاں پان کھانا آداب کے خلاف ہے۔" میں نے جھلا کر جواب دیا: آزاد ہو جانے کے بعد بھی آپ اپنے پرانے آقا کے آداب کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں میں پان کھانے سے باز نہیں آ سکتا۔ پان کھانا میرے واسطے ایسا ہی ہے جس طرح سانس لینا۔ آپ اسے پسند نہیں کرتے تو میں انٹرویو سے دست بردار ہو کر باہر چلے جانے پر آمادہ ہوں۔ میں ڈبیہ بٹوہ اٹھا کر جب اٹھ کھڑا ہوا تو میاں عظیم حسین اور اجمل خاں نے یہ کہہ کر مجھ کو روک لیا کہ آپ شوق سے پان کھائیں۔

اس کے بعد غالباً اجمل خاں نے کہا "جوشؔ صاحب ہم آپ کا انٹرویو کیا لیں بس وہ نظم سنا دیجیے جو آپ نے نظام کے خلاف کہی تھی۔" میں نے کہا۔ "اجمل خاں جن لوگوں کے دماغوں پر اب تک فرنگی آداب کی مہر لگی ہوئی ہے، وہ میری نظم کیا خاک سمجھ سکیں گے۔"

اس پر میاں عظیم حسین، اجمل خاں اور ان کے ساتھ کئی اصحاب نے ہم زبان ہو کر کہا، جوشؔ صاحب آپ ہماری طرف دیکھیں اور ہم کو نظم سنائیں۔ ہم سب آپ کے قدر دان ہیں۔ میں نے اس نظم کے چند شعر سنا دیے اور انٹرویو ختم ہو گیا۔)

"یادوں کی برات"

جوشؔ صاحب نے ۱۵ مئی ۱۹۴۸ء کو پبلی کیشنز ڈویژن میں اردو ایڈیٹر کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں کا چارج لیا تھا۔ اُس وقت وزارتِ اطلاعات و نشریات کے تحت اردو کی دو جگہیں خالی تھیں۔ ایک پریس انفارمیشن بیورو میں انفارمیشن آفیسر اور دوسری جگہ پبلی کیشنز ڈویژن میں اردو ایڈیٹر۔ ان دونوں خالی جگہوں کو پُر کرنے کے لیے ۱۵ جنوری ۱۹۴۸ء کو امیدواروں کا انٹرویو کیا گیا۔ دونوں جگہوں کے لیے کل بارہ امیدوار تھے۔ فی الحال عارضی تقرر ہونا تھا اور اس کے لیے وقتی انتخابی بورڈ بنایا گیا تھا۔ امیدواروں میں دیویندر ستیارتھی بھی شامل تھے جو اس وقت ہندی ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ پی۔ آئی۔ بی کے لئے پنڈت ہری چند اختر کے نام کی سفارش اس سلیکشن بورڈ نے کی۔ جب کہ اردو ایڈیٹر کے لیے جناب عبدالباقی کے نام کی سفارش کی گئی جو اُس وقت حیدرآباد سرکار میں دارالترجمہ کے ڈپٹی ڈائریکٹر تھے۔ لیکن عبدالباقی صاحب نے جنرل ایڈیٹر

ایڈیٹر "آج کل" (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

میگزین (جس کا اسکیل ۱۰۰۰ سے ۱۳۰۰ تھا) کے لیے درخواست دی تھی اور وہ ایک ہزار سے کم مشاہرہ قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ سلیکشن کمیٹی نے سفارش کی تھی کہ باقی صاحب کو تین اضافی سالانہ ترقی دے کر ان کا تقرر کر لیا جائے۔ ۱۶ر جنوری ۱۹۴۸ء کو وزارت اطلاعات و نشریات میں ..... ڈپٹی سکریٹری جناب عظیم حسین نے ان سفارشات کے بارے میں لکھتے ہوئے فائل میں یہ درج کیا کہ عبدالباقی صاحب کے بعد جوش ملیح آبادی دوسرے امیدوار تھے جو ملازمت کی شرائط کو پورا کر رہے تھے اور بورڈ کا خیال تھا کہ کسی بھی ادبی میگزین کے ساتھ جوش صاحب کا نام اس کی حیثیت میں اضافے کا باعث ہوگا لیکن چونکہ جوش صاحب کی بہت سی کمزوریاں مشہور و عام ہیں، اس لیے شاید وہ اپنی منصبی ذمہ داریوں کو نبھانے پر پوری توجہ نہ دے سکیں۔ لہٰذا ہری چند اختر اور باقی صاحب کے نام کی سفارش کرتے ہوئے فائل اس وقت کے سکریٹری وزارت اطلاعات و نشریات این۔ سی۔ مہتہ کے پاس منظوری کے لیے بھیجی گئی جس پر سکریٹری نے دستور ساز اسمبلی کے اجلاس کے بعد دوبارہ پیش کرنے کی ہدایت دی۔ یہ فائل جب ان کے سامنے دوبارہ منظوری کے لیے رکھی گئی تو سکریٹری صاحب نے فائل پر اپنی نوٹنگ میں درج کیا کہ بلاشبہ جوش ملیح آبادی اردو ادب میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں اور ان کا نام اور ان کا وجود اردو رسالے کے لیے بہت مفید ہوگا۔ انہوں نے یہ بھی امید ظاہر کی کہ آنے والے دنوں میں جب شراب بندی پورے طور پر لاگو ہو جائے گی تو شاید جوش صاحب بھی اپنی اس کمزوری پر .... قابو پا لیں گے۔ لہٰذا جوش صاحب کو عارضی طور پر چھ ماہ کے لیے اس عہدے پر مقرر کر دیا جائے اور انہیں اس بات کا بھی اشارہ کر دیا جائے کہ جب تک وہ ایڈیٹر کے عہدے پر کام کرتے رہیں گے، شراب سے دور رہیں گے۔ انہوں نے یہ بھی لکھا کہ انہیں یہ تقرری ۷۲۰ سے ۱۰۰۰ کے اسکیل میں ابتدائی تنخواہ پر دی جائے۔ کیونکہ وزارت خزانہ انہیں اضافی سالانہ بڑھوتری دینے کے حق میں نہیں ہے۔ اس کے بعد فائل اس وقت کے وزیر داخلہ سردار ولبھ بھائی پٹیل کی منظوری کے لیے پیش کی گئی۔ وزیر داخلہ کے پرسنل سکریٹری جناب وی شنکر صاحب نے (جن سے اتفاقاً جوش ملیح آبادی صاحب کے گہرے مراسم بھی تھے) فائل وزارت اطلاعات کو واپس کرتے ہوئے لکھا کہ جوش ملیح آبادی کا تقرر پبلی کیشنز ڈویژن میں اردو ایڈیٹر کی حیثیت سے کر دیا جائے۔ لیکن مسٹر مہتہ نے جو شرط رکھی ہے وہ انہیں بتا دی جائے [اس وقت وزارت اطلاعات و نشریات وزارت داخلہ کا ایک حصہ تھی اور منسٹر کے پرائیویٹ سکریٹری کی نوٹنگ کا مطلب منسٹر کی نوٹنگ ہوتا تھا]۔... اس نوٹ کی روشنی میں جوش صاحب کو تقرر کا اطلاعیہ بھیجا گیا۔ ساتھ ہی ڈائرکٹر پبلی کیشنز ڈویژن کو بھی حکم دیا گیا کہ وہ وزیر داخلہ، سکریٹری، وزارت اطلاعات و نشریات اور ڈپٹی سکریٹری اطلاعات و نشریات کے شبہات سے جوش صاحب کو واقف کراتے ہوئے اُن کے سامنے یہ شرط بھی رکھ دیں۔ کہ وہ دفتر کے اوقات میں اپنی کسی کمزوری کا مظاہرہ نہیں کریں گے۔ جوش صاحب کو ایڈیٹر کی حیثیت سے ملازمت جوائن کرنے کی اطلاع دیتے ہوئے اس وقت کے ڈائرکٹر مسٹر ایس سنہا نے اپنے نوٹ میں لکھا کہ منسٹری نے ان کے بارے میں جن شبہات کا اظہار کیا ہے، میں اس سے اتفاق کرتا ہوں تاہم اپنے لئے یہ مناسب نہیں سمجھتا کہ جوش جیسی شخصیت سے ان کے عادات و اطوار کے بارے میں کچھ کہوں جب تک ایسی کسی چیز کا ثبوت نہ مل جائے جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ ان کے کام میں خلل واقع ہو رہا ہے۔ لیکن سنہا صاحب کے اس نوٹ کا منسٹری میں کوئی خاص اثر نہیں لیا گیا۔ بلکہ ان سے دوبارہ تاکید کی گئی کہ وہ وزارت داخلہ اور وزارت اطلاعات و نشریات کے .... شبہات سے انہیں واقف کراتے ہوئے صاف لفظوں میں یہ تاکید کر دیں کہ وہ جب تک اس عہدے پر رہیں گے، اپنی کسی جانی پہچانی کمزوری کو پاس نہیں آنے دیں گے۔ جوش صاحب نے ۷۰۰ روپے ماہوار پر ملازمت تو اختیار کر لی .... لیکن کچھ ہی دنوں بعد انہوں نے وزارت اطلاعات و نشریات کو درخواست دی ...... کہ سلیکشن کمیٹی نے ان سے جو وعدہ کیا تھا اس کے مطابق انہیں ۱۰۰۰ روپے کا مشاہرہ دیا جائے۔ کیوں کہ موجودہ تنخواہ میں ان کا خرچ پورا نہیں ہو رہا ہے اور ان کا بہت نقصان بھی ہو رہا ہے، اس لئے کہ وہ اس سے زیادہ کی تنخواہ چھوڑ کر سرکار کی خدمت کے لئے آئے ہیں۔ جوش صاحب نے جو درخواست دی تھی اس کا اردو ترجمہ مع انگریزی درخواست پیش کیا جا رہا ہے:

بخدمت جناب سکریٹری صاحب
وزارتِ اطلاعات و نشریات
حکومتِ ہند
بتوسط متعلقہ حکام

جنابِ عالی!

میں وزارتِ اطلاعات و نشریات کے آرڈر نمبر ۲ (۶) ای-پی/ ۱/۴۸- مورخہ ۸ر مئی ۱۹۴۸ء کے حوالے سے جنابِ عالی سے گزارش کرنا چاہتا ہوں۔

مجھے اردو ایڈیٹر کا عہدہ ۷۲۰ سے ایک ہزار کے اسکیل میں ۷۲۰ روپے ماہانہ کی شرح سے پیش کیا گیا ہے۔ جب کہ درخواست دیتے وقت میں نے بہت صاف لفظوں میں اس بات کی وضاحت کر دی تھی کہ میں اس اسکیل میں سب سے زیادہ تنخواہ سے کم پر کوئی عہدہ قبول نہیں کروں گا۔ میں نے انتخابی کمیٹی کے ممبران سے بھی انٹرویو کے دوران صاف لفظوں میں اپنی اس شرط کو واضح کر دیا تھا۔ اگرچہ عارضی طور پر میں نے آپ کی اس پیشکش کو قبول کر لیا ہے، لیکن آپ سے یہ درخواست کروں گا کہ میری تنخواہ ایک ہزار روپے ماہانہ طے کی جائے۔ جس کے اسباب نیچے پیش کر رہا ہوں:

۱- اس عہدے کو قبول کرنے سے پہلے میں ہر ماہ بمبئی اور پونا میں فلموں کے لئے ڈائیلاگ اور گانے لکھ کر تین ہزار سے چار ہزار روپے تک کما رہا تھا، لیکن ملک کی صحیح طور پر خدمت کرنے کے لئے میں نے اس زندگی

کو چھوڑ دیا۔ میں اسے ملک کے لئے ذاتی قربانی کا نام تو نہیں دوں گا، لیکن یہ ضرور چاہوں گا کہ جو قدم میں نے اٹھایا ہے اُسے مستحسن نظروں سے دیکھا جائے۔

۲۔ گزشتہ جنگ کے زمانے میں اُس وقت کی حکومت ہند نے بہت سے شاعروں اور ادیبوں کو منہ مانگے داموں پر خرید لیا تھا اور اس طرح کی پیش کش مجھے بھی کی گئی تھی، جسے قبول کرنے سے میں نے صاف طور پر انکار کر دیا تھا۔

۳۔ ہندوستانی ادب کو ترقی پسند عناصر سے متعارف کرانے کے ساتھ ساتھ میں ہندوستان کی جنگِ آزادی کا ایک نڈر سپاہی ہمیشہ سے رہا۔ اس کے ثبوت کے لئے مجھے بہت سے نام گنوانے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن اپنے کچھ چاہنے والے ساتھیوں کا نام لینا ضرور چاہوں گا۔ ان میں پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، سر تیج بہادر سپرو، مسز سروجنی نائیڈو اور جناب آصف علی کے نام بھی ہیں، جو میرے خیالات اور آزادی کے لئے کی گئی قربانیوں سے بخوبی واقف ہیں۔

۴۔ میری جیسی حیثیت اور مرتبت کے شاعر و ادیب کے لئے یہ بات باعثِ رسوائی اور ذلت ہے کہ میں ۷۰۰ روپے ماہانہ تنخواہ پر ملازمت اختیار کروں۔ اردو ادب میں میرا جو مقام ہے اور جو کچھ میں نے خدمت کی ہے اس سے ہر شخص بخوبی واقف ہے۔ میں اس وقت بلاشبہ اردو کا سب سے بڑا شاعر ہوں۔ اور اس زبان کے عظیم شاعروں میں میرا شمار ہوتا ہے۔ میں ایک درجن سے زائد کتابوں کا مصنف بھی ہوں۔ اور اس ملک کا پڑھا لکھا شخص اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ ہندوستانی نوجوانوں کی عقل و فراست بڑھانے میں میرا اکتساب بڑا حصہ ہے۔ ساتھ ہی ملکی ادب میں نشاۃ ثانیہ لانے میں بہت اہم رول رہا ہے۔

۵۔ میری نوجوانی کا سورج غروب ہو چکا ہے اور اب میں اس عمر کو پہنچ گیا ہوں، جہاں ہر سال تنخواہ میں ۴۰ روپے سالانہ اضافے کا انتظار نہ ہی میرے لئے ممکن ہے اور نہ ہی ضروری۔

۶۔ میں اودھ کے ایک باعزت تعلقہ دار خاندان کا فرد ہوں اور بچپن سے میرا رہن سہن اس طرح کا رہا ہے جس میں ۷۰۰ روپے ماہانہ میں ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنا میرے لئے ناممکن ہے۔ خاندانی روایت اور شاعرانہ مزاج کی وجہ سے مجھے پیسے کا لالچ نہیں ہے اور میں اس حقیر مشاہرے پر بھی مطمئن ہو رہتا۔ اگر دلّی کی اس مہنگی زندگی میں گزارا کرنا آسان ہوتا۔ دراصل میں نے ملازمت اس لئے بھی اختیار کی تھی کہ میرا خیال تھا دلّی میں زندگی کی ضروریات بہت سستی ہیں۔

اگرچہ بمبئی کے مقابلے یہاں میری آمدنی کم ہوگی تاہم میں آسانی سے زندگی گزار سکوں گا۔ لیکن اب موجودہ تنخواہ میں گزارہ کرنا ناممکن سا لگتا ہے .... اگر بڑھتی ہوئی مہنگائی کے مقابلے میں تنخواہ میں اضافہ نہ کیا جائے، میرے پاس اس شہر کو چھوڑ دینے کے سوا اور کوئی دوسرا راستہ نہیں رہ جاتا۔

اس لئے میں اپنی عمر اور تجربے نیز سماجی اور ادبی مرتبے اور ملک کی آزادی اور ادب کے لئے کی گئی خدمات کے پیش نظر یہ امید کرتا ہوں کہ میری اس درخواست کو قواعد اور ضوابط کے بندھنوں میں نہیں جانچا جائے گا بلکہ نرم دلی اور ہمدردی کے ساتھ اس پر غور کیا جائے گا۔

آپ کا وفادار،
جوشؔ ملیح آبادی

جوشؔ صاحب کی اس درخواست کے بعد محکمے اور وزارت میں ہمدردی کے ساتھ غور و فکر کا سلسلہ شروع ہو گیا اور حسب مراتب افسرانِ بالا نے اس سلسلے میں پُر زور سفارشیں بھی کیں۔ ساتھ ہی ہر سفارش میں اس بات کا تذکرہ خصوصاً کیا گیا کہ جوشؔ صاحب کا نام نامی محکمے کے لئے باعثِ عزت اور باعثِ فخر ہے لہٰذا ان کی تنخواہ میں خاطر خواہ اضافہ کیا جائے۔ اس وقت کے وزارت کے جوائنٹ سکریٹری نے بھی سفارش کی کہ جوشؔ صاحب کی عمر ۵۰ سال کی ہو چکی ہے اور ان کی صلاحیتوں اور شہرت کو دیکھتے ہوئے ان کی تنخواہ کم سے کم ۸۰۰ روپے ماہانہ کر دی جائے۔ یہ سفارشات بعد میں وزارتِ خزانہ کو بھی بھیجی گئیں۔ وزارتِ خزانہ نے اس پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا: — چونکہ ابھی یہ تقرر عارضی ہے اور فیڈرل سروس کمیشن (اس وقت کا یو پی ایس سی) جلد ہی ان عہدوں کو بھرنے کے لئے قدم اٹھائے گا۔ اس وقت ایف سی ایس سی کے سامنے جوشؔ صاحب کے ان مطالبات کو بھی پیش کر دیا جائے گا۔

عام طور پر وزارتِ خزانہ سے کسی مطالبے کو رد کر دئے جانے کے بعد معاملہ سرد خانے میں ڈال دیا جاتا ہے، لیکن یہاں ایسا نہیں ہوا۔ وزارتِ اطلاعات و نشریات نیز محکمے کے لوگوں نے بار بار وزارتِ خزانہ کے حکام سے اس معاملے کی پُر زور سفارش کی۔ بعد میں وزارتِ خزانہ نے اس مطالبے کو منظور کر لیا۔ لیکن انہوں نے ایک شرط یہ لگا دی کہ فی الحال ان کی تنخواہ ۷۰۰ سے بڑھا کر ۸۰۰ روپے کر دی جائے جو انہیں ملازمت میں آنے کی تاریخ سے دی جائے، لیکن اس کے ساتھ ہی جوشؔ صاحب کی کارکردگی پر نگاہ رکھی جائے اور ہر ماہ اس بات کی رپورٹ بھیجی جائے کہ ان کی موجودگی سے تینوں رسالوں کی اشاعت پر کیا اثر پڑ رہا ہے۔

جوشؔ صاحب نے ۱۵ر نومبر ۱۹۴۸ء کو چھ ماہ کی مدت پوری کر لی۔ اس سلسلے میں محکمے نے ان کی کارکردگی کی رپورٹ بھیجتے ہوئے وزارتِ اطلاعات و نشریات سے یہ درخواست کی کہ جب تک ان عہدوں کے لئے

الیف۔ سی ۔ ایس ۔ سی میں انٹرویو نہیں ہوا، اس وقت تک جوش صاحب کو ملازمت پر بنے رہنے دیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی ان چھ مہینوں کی مدت میں ارد رسالوں کی ماہ بہ ماہ کی تعدادِ اشاعت کی رپورٹ بھی وزارت میں بھیجی گئی رپورٹ بھیجتے وقت ڈائریکٹر پبلی کیشنز ڈویژن نے جو نوٹ لگایا تھا وہ بھی دیکھنے کی چیز ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا تھا :

"ہندوستان کی تقسیم کے بعد اس ڈویژن کے اردو رسالوں کی اشاعت اچانک بند ہو گئی۔ جوش صاحب کے اس عہدے پر آنے سے قبل یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اردو جو سارے ہندوستان کی زبان تھی، اب شاید وہ اس ملک میں زندہ نہ رہ سکے۔ جب میں نے ان رسالوں کی دوبارہ اشاعت کے بارے میں عملی قدم اٹھایا تو مجھے قطعی اس بات کی امید نہیں تھی کہ یہ رسالے دوبارہ زندہ ہو سکیں گے یا مجھے اس کام میں کوئی کامیابی ہو سکے گی۔ ....
جناب جوش نے مئی ۱۹۴۸ء میں ایڈیٹر کے عہدے کا چارج لیا اور انہوں نے اس کام کی ابتدا کی۔ اس وقت آج کل (اردو) کی تعدادِ اشاعت تقریباً تقسیم سے قبل کی تعدادِ اشاعت کے برابر ہے۔ جب اردو پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ، سندھ اور پورے ہندوستان میں بلاشرکتِ غیرے ملک گیر زبان تھی۔ چونکہ اس وقت ہندی کو موجودہ حیثیت حاصل نہیں تھی۔ ان رسالوں کی زندگی اور اشاعت کے لئے جوش کا نام ہی کافی ہے۔ انہوں نے ان کا ایک معیار قائم کیا ہے اور اس معیار کی بدولت ترویج و ترقی ہوئی ہے۔ میرے خیال میں جوش صاحب کے نام سے جس تعدادِ اشاعت کو ....
.... ہم نے آج حاصل کر لیا ہے، شاید اسے پانے کے لئے ہمیں بہت زیادہ محنت کے علاوہ کئی سال کی مدت درکار ہوتی۔ جولائی ۱۹۴۸ء سے فروری ۱۹۴۹ء تک کی تعدادِ اشاعت ملاحظہ کے لئے پیش کی جا رہی ہے۔"

محکمے کے اس نوٹ پر وزارتِ خزانہ نے پھر اعتراض کرتے ہوئے لکھا کہ پبلی کیشنز ڈویژن کے رسالے "نونہال" "لبساطِ عالم" اور "آج کل" کی جو تعدادِ اشاعت دی گئی ہے اس سے جوش صاحب کی وجہ سے ہونے والے اضافے پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ کیوں کہ اس تعدادِ اشاعت کے ساتھ تقسیم سے پہلے کی تعدادِ اشاعت نہیں دی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اگر محکمے سے شائع ہونے والے دوسرے رسالوں کی بھی تعدادِ اشاعت دی جائے تو بہتر ہو۔ اس کے جواب میں محکمے نے جو نقشہ بھیجا وہ نیچے دیا جا رہا ہے :

جنوری ۱۹۴۷ء سے اگست ۱۹۴۷ء تک کی تعدادِ اشاعت

نمبر شمار	رسالے کا نام	جنوری	فروری	مارچ	اپریل	مئی	جون	جولائی	اگست
۱	آج کل (پندرہ روزہ)	۱۳۶۸۹	۱۴۰۳۹	۱۴۲۵۸	۱۴۲۴۰	۷۲۶۹	۱۷۴۲۷	۱۷۲۵۷	۱۲۶۷۱
۲	نونہال (ماہنامہ)	۴۸۳۹	۵۷۵۷	۴۸۱۰	۴۵۲۵	۴۵۵۰	۳۹۷۷	۳۹۱۳	۲۷۰۶
۳	آج کل (ہندی ماہنامہ)	۴۱۶۰	۳۶۵۳	۴۰۴۷	۴۲۷۰	۶۰۳۰	۴۴۶۲	۴۳۰۷	۴۷۵۶

جولائی ۱۹۴۸ء سے فروری ۱۹۴۹ء تک کی تعدادِ اشاعت

نمبر شمار	رسالے کا نام	جولائی	اگست	ستمبر	اکتوبر	نومبر	دسمبر	جنوری (پندرہ روزہ)	فروری
۱	آج کل ماہنامہ	۷۱۶۹	۶۹۶۵	۶۷۴۴	۶۷۸۴	۶۷۰۷	۱۰۳۰۰	۷۶۸۹	۹۰۸۹
۲	بساطِ عالم ماہنامہ	۷۱۷	۱۵۴۶	۱۵۲۵	۱۵۱۱	۱۴۸۵	۱۵۵۸	۱۵۸۳	۱۶۸۸
۳	نونہال ماہنامہ	بالکل نہیں	۲۵۴۸	۲۲۶۲	۲۱۹۲	۲۳۰۳	۲۳۱۶	۲۵۴۸	۲۵۶۹
۴	آج کل ہندی	۶۸۷۶	۸۶۰۵	۸۵۱۵	۹۱۴۵	۸۳۹۳	۸۶۴۵	۱۰۶۰۰	۱۱۸۱۵

نوٹ : "بساطِ عالم" کی اشاعت جولائی ۱۹۴۸ء سے شروع ہوئی۔
" نونہال" کی اشاعت اگست ۱۹۴۸ء سے شروع ہوئی۔
" آج کل (ہندی) کو جنوری ۱۹۴۹ء سے پندرہ روزہ کر دیا گیا۔

The Secretary,
Ministry of Information & Broadcasting,
Government of India,
New Delhi.

Through Proper Channel.

Sir,

With reference to Ministry of Information & Broadcasting Memo No.2(6)EP/1/48 dated 8th May, 1948, I beg to request as under:

The post of Editor Urdu was offered to me at Rs.720/ p.m. in the scale of Rs.720--40-1000, whereas I had clearly mentioned in my application that it would not be possible for me to accept anything less than the maximum of the scale. I had made this clear to the Members of the Selection Board at the time of interview. For the time being I have accepted the offer but would request that my salary may kindly be fixed at Rs.1000/ p.m. for the following reasons:

1. Prior to my accepting the above appointment I was earning from Rs/3000/- to 4000/- a month at Bombay and Poona through writing dialogues and songs etc., for the film producers. I have left that with a view to making myself available to the services of the country in the right direction. I do not call it a personal sacrifice but at the same time I do expect that the step taken by me will be appreciated.

2. During the last war, when most of the poets and writers were purchased by the then Government of India I rejected not less than three such offers made to me.

3. Side by side with my activities as one of the sponsors of progressive tendencies in Indian literature, I have been a fearless soldier in the field of India's freedom. I need not quote many names to bear testimony to this statement but will refer to some of my friends and admirers like Pandit Jawahar lal Nehru, Maulana Abul Kalam Azad, Sir Tej Bahadur Sapru, Mrs.Sarojini Naidu and Mr.Asaf Ali.

4. It is indeed humiliating for a poet and writer of my standing to accept a monthly salary of Rs.720/- p.m. My services in the field of Urdu literature are too well known to be mentioned. I, indisputedly, occupy the topmost position in the list of Urdu poets and rank among the best of them. I am the author of about a dozen of books and the intelligentsia of India bear testimony as to how much I have contributed to the intellectual advancement of Indian youth and the virtual renaissance of literature in this country.

5. The sun of youth has already set and I have reached an age when it is neither expedient nor possible for me to wait for the annual increments of Rs.40/- for the long spell of 7 years.

6. I belong to a respectable Taluqdar family of Oudh and my standard of living, since my childhood, has been such that the small salary of Rs.720/- p.m. is absolutely insufficient to meet the needs of life. Neither by ancestral tradition nor by poetic temperament, I have any greed of money and I would have certainly been content with Rs.720/-p.m., also if I had not, to my surprise found life in Delhi very expensive. In fact I accepted the offer under the impression that Delhi would be cheap and despite considerable reduction in my earnings as compared to Bombay I would be able to make two ends meet. But I now find that it is almost impossible to make the two ends meet here in my present salary, so that unless I am enabled to cope with the rising cost of living I would have no alternative left but to leave the town.

I therefore hope that keeping in view my age and experience, my social and literary status in the country and my well-known services to the cause of freedom and literature, this application of mine will not be subjected to the blinding gaze of rules and regulations but will rather be observed under the softer of generous idealism.

I have the honour to be, Sir,

Your most obedient servant,

Sd/- Josh Malihabadi

JOSH MALIHABADI
Editor, Urdu.

اس تعدادِ اشاعت کے ساتھ محکمے نے اپنے نوٹ میں اس بات کی وضاحت کردی کہ یہ تعدادِ اشاعت اس بات کا ثبوت ہے کہ جوش صاحب کے آنے سے اس میں کتنا اضافہ ہوا۔
اس بار جوش صاحب کے کردار کے متعلق سرکاری تفتیشات بھی مکمل کرلی گئیں اور ان کی صحت کی بھی جانچ کرلی گئی۔ پھر نومبر ۱۹۴۸ء میں جوش صاحب نے مکان کی رسید پیش کرتے ہوئے ..... یہ درخواست دی کہ انہیں مکان بھتہ مئی ۱۹۴۸ء سے دیا جائے۔ کیوں کہ وہ کرائے کے مکان میں رہ رہے ہیں، اسے منظور کر لیا گیا۔ ۱۵ر مئی ۱۹۴۹ء کو تنخواہ میں سالانہ

اضافہ کر کے ان کی تنخواہ ۸۴۰ روپے کر دی گئی۔

مکان بھتہ کے لیے ہر سال درخواست دینی پڑتی تھی۔ دوسرے سال جب جوش صاحب نے مکان کے ماہانہ کرائے کی رسید ساٹھ روپے کی در سے پیش کی تو اس وقت ایک نئی بات سامنے آئی۔ اے جی سی آر (جہاں سے تنخواہ اور بھتہ ملا کرتا تھا) نے اس بات پر اعتراض کیا کہ جوش صاحب ساٹھ روپے مہینے کی در سے کرائے کی ادائیگی کر رہے ہیں۔ جب کہ قانون یہ ہے کہ اگر سرکاری اہل کار اپنی تنخواہ کا دس فیصد کرائے کی مد میں خرچ کر رہا ہو تو اس کو مکان کرایہ بھتہ دیا جاسکتا ہے۔ چونکہ جوش صاحب ساٹھ روپے مہینہ کرایہ دے رہے ہیں جو ان کی تنخواہ کا دس فیصد سے کم ہے لہٰذا انہوں نے ...... یہ بھتہ غلط لیا ہے۔ پچھلے سال اس مد میں دی گئی ساری رقم ان کی تنخواہ سے وضع کر لی جائے۔ نیز انہیں کوئی مکان کرایہ بھتہ نہ دیا جائے۔

جوش صاحب نے ۲۱ جولائی کو محکمے میں پھر ایک درخواست دی ..... چونکہ کرایہ بھتہ کی مد میں لی گئی رقم انہیں تین قسطوں میں ادا کرنے کے لئے کہا گیا ہے جو ان کے لئے بہت مشکل ہے اور جس کی پہلی قسط جون ۱۹۵۰ء میں ان کی تنخواہ سے کاٹ لی گئی ہے۔ لہٰذا ان کی دشواریوں کو دیکھتے ہوئے یہ باقی رقم آٹھ قسطوں میں کاٹی جائے تاکہ انہیں سہولت ہو جائے۔ ان کی اس درخواست پر محکمے نے ہمدردانہ رویہ اپنایا۔ یہاں اس بات کی بھی وضاحت کر دی جائے کہ اس دوران جوش صاحب علاج وغیرہ پر خرچ کی گئی رقم کی وصولی کے لئے محکمے کو درخواست دیا کرتے تھے۔ اس طرح کا ایک بل ۲۴ روپے ۱۳ آنے کا ۱۹۵۰ء میں انہوں نے داخل کیا جس کی ادائیگی کر دی گئی۔ اس کے علاوہ انہوں نے ایسے ہی کئی اور بل بھی پیش کئے۔

جوش صاحب کی فائل میں زیادہ اندراج چھٹیوں کی درخواست کے سلسلے میں ہیں۔ ہر چھٹی لینے سے گزیٹیڈ افسر ہونے کی وجہ سے اپنے عہدے کا چارج دینا اور چھٹی سے لوٹنے پر چارج لینے کا سرٹیفکیٹ بھرنا پڑتا تھا۔ جوش صاحب کبھی یہ درخواست سادے کاغذ پر دے دیتے اور کبھی چارج سرٹیفکیٹ وغیرہ بھرنا بھول جاتے۔ جس میں زیادہ کاغذی کارروائی کرنی پڑتی تھی۔ اکثر یہ بھی ہوا ہے کہ وہ دفتر سے چھٹی لے کر باہر گئے اور وقت مقررہ پر واپس نہیں آسکے۔ اس کی انہوں نے دفتر کو کبھی اطلاع دی اور کبھی نہیں دی۔ اس سلسلے میں ان سے دفتر سے وضاحتی جواب بھی طلب کئے جاتے تھے۔

فائل میں ایک دلچسپ اندراج ۲۷ اگست ۱۹۵۱ء کا ہے جس میں سب جج درسٹ کلاس دہلی کی عدالت کا ایک حکم نامہ درج ہے جس میں کہا گیا ہے کہ پورن کے محمد ہاشم موسے دینا مدعی نے عدالت میں درخواست دی ہے کہ جوش ملیح آبادی ان کے ۲۳ ہزار چار سو ۴۷ روپے ۱۱ آنے کے قرض دار ہیں جس کی ادائیگی انہوں نے نہیں کی ہے۔ (غالباً یہ کسی فلم کمپنی کے پروڈیوسر تھے اور جوش صاحب سے ان کا معاہدہ ہوا تھا جوش صاحب پونا چھوڑ کر دلی آگئے۔ جس سے فلم کمپنی کا بہت نقصان ہو گیا اور یہ دعویٰ اسی نقصان کے بھر جانے کے طور پر داخل کیا گیا تھا) غالباً مقدمہ کی سماعت یکطرفہ ہوئی تھی اسی لئے عدالت نے اپنے فیصلے میں لکھا کہ جوش صاحب کی تنخواہ سے یہ رقم جو سو روپے اور اس سے زیادہ تنخواہ کا نصف سے زائد حصہ ہو، ہر ماہ عدالت میں جمع کرائی جائے۔ اور پوری رقم ۶۱ قسطوں میں وضع کر لی جائے۔ عدالت کے حکم کی تعمیل فوری طور پر کی جائے۔ اس سلسلے کا نوٹ بھیجتے ہوئے وزارت اطلاعات و نشریات نے اس بات کا بھی اشارہ کیا کہ اگر ضرورت ہوئی تو یہ معاملہ سرکاری ملازمین کے ضابطۂ اخلاق کے تحت بھی جانچا جائے گا۔ عدالت کے اس حکم نامے کی تعمیل فوری طور پر شروع ہو گئی اور جوش صاحب کی تنخواہ سے قسطیں کٹنی شروع ہو گئیں۔ ان کی یہ ماہانہ قسط ۳۹۰ روپے پر طے کی گئی اور آخری ۶۱ ویں قسط ۱۴۷ روپے گیارہ آنے کی طے کی گئی۔ اس کے بعد سے وزارت کے ایک ڈپٹی سکریٹری نے فائل پر نوٹ کیا کہ اے جی سی آر کے ترمیم شدہ حکم کے مطابق دلی ٹریژری آفس جولائی کی تنخواہ سے جو اگست میں ملے گی قسطیں کاٹنا شروع کرے گی۔ اے جی سی آر نے اپنے نوٹ میں کہا تھا ۶۱ ویں اکسٹھ قسطوں میں پوری رقم وضع کرنا ممکن نہیں ہوگا کیونکہ جوش صاحب ۵ دسمبر ۱۹۵۳ء کو ملازمت سے سبکدوش ہونے کی عمر کو پہنچ جائیں گے......
.... جب کہ عدالت کے حساب سے ۶۱ قسطیں جولائی ۱۹۵۶ء میں پوری ہوں گی۔ اس کا حوالہ دیتے ہوئے وزارت اطلاعات و نشریات کے ڈپٹی سکریٹری نے کہا کہ یہ معاملہ الگ سے دیکھا جائے گا اور اس کے لئے پھر سے عدالت میں درخواست دی جائے گی۔ جہاں تک ضابطۂ اخلاق کی شق ———— ۹۲۸، ۹۳۷ بتاریخ ۱۹ جون ۱۹۱۴ء کا سوال ہے، کوئی بھی سرکاری ملازم ملازمت سے اس صورت میں برطرف کیا جاسکتا ہے:

۱۔ جب اس سرکاری ملازم کو دیوالیہ قرار دے دیا جائے۔
۲۔ جب اس ملازم کی تنخواہ لگاتار قرقی کر لی جائے اور یہ قرقی دو سال سے زائد عرصے تک چلتی رہے۔
۳۔ جب یہ قرقی کی گئی رقم عام حالات میں دو سال کے عرصے میں ادا نہ کی جاسکے۔

ان شرطوں کی وضاحت کے ساتھ ڈپٹی سکریٹری نے اپنے نوٹ میں لکھا کہ زیر غور معاملے میں جوش صاحب کے ساتھ پہلی اور دوسری شرائط اس لئے لاگو نہیں ہوتیں کیوں کہ نہ تو انہیں دیوالیہ قرار دیا گیا ہے اور نہ ہی عادتاً قرض لینے کی صورت میں ان کی تنخواہ لگاتار قرق کی گئی ہے۔ لہٰذا ضابطۂ اخلاق کے تحت ان پر کل کارروائی کئے جانے کا یا ملازمت سے برطرف کئے جانے کا کوئی معاملہ نہیں بنتا

اس کے بعد ہی ۱۰ جنوری ۱۹۵۲ء میں ایک دوسرا اندراج یہ ملتا ہے کہ چونکہ عدالت نے اپنا پہلا قرقی کا حکم واپس لے لیا ہے۔ لہٰذا جوش ملیح آبادی کی تنخواہ سے اب ساری ریکوری فوری طور پر ختم کر دی جائے اور انہیں پوری تنخواہ کی ادائیگی کی جائے۔
(غالباً مدعی نے اپنا دعویٰ واپس لے لیا۔ اس وجہ سے عدالت نے تنخواہ

کی رجسٹری نمبر ۱۰

پوری فائل میں جوش صاحب نے صرف ایک کاغذ پر اردو میں دستخط کیا ہے۔ وہ ہر کاغذ پر انگریزی میں جوش لکھا کرتے تھے۔ ۱۹۵۰ء میں ہی ایک اور درخواست جوش صاحب کی ملتی ہے جس میں انہوں نے محکمے سے گزارش کی ہے کہ چونکہ کشمیر کے سلسلے میں بہت پبلسٹی سے متعلق بہت سے پمفلٹ تیار کرنے کی ذمہ داری انہیں سونپی گئی ہے۔ لہٰذا پہلی مئی ۱۹۵۰ سے انہیں ہر ماہ تنخواہ کے علاوہ کچھ اعزازیہ بھی دیا جائے جس کی سفارش محکمے نے بھی کی اور انہیں اعزازیہ دیا گیا۔ لیکن فائل سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ انہیں کتنی رقم دی گئی۔

فائل پر ایک نوٹ اس وقت کی کشمیر حکومت کی طرف سے بھی لگا ہوا ہے جو وزارت اطلاعات و نشریات کے سکریٹری کو لکھا گیا تھا۔ جس میں کہا گیا تھا کہ کشمیر کی حکومت ۳ نومبر ۱۹۵۱ کو ایک کمیونزم کا انعقاد کر رہی ہے جو جوش ملیح آبادی کی شرکت کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتا۔ یہی نہیں کشمیر کے وزیر اعظم جناب شیخ محمد عبداللہ نے جوش ملیح آبادی سے ذاتی طور پر یہ درخواست کی ہے کہ وہ مشاعرے کی ساری ذمہ داری اپنے سر لے لیں۔ لہٰذا حکومت کشمیر وزارت اطلاعات و نشریات سے یہ گزارش کرتی ہے کہ جوش ملیح آبادی کو سرکاری ڈیوٹی پر دس دنوں کے لئے سری نگر بھیج دیا جائے۔ ظاہر سی بات ہے کہ اس کے بعد جوش ملیح آبادی سرکاری ڈیوٹی پر ہی اکثر و بیشتر مشاعروں میں شرکت کرتے رہے۔

اس محکمے میں موجود سرکاری کاغذات سے دو تین باتوں کی وضاحت نہیں ہو سکی:

۱. جوش صاحب کی ملازمت شروع میں عارضی تھی اور انہیں مستقل ہونے کے لئے ایف سی ایس سی کے سامنے انٹرویو کے لئے جانا تھا۔ وہ ایف سی ایس سی گئے یا نہیں گئے۔

۲. کاغذات کے حساب سے ۵ دسمبر ۱۹۵۳ء کو جوش صاحب کو ملازمت سے سبکدوش ہونا تھا، لیکن وہ ۱۹۵۵ء میں پاکستان جانے تک ملازمت پر لگے رہے۔ ۱۹۵۴ میں انہیں پدم وبھوشن کا اعزازی خطاب دیا گیا تھا، لیکن اس کا بھی کوئی ذکر فائل میں نہیں ملتا۔ ان کاغذات کو تلاش کرنے کی بہت سعی کی گئی، لیکن کارگر نہیں ہو سکی۔ جس کا ہمیں افسوس ہے۔ ●●

جوش صاحب کی انگریزی تحریر کا عکس

S.M. 26

To
The Director
Publications Division
Old Secretariat
Delhi.

Sir,

It is requested that casual leave from the 25th to the 30th March 1949 with permission to leave headquarters may kindly be granted as I have an urgent piece of work at Calcutta.

Yours faithfully,

Josh
(Josh Malihabadi)
Editor (Urdu)

26/3/49

● ہندی کے معروف ناول اور افسانہ نگار جناب گل شیر خاں شانی کا گزشتہ ۹ فروری کو دل کا دورہ پڑنے سے دلی میں انتقال ہو گیا۔ وہ ۱۶ مئی ۱۹۳۳ کو مدھیہ پردیش کے جگدل پور میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ ساکچھات کار اور ساہتیہ اکیڈمی کے سہ ماہی رسالے سمکالین بھارتیہ ساہتیہ کے ایڈیٹر بھی رہے۔ ان کی تصنیفات میں کالا جل، ایک لڑکی کی ڈائری، پھول توڑنا منع ہے، سانپ اور سیڑھیاں، پتھروں میں بند آواز، جہاں پناہ جنگل، ببول کی چھاؤں قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے شانی دنوں کا دیپ کے نام سے اپنی یادداشت بھی مرتب کی ہے۔ کچھ دنوں تک وہ نوبھارت ٹائمز کے بھی اسسٹنٹ ایڈیٹر رہے۔ انہیں مختلف اعزازات سے بھی نوازا گیا تھا۔ شانی کا سانحۂ ارتحال صرف ہندی دنیا کے لئے ہی عظیم نقصان نہیں ہے بلکہ پوری کہانی کی دنیا کے لئے ایک نقصان ہے۔ ادارہ ان کے وارثین کے ساتھ ان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

ڈاکٹر شان الحق حقی

تاثرات ــــ خودنوشت سے چند اقتباسات

جوش کی ذات و صفات اور ان کی شاعری ہر پہلو سے اتنا بڑا موضوع ہے کہ اس کا حق تو کبھی بھی ادا نہ ہو سکے گا اور یہ مضمون ہمیشہ تشنہ ہی رہے گا۔ میں اس وقت ایک اتفاقی تحریک پر ان کی شخصیت کے صرف ایک پہلو کو چھیڑنا چاہتا ہوں جس کی بابت بڑی غلط فہمیاں ہیں۔

ابھی ایک محفل میں ایک بہت اچھی خاتون اور معروف ادیبہ نے کہا کہ میں جوش سے بہت ملنا چاہتی تھی، مگر اس لیے باز رہی کہ وہ کوئی نازیبا حرکت نہ کر بیٹھیں۔ سنا تھا ایسے ہی آدمی ہیں۔ مجھے ان کے اس گمان پر حیرت بھی ہوئی اور دلی تکلیف بھی پہنچی۔ اس سے اندازہ ہوا کہ عام طور پر لوگ جوش کی بابت کتنے غلط تاثرات رکھتے ہیں۔ اس میں خود ان کی تصنیفِ لطیف کا کچھ دخل ہے۔ جس میں انہوں نے اپنی رند مشربی اور آوارہ مزاجی کو بہت اچھالا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جس جوش کو میں پینتالیس برس سے دیکھتا آیا تھا اور جس کے ساتھ دس برس خاصا تقرب رہا۔ وہ میری نظر میں شرافت کا پتلا اور ہماری تہذیب و شائستگی کا مثالی نمونہ تھے۔ میں نے ان خاتون سے کہا کہ آپ سخت غلط فہمی میں رہیں۔ جوش انسان کو دیکھ کر بات کرتے تھے۔ آپ کے سامنے کسی نازیبا بات کا ان کے منہ سے نکل جانا امرِ محال تھا۔ وہ ہر شخص سے برتاؤ کا طریقہ اور ہر محفل کے آداب و رسوم کو جانتے تھے۔ علمِ مجلسی کا ایسا ماہر اور کوئی نہ ہوگا۔ وہ طوائف کے کوٹھے اور مہذب دیوان خانے میں فرق ملحوظ رکھتے تھے۔ علمی مجالس کی رونق تھے اور بزمِ رنداں کے صدر نشین بھی۔ آوارگی آوارہ منشوں کے ساتھ روا رکھتے تھے، وہ بھی عمر کے ایک دور میں اور اس کے بیان میں بڑی حد تک افسانہ سازی سے کام لیا ہے۔ پُرتخیل ذہن رکھتے تھے اور افسانہ طرازی ان کے مزاج میں اتنی دخیل تھی کہ جا نہیں سکتی تھی لیکن خلوت و جلوت، صبح و شام، مصروفیت اور بیکاری، بے کیفی و سرمستی کسی عالم میں بھی میں نے انہیں بہکتے ہوئے تو ضرور دیکھا، اتنا بہکتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا کہ اپنے آپے کا ہوش نہ رہے یا یہ دھیان کہ ان کا مخاطب کون ہے؟

خائف نہ ہوں اربابِ خرد اہلِ جنوں سے
وحشت میں بھی پڑتے ہیں بہت پاؤں سنبھل کے

میں نے اس شعر میں جو تاثر پیش کرنا چاہا ہے وہ انہی کی شخصیت کا تاثر ہے۔ اور ان پر خوب چسپاں ہوتا ہے۔ جوش صحیح معنی میں ایک عالی ظرف انسان تھے۔ میں نے بعض لوگوں کو بوتل کی شکل دیکھ کر بھی حال سے بے حال ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ جوش اپنے گھر پر تو نپی تلی مقدار میں پیتے ہی تھے، گھر کے باہر بھی اگر معمول سے تجاوز ہوتا تو ہوش و حواس قائم رہتے تھے۔ شام سے پہلے تو جام کو چھونے کا سوال ہی نہ تھا۔ طلوعِ جام کے بعد بھی ان کے ہوش کبھی غروب نہ ہوتے۔ یہ ظرف کی بات تھی اور ظرف کی یہ بڑائی صرف مے خواری تک محدود نہ تھی۔ میں نے کیا کسی نے بھی انہیں غصے میں بپھرتے نہ دیکھا ہوگا۔ ان کے گھر والوں یا ملنے والوں نے کبھی ان کے منہ سے حرفِ گرم نہیں سنا۔ اپنے گھر والوں سے ان کی شیفتگی حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ غصہ تو ضرور بہت سی باتوں پر آتا ہوگا، لیکن اسے آسانی سے پی جانا اور چپ سادھ کر رہ جانا، یہ انہی جیسے عالی ظرف انسان کا کام تھا۔ اس معاملے میں میں نے دو ہی انسانوں کو برگزیدگی کے درجے پر پایا۔ یادش بخیر ایک ممتاز حسن اور ایک جوش ملیح آبادی۔ مزاج پر پورا قابو رکھنا، ہر تکلیف دہ بات کو خاموشی سے سہہ جانا، دشمنوں کے ساتھ بھی دوستی میں کمی نہ کرنا، یہ میں نے ممتاز حسن میں پایا۔ جوش بھی قول کے سچے، دل کے صاف اور بات کے کھرے تھے۔ یوں بہرحال انسان تھے، کمزوریوں سے مبرا نہ تھے جو انسانیت کا لازمہ ہیں لیکن ان کی بڑائیاں ان کی کمزوریوں پر حاوی ہیں۔ جن میں سے بعض تو مجھے بڑی ہی معصومانہ سی معلوم ہوتی ہیں۔ مجھے اس کا بھی اعتراف ہے کہ بعض باتیں جن پر انہیں مطعون کیا جاتا ہے، میرے اور ان کے درمیان قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی تھیں۔ ان کی صحبت بڑی بامزہ صحبت تھی کہ جیسی اب نصیب نہیں ہو سکتی۔

بات ان کے اخلاق و آداب سے شروع ہوئی تھی۔ اس سے گریز کے پہلو تو قدم قدم پر نکل سکتے ہیں۔ آج میں ان کے تپاک اور حسنِ اخلاق ہی کے ذکر پر اکتفا کرنا چاہتا ہوں۔ دلی میں کبھی موٹر میں جاتے ہوئے ملتے اور میں آداب کرتا تو گاڑی روک کر حال پوچھتے۔ کہتے کہ والد صاحب کو میرا سلام کہئے اور مجھے کسی دن ان کے پاس لے چلئے۔ اللہ اللہ انہوں نے یہ کبھی نہ کہا کہ ان سے کہئے کہ کبھی ملاقات کریں۔ اردو بورڈ میں وہ میرے کمرے میں آتے تو میں کھڑا ہو جاتا تھا۔ جو میری خوردی کا تقاضا تھا۔ کبھی ایسا ہوا کہ دروازے سے باہر قدم

۱۷۔ اے خیابانِ تنظیم، ڈیفینس انیکس۔ اے، کراچی۔

نکالا اور کئی بار پلٹ پلٹ کر آئے۔ میں نے ہر بار اٹھک بیٹھک کی۔ اس کے جواب میں جب کبھی میں ان کے کمرے میں جاتا، وہ مجھ سے اُٹھ کر ملتے۔ میں نے کہا حضرت آپ تو میرا اپنے پاس آنا بند کر دینا چاہتے ہیں۔ میں لپک کر جاتا اور اُن کے ہاتھ پکڑ لیتا کہ وہ اُٹھنے نہ پائیں مگر اُنہوں نے اپنی وضع ترک نہ کی۔ انہیں معلوم تھا کہ میں بورڈ کا سکریٹری سہی' ان کا مرتبہ مجھ سے بڑا ہے۔ اس اظہار تپاک میں جو پہلو تھا وہ یہ کہ یہ لڑکا جو یہاں ایک ذمہ دار عہدے پر ہے اور سب اس کا لحاظ کرتے ہیں، اسے یہ گمان نہ ہو کہ صرف میں ہی حقیر سمجھتا ہوں۔

پچھلی بار جب میں نے دیکھا کہ ان کے گھٹنے جواب دے گئے ہیں اور وہ اُٹھنے بیٹھنے سے تقریباً معذور ہو چکے ہیں تو میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میری نظر میں اُن کی وہ تصویر گھوم گئی جب میں نے اُنہیں ۱۹۳۵ء میں پہلی بار حیدرآباد دکن میں دیکھا تھا۔ وہ صحت اور وجاہت کا نمونہ تھے۔ وہ ان کی زندگی کا بہترین دور تھا۔ جب ان کے قویٰ شباب پر تھے۔ صحت اور وجاہت بھی تھی۔ فراخی و فراغت بھی' اور آمد کلام کے علاوہ ذہنی مصروفیت اور کسب معاش کے لئے ایک ایسا مشغلہ بھی جس کے لئے وہ موزوں ترین شخص تھے۔ یعنی بیرونی زبانوں' انگریزی، عربی، فرانسیسی وغیرہ سے ترجمہ کی ہوئی کتابوں کی زبان درست کرنا اور نوک پلک سنوارنا جسے Vetting کہتے ہیں۔ یہ کام وہ پوری احتیاط اور استیعاب کے ساتھ کرتے تھے۔ اوقاف کا خاص خیال کرتے تھے۔ عبارت کو نکھار دیتے تھے۔

وہ مہاراجہ کشن پرشاد کے نام علامہ اقبال کے خط کے ساتھ حیدرآباد گئے تھے۔ مجھے ان کے وہ اشعار یاد آرہے ہیں جو اُنہوں نے علامہ کے انتقال پر کہے تھے اور یہ بھی ان کے حسن اخلاق اور عالی ظرفی کے شاہد تھے ؎

واپس آ اقبال تجھ بن دہر ننگ و عار ہے
تیرے بدلے جوش مرنے کے لئے تیار ہے

جوش خود بھی کسی کی سفارش سے کبھی پہلو تہی نہ کرتے تھے، جس سے نہ جانے کتنے لوگوں کے کام بنے ہوں گے۔

ذکر تپاک کا تھا۔ اُنہیں کسی کی دل آزاری منظور نہ تھی۔ ایک بار جب وہ انہماک سے لفظ "اللہ" اور "آنکھ" کے تابع محاورات و امثال کی تشریح لکھ رہے تھے (ہر ایک کی تعداد سیکڑوں میں ہے) فرمایا کہ لوگ ملنے بہت آتے ہیں۔ کام نہیں ہو سکتا۔ کسی کو باہر بٹھائیے کہ جسے کوئی ضروری کام ہو وہ اندر آئے۔ باقی اصحاب سے معذرت کر لی جائے کہ مصروفیت بہت ہے۔ مگر روز بڑی دلچسپ صورت درپیش ہوتی۔ ہر شخص شکایت لے کر آتا کہ دیکھئے جوش صاحب ہمیں باہر روک دیا جاتا ہے اور وہ عملے کو الٹی فہمائش کرتے کہ ارے بھئی انہیں کیسے روک لیا۔ استغفراللہ' ارے بھئی ان کو! ان سے کام پوچھتے ہو۔ ان سے تو ہمیں کام ہی کام ہیں۔ دیکھو ان کو کبھی مت روکنا۔

جوش صاحب نے ایک بار نجی طور پر کہا تھا کہ میں کسی شاعر پر رشک نہیں کرتا۔ رشک کے ذائقے ہی سے واقف نہیں ہوں۔ کس پر رشک کروں؟ لیکن وہ داد دینے میں بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔ دل کھول کر داد دیتے تھے۔ مذکورہ جملہ بھی ایک داد کے سلسلے میں تھا اور مجاز سے کہا تھا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے

یہ نظم میں نے کہی ہے "اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں": مجھ جیسے ناچیز کو بھی اُنہوں نے اپنے ایک مضمون میں اس طرح نوازا کہ "اردو کی نوک پلک سے وہ اس قدر واقف ہیں کہ ان کی سی لیاقت کا کوئی دوسرا آدمی آسانی کے ساتھ نہیں مل سکے گا۔" (حریت، کراچی ۱۳ مارچ ۱۹۶۹ء) حالانکہ اُن دنوں وہ مجھ سے سخت خفا تھے اور بورڈ سے علیحدہ ہو چکے تھے۔

آداب محفل کے ضمن میں آج کل کے آداب کی بھی ایک مثال قلم پر آگئی۔ بمبئی کی ایک محفل میں' میں نے اپنی یہ گیت نما غزل پڑھی ؎

اجل بن کے کبھی ہے جیتی عمریا
کو کب تک بچاؤ گے ہم سے بجریا

جب میں اس شعر پر پہنچا: ؎

یہی ہے جوانی کی تصویر اصلی
بڑے بوجھ ڈھوتی ہے دوہری کمریا

تو ہمارے ایک معروف آزاد نظم نگار شاعر نے (جن کے نام میں صنعت ملمع پائی جاتی ہے یعنی عربی میں فارسی کا پیوند) ایک قہقہہ لگایا اور فقرہ کسا جس کا مفہوم یہ تھا کہ شعر کو سن کر کسی لونڈے کی تصویر سامنے آتی ہے۔ جوش کے بارے میں اس قسم کی رکاکت کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔

کسی کا قول ہے کہ آدمی کے کردار کو جانچنا ہو تو یہ دیکھو کہ اس کا سلوک اپنے گھر والوں کے ساتھ کیسا ہے۔ یہاں میں پھر ممتاز حسن کا ذکر کروں گا۔ میری نظر میں ممتاز حسن اور جوش ملیح آبادی دو ہی آدمی ایسے ہیں جو اپنی بیگمات کے ساتھ واقعی عزت و احترام سے پیش آتے تھے۔ ممتاز حسن کی بیگم تو خود بھی بڑی مسکین اور نرم مزاج خاتون تھیں۔ جوش صاحب کی بیگم ان کو آڑے ہاتھوں لینا جانتی تھیں۔ وہ خواہ ان کو انگوٹھے کے نیچے نہ رکھ سکی ہوں، لیکن جوش صاحب نے کبھی ان کے سامنے لب نہ ہلائے ہوں گے۔ میرا خیال ہے جو لوگ اپنی بیویوں پر بہت شیر ہوتے ہیں ان کے اندر ضرور کوئی مردانہ کمزوری ہوتی ہوگی۔ جوش پورے مرد تھے بلکہ شیر مرد۔

اُن کی شیر مردی کا ایک واقعہ میرے دل پر نقش ہے۔ دوسری عالمی جنگ کا ابتدائی زمانہ تھا، دلی کے ایک بڑے مشاعرے میں جو سر رضا علی کی صدارت میں ہوا اور جس میں چیف کمشنر اور ڈپٹی کمشنر دونوں انگریز مگر بڑے فارسی داں اسٹیج پر موجود تھے، بڑی دیر سے سوئی سوئی غزلیں چل رہی تھیں کہ جوش صاحب کھڑے ہوئے اور بڑی للکار کے ساتھ اپنی وہ نظم شروع کر دی۔

اے ہند کے ذلیل غلامانِ روسیاہ!

مجمع اُچھل پڑا، محفل کا رنگ بدل گیا۔ وہ اشعار اور جوش کا جادو اثر انداز۔ ایسا لگتا تھا کہ بغاوت اسی لمحے یہیں سے پھوٹ پڑے گی اور خدا ان انگریزی حکام کی خیر رکھے۔

جوش صاحب فوراً یہ نظم پڑھ کر چل دیے۔ بعد میں سر رضا علی نے مجمع کو اپنی باتوں سے بہلایا اور [illegible] کہا کہ بعض شعرا موقع محل نہیں دیکھتے، یہ سیاسی نہیں ادبی محفل تھی۔

میرے بعض دوستوں کے ذہن میں یہ خلش ہے کہ جوش صاحب نے "یادوں کی برات" میں مجھے کچھ اچھے الفاظ میں یاد نہیں کیا۔ ان کی ملامت میرے سر آنکھوں پر۔ میں اسے آں مرحوم کی غلط فہمی ہی پر محمول کر سکتا ہوں، اور اس کا ذمہ دار بھی اپنے آپ ہی کو ٹھہراتا ہوں۔ میں نے اپنی دیرینہ ارادت، سچی خیر خواہی اور دس برس کی خدمت گزاری کی بنا پر اپنا حق سمجھا کہ بعض باتوں پر جن سے مجھے اور بہت سے اور لوگوں کو بھی، جن میں ان کے خیر خواہ بھی تھے، رنج پہنچا اور ناز یبا معلوم ہوئیں، برملا شکایت اور آزردگی کا اظہار کر دوں۔ بات یہیں تک رہتی تو کچھ نہ تھا۔ سوء اتفاق سے وہ معاملہ سرکاری سطح پر اٹھایا گیا اور طول پکڑ گیا۔ ہر چند کہ جناب ممتاز حسن اور میں نے اس کی روک تھام میں کسر نہ کی۔ لیکن ارباب حکومت کی دخل اندازی پر جوش صاحب کا معاہدہ ختم کرنا پڑا۔ اس سلسلے کی رسمی مراسلت بھی سکریٹری کی حیثیت سے مجھی کو کرنی پڑی۔

ترقی اردو بورڈ کراچی میں اشاعت کے لیے پہلے پہل جن کتابوں کے معیاری ایڈیشن تیار کئے گئے ان میں مولوی نذیر احمد کی مراۃ العروس اور منتخب الحکایات شامل تھیں۔ یہ بیگم شائستہ اکرام اللہ کی تجویز تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ کتابیں اردو کے ادب عالیہ میں ہیں اور ان کا مطالعہ ہماری خواتین اور بچوں کے لئے آج بھی مفید اور دلچسپی کا باعث ہوگا، نہ صرف زبان سیکھنے کے لئے بلکہ معاشرتی آداب کو جاننے کے لئے اور خانگی امور کی سمجھ بوجھ حاصل کرنے کے لئے بھی۔ انہوں نے خود اردو ناول پر پہلا تحقیقی مقالہ لکھا تھا اور وہ پہلی خاتون بلکہ پہلی اسکالر تھیں جنہوں نے لندن سے اردو میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔

منتخب الحکایات شاہد احمد دہلوی صاحب سے مرتب کرائی گئی تھی۔ مراۃ العروس کا مقدمہ بیگم شائستہ اکرام اللہ نے لکھا تھا۔ دونوں کتابیں چھپنے کے لئے تیار تھیں۔ میں نے ضروری سمجھا کہ انہیں جوش ملیح آبادی صاحب کے ملاحظے میں پیش کر دیا جائے کہ وہ مشیر ادبی تھے۔ خود بھی بڑے پابند اوقات، باقاعدہ زندگی گزارنے والے، سحر خیز، جم کر کام کرنے والے۔ میرا خیال تھا کہ وہ ان مرتب شدہ کتابوں کو ایک نظر دیکھ کر واپس کر دیں گے کہ بسم اللہ کرو۔ مگر وہ انہیں لے کر بیٹھ گئے۔ مجھے اس پر تعجب ہوا۔ پوچھا تو کہا، ہاں ہم دیکھ رہے ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ واقعی بڑی توجہ سے دونوں کتابوں کا اول سے آخر تک مطالعہ کیا ہے۔ مقدمے سے لے کر متن اور حواشی تک سرخ روشنائی سے اصلاح کا قلم چلا دیا ہے۔ میں نے کہا حضرت یہ آپ نے کیا کیا؟ کہنے لگے سنوار دیا ہے۔ میں نے کہا یہ تو مولوی نذیر احمد کی کتابیں ہیں ہم ان میں ترمیم کیسے کر سکتے ہیں۔ ایسے موقع پر ان کا بندھا ٹکا جملہ یہ تھا کہ نعوذ باللہ، اللہ میاں بھی کہیں تو یوں نہیں یوں ہونا چاہیے۔ انہوں نے نذیر احمد کی رواں دواں بول چال کی زبان کو اپنے رنگ میں رنگ دیا تھا۔ دونوں کتابیں بورڈ میں محفوظ ہوں گی۔ انہیں چھپ جانا چاہیے۔ مراۃ العروس کا نسخۂ جوش مزے کی چیز ہوگی۔ (اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ سب کو معلوم ہے۔)

ایک دن میرے پاس جوش صاحب کا پرچہ آیا کہ عزیزم میں ہندوستان جا رہا ہوں۔ میرے پیچھے میری تنخواہ منور عباس صاحب کو ادا کر دی جائے۔ میں نے جوش صاحب کا پرچہ صدر ادارہ ممتاز حسن صاحب کو بھجوا دیا۔

انہوں نے لکھا جوش صاحب کی ایک مہینے کی چھٹی منظور کی جائے۔

جوش صاحب چار مہینے بعد واپس آئے، مگر ان کی آمد سے پہلے یہاں ان کی بابت خبریں آنی شروع ہوئیں کہ وہ وہاں بیٹھ کر پاکستان اور قائد اعظم کی برائی کرتے ہیں۔ بعض اخبارات نے اس پر خاصی لے دے کی۔ ایک دن میرے پاس دو آدمی خفیہ پولیس کے آئے اور جوش صاحب کی بابت پوچھتے رہے کہ جی یہ کوئی جوش ملیح آبادی آپ کے ہاں کام کرتے ہیں۔ (بے چارے جوش صاحب سے بالکل ناواقف تھے) پوچھا ان سے ملنے کون کون آتا ہے۔ میں نے کہا مشہور آدمی ہیں۔ ان سے ملنے سبھی آتے ہیں۔ آپ مقصد بتائیں تو بولے "جی ہمیں تو کچھ نہیں معلوم اوپر سے پوچھا ہے۔" میں نے میاں ارشد حسین صاحب کو خط لکھا جو ان دنوں ہمارے ہائی کمشنر اور میرے بڑے مربی و مہربان تھے۔ انہوں نے لکھا کہ میں نے ڈپٹی ہائی کمشنر سے کہا ہے کہ ہم نے جوش صاحب کی بابت جو کچھ لکھا تھا، اس کی نقل آپ کو بھجوا دیں۔ اس نقل میں تو جوش صاحب کے خلاف کوئی بھی بات نہیں تھی۔ فقط اتنا تھا کہ اگرچہ اس موقع پر ان کی آمد ہمارے حسب منشا نہیں تھی، لیکن ہم نے ان کے اعزاز میں ایک مشاعرہ کیا۔ جس میں فلاں فلاں بھی مدعو تھے۔ کچھ ایسی ہی بے ضرر سی باتیں۔ غالباً اسی لئے وہ اقتباس مجھے بھیجا گیا تھا کہ ہم دیکھ لیں۔ ہائی کمیشن کی رپورٹ میں ایسی کوئی بات نہیں جیسی اخبارات میں چھپی ہوں گی۔

لیکن یہاں کے بعض لوگوں نے ہندوستانی اخبارات کے تراشے لا کر دیے اور ہندوستان سے آنے والوں نے کچھ باتیں سنائیں مثلاً اخبارات میں کچھ اس طرح کے خط چھپے کہ میں ایک محفل میں جوش صاحب کے قریب بیٹھا تھا۔ ان کی باتوں سے معلوم ہوا کہ وہ پاکستان میں بڑی گھٹن محسوس کرتے ہیں۔ اور وہاں ان کے ساتھ سلوک اچھا نہیں ہے۔ یہاں تو ان کو بڑا اعزاز حاصل تھا۔ بہت افسوس ہوا۔ کیا عجب کہ یہ خط دانستہ یہاں ان کے حق میں کانٹے بونے کے لئے چھپوائے گئے ہوں کیوں کہ کچھ بے مقصد سے معلوم ہوتے تھے۔ مگر خود انہوں نے اپنے حق میں کانٹے بونے میں کیا کسر کی تھی۔ ایک خاصا طویل انٹرویو ٹائمز آف انڈیا میں چھپا جس میں جوش صاحب سے یہ بیان منسوب کیا گیا تھا کہ پاکستان کا بننا ایک بڑی ٹریجڈی تھی۔ مجھے امید نہیں کہ میری زندگی میں یہ ممکن ہوگا۔ لیکن ایک نہ ایک دن دونوں ملک پھر ایک ہو جائیں گے۔ یہ بھی سنا کہ ایک محفل میں جوش صاحب نے صدر ایوب خاں کو "جابر و جاہل" آدمی کہا۔ بولے کہ مجھ سے کہتے تھے، جوش صاحب آپ تو بڑے عالم آدمی ہیں۔ عالم کو عالَم (ل پر زبر کے ساتھ) واللہ اعلم۔

جوش صاحب اپنے انقباض کا ذکر یہاں بھی کرتے تھے اور صاف کہتے تھے کہ وہ پاکستان بننے سے خوش نہیں تھے۔ اپنے بچوں کے مستقبل کی خاطر یہاں چلے آئے ہیں۔ ایک بار انہوں نے میرے سامنے کمشنر دربار علی شاہ کے منہ پر کہا کہ پاکستان کا بننا بڑی ٹریجڈی تھی۔ عجیب بات یہ کہ یہ تمہید تھی ایک سفارش کی جو وہ عیش ٹونکی صاحب کے کسی معاملے میں کرنا چاہتے تھے اور ان کو کمشنر صاحب سے ملوا رہے تھے۔ بولے "شروع سے چلوں گا بات یہ ہے کہ پاکستان کا بننا بڑی ٹریجڈی تھی۔" وہ ان کا بہت لحاظ کرتے تھے۔ سن کر بس اتنا کہا کہ جوش صاحب ایسی باتیں مت کیجئے۔ بات بتائیے کیا کہنا چاہتے ہیں۔

ایک دن میرے پاس وزارتِ تعلیم اسلام آباد سے وصی حسین حسینی صاحب سیکشن آفیسر کا ٹیلی فون آیا کہ سکریٹری صاحب پوچھتے ہیں کہ جوش صاحب کی شرائط ملازمت کیا ہیں۔ میں نے بتایا کہ ۱۰ر جنوری تک کا کنٹریکٹ ہے۔ سال بہ سال اس کی تجدید ہوتی ہے۔ پھر ٹیلی فون آیا کہ سکریٹری صاحب کہتے ہیں کانٹریکٹ کی تجدید نہیں کی جائے گی۔ میں نے اسی وقت ممتاز حسن صاحب کو اطلاع دی انہوں نے مجھے بلایا اور کہا یہ تو بہت غلط بات ہے۔ آپ لکھئے کہ معاہدے کی تجدید ضروری ہے۔ ہمارے پاس ان کے خلاف کوئی بات نہیں۔ حکومت کو بھی چاہئے کہ ادھر اُدھر کی باتوں کا نوٹس نہ لے کہ ہمارے کام کا نقصان ہوگا۔ بورڈ ہے تو اس میں جوش صاحب بھی ہوں گے وغیرہ وغیرہ۔ میں نے ڈرافٹ تیار کیا اور یہ سب باتیں لکھیں۔ خط ممتاز حسن صاحب کے دستخطوں سے گیا۔ وزارتِ تعلیم کے ریکارڈ میں ہونا چاہئے اور اس کی نقل میرے ڈرافٹ سمیت بورڈ کے دفتر میں ہوگی۔

بورڈ کی میٹنگ ۶ر جنوری کو رکھی گئی تھی جس میں معاہدے کی تجدید کا فیصلہ بھی ہونا تھا۔ وزارتِ تعلیم نے اپنے ایک افسر کو اس میٹنگ میں خاص طور پہ شرکت کے لئے بھیجا کہ ہم کوئی اور فیصلہ نہ کر بیٹھیں۔ ہم نے یہی لکھا کہ امید ہے حکومت کو اعتراض نہ ہوگا۔ ادارہ تقرر و تنزل کے معاملے میں خود مختار تھا لیکن بہرحال یہ ایک سرکاری ادارہ تھا۔ سکریٹری صاحب کا پیغام پہنچا کہ حکومت کی ہدایت ہے تجدید نہ کی جائے۔ ممتاز حسن صاحب خاص طور پر بہت رنجیدہ ہوئے چار دن بعد معاہدہ ختم ہو رہا تھا۔ یہ ناخوشگوار فریضہ غریب سکریٹری کو ادا کرنا تھا کہ جوش صاحب کو اس تلخ حقیقت کی اطلاع دے۔

جن دنوں یہ پریشانی لاحق تھی۔ میں نے جوش صاحب کے واپس آنے پر ان سے شکایت کی کہ آپ ناحق بے موقع بول کر اپنے آپ کو بھی اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی مشکل میں ڈال دیتے ہیں۔ میری ان سے ۱۹۲۲ء سے نیازمندی تھی اور ادھر دس برس بورڈ میں ساتھ رہا تو میں نے انہیں ہر طرح آرام پہنچانے اور خوش رکھنے کی کوشش کی تھی۔ میں سمجھتا ہوں مجھے ان سے کھل کر شکایت کرنے کا حق تھا۔ میں نے کہا آپ یہاں بیٹھ کر سب کچھ نہیں کہہ جاتے، سب سُن لیا جاتا ہے، لیکن باہر جا کر ایسی باتیں کرنا اور صدر کی ذات کو ہدفِ ملامت بنانا کسی طرح بھی زیبا نہیں تھا۔ انہوں نے تو آپ کی بڑے تپاک سے پذیرائی کی تھی۔ نظام کے سامنے تو آپ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہی رہ سکتے تھے۔ آدمی آپ سے پوچھ سکتا ہے کہ پھر آپ یہاں آئے ہی کیوں۔ جوش صاحب نے اس شکایت کا الٹا مجھی کو ماخوذ کیا۔ اپنی ملازمت سے سبکدوشی میں مجھے ملوث قرار دیا۔ اور میرے ساتھ الطاف گوہر صاحب کو بھی لپیٹا۔ جن کا اس معاملے سے دُور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ بات یہ تھی کہ اس وقت الطاف گوہر جنرل یحیٰی خاں کے معتوب اور نظربند تھے، ان کو اپنا مخاطب ٹھہرانا مفید مطلب ہو سکتا تھا۔ برطرفی کی ہدایت قدرت اللہ شہاب کی طرف سے آئی تھی جب وہ سکریٹری تعلیمات تھے۔ وہ یحیٰی خاں کے دور میں بھی برسرِ اقتدار تھے۔ ان کا نام نہیں لیا گیا۔ معلوم نہیں یہ سبق جوش صاحب کو کس نے پڑھایا ہوگا۔......

صرف ایک بار جب کہ میں محکمۂ مطبوعات و فلم سازی میں ڈپٹی ڈائریکٹر تھا، میں نے بابِ حکومت میں درخواست کی تھی کہ جوش صاحب کے ایک مرثیے کی فلم بندی کر لی جائے کہ اس فن کے وہ سب سے ممتاز نمائندہ ہیں تو وہ نوٹ وزارتِ اطلاعات کے سکریٹری الطاف گوہر صاحب کے پاس گیا تھا اور انہوں نے فوراً اس پر صاد کر دیا تھا۔ چنانچہ فلم بنی اور جوش صاحب نے افرادِ خانہ اور چند احباب کے ساتھ اُسے ملاحظہ فرما کر پسندیدگی کا اظہار بھی کیا تھا۔

اتفاق سے جوش صاحب نے میرے چچا ڈاکٹر کرنل اشرف الحق مرحوم کی بابت بھی جن سے برسوں ملاقات کاٹی رہی تھی اور گاڑھی چھنتی تھی بعض نجی صحبتوں کی ایسی باتیں لکھ دی ہیں جو ان کی اولاد کو بُری لگیں۔ میرا خیال ہے اس کا سبب بھی جوش صاحب کی آزردگی تھی جو ڈاکٹر صاحب مرحوم کی ایک بات سے پیدا ہوئی ہوگی۔ میں اس کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا کہ یہ ان کے باہمی معاملات تھے۔ ڈاکٹر صاحب معروف بذلہ گو، فقرے بازی میں طاق اور آدمی کو "بنانے" میں ماہر تھے۔ اس میں کلام نہیں کہ جوش صاحب بڑے دل اور بڑے ظرف کے آدمی تھے، لیکن ظاہر ہے کہ وہ شاعر تھے اور ذکی الحس انسان ذہنی پریشانی اور ایک اضطرابی کیفیت میں ان کے قلم کا لغزش کر جانا نظرانداز کرنے کے قابل ہے۔ میرے لئے یہی بات کافی ہے کہ فوراً ہی ان کا دل میری طرف سے صاف ہو گیا تھا۔ ہمیشہ گلے ملتے تھے اور میرے لئے وہ کلماتِ خیر ہی بہت بڑا اعزاز ہیں جو انہوں نے میری بابت لکھے اور اخبار میں شائع ہوئے۔

یہ ذکرِ جمیل کبھی ختم نہ ہوگا۔ بہت سی باتیں ہیں کچھ گفتنی کچھ ناگفتنی جو شاید سینہ بسینہ ہی چل سکیں گی۔

بات وہیں ختم کرتا ہوں جہاں سے چلی تھی۔ ایک بار دلّی کے ایک مشاعرے میں دعوت دینے کے لئے حکومت کے کچھ افسران جوش صاحب کو مدعو کرنے کے لئے آئے اور چلتے چلتے یہ بھی کہہ گئے کہ جوش صاحب' وہاں خواتین بھی ہوں گی' ذرا خیال رکھیں۔ اس پر جوش صاحب کا بھڑک اٹھنا لازمی تھا۔ بولے: "آپ کیا سمجھتے ہیں۔ میں نے شائستہ صحبتیں نہیں دیکھی ہیں۔ خواتین سے برتاؤ کرنا نہیں جانتا۔ مجھے کبھی مہذب خواتین سے سابقہ نہیں رہا۔ میں خواتین کی ہم جلیسی کے لائق نہیں ہوں' میں خواتین کی .... ایسی تیسی کر دیتا ہوں!"

واضح رہے کہ اس وقت کوئی خاتون وفد میں موجود نہ تھی۔ یہ جوش صاحب تھے جو ایک کھڑتل آدمی کو اسی کے لہجے میں جواب دے رہے تھے، جو ان کے شائستہ آداب سے واقف نہ تھا۔ اگرچہ یہ آداب اُن کی فطرت میں رچے ہوئے تھے۔

جوش کے کچھ خطوط

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر اور شنکر پرشاد کے نام

ڈاکٹر خلیق انجم

مجھے ہمیشہ یہ احساس رہا ہے کہ جوش صاحب کے ساتھ ہمارے نقادوں نے وہ انصاف نہیں کیا جس کے وہ مستحق تھے۔ اس کی غالباً وجہ یہ بھی ہے کہ غالب کی طرح جوش بہت بڑے شاعر تھے۔ لیکن ان کی شخصیت میں بعض ایسی خرابیاں تھیں جنہیں لوگ پسند نہیں کرتے تھے اور یہ خرابیاں نظریاتی زیادہ تھیں، لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ وقت ضرور آئے گا جب جوش کی عظمت کا کھلے دل سے اعتراف کیا جائے گا۔

میں نے جوش صاحب کے لگ بھگ چار سو پانچ سو غیر مطبوعہ خطوط بھی اکٹھا کئے ہیں۔ ان خطوط کی کتابت ہو چکی ہے۔ کچھ خطوط پر حواشی اور کتاب پر مقدمہ لکھنا باقی ہے۔ ان ہی خطوط میں سے میں کنور مہندر سنگھ بیدی سحر اور شنکر پرشاد صاحب کے نام جوش کے کچھ خطوط پیش کر رہا ہوں۔

جوش ملیح آبادی صاحب کا بلامبالغہ ہزاروں لوگوں سے تعلق رہا تھا۔ ان میں ایسے لوگوں کی خاصی بڑی تعداد تھی جن سے جوش صاحب کو غیر معمولی قربت حاصل تھی۔ جب جوش اپنی خود نوشت سوانح "یادوں کی برات" لکھنے بیٹھے تو کچھ لوگوں کا ذکر بہت اچھے لفظوں میں کیا۔ کچھ کا سرسری طور پر کر دیا اور کچھ کی شخصیت یا اس کے فن کے بارے میں مخالفانہ رائے دی۔ ساغر نظامی صاحب سے جوش کے بڑے قریبی تعلقات تھے۔ کئی سال تک بمبئی میں یہ دونوں ایک ہی عمارت کے مختلف کمروں میں رہتے تھے۔ پھر بھی ساغر صاحب کے بارے میں جوش صاحب کی رائے اچھی نہیں تھی۔ انہوں نے یادوں کی برات میں کہیں کہیں سرسری طور پر ساغر صاحب کا ذکر کیا ہے اور وہ بھی اچھے لفظوں میں نہیں کیا۔

جوش ملیح آبادی مرحوم، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کے بہترین دوستوں میں تھے۔ انہوں نے خلوت اور جلوت دونوں میں کنور صاحب کو دیکھا تھا اور اتنی کثرت اور اتنے قریب سے دیکھا تھا کہ کنور صاحب کی کوئی خوبی اور خرابی ان کی نظر سے چھپ نہیں سکتی تھی۔ جوش صاحب شمشیر برہنہ تھے۔ جس شخص کے بارے میں ان کے جو تاثرات تھے، انہوں نے یادوں کی برات میں بے کم و کاست اور بے خوف و خطر بیان کر دئے۔ انہوں نے پاکستان اور پاکستانی حکام کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا تھا، اس کی سزا مرتے دم تک پائی۔ اس مرد حق گو نے "یادوں کی برات" میں کنور صاحب کے بارے میں جو لکھا ہے۔ اس کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

"(کنور صاحب کے) جدِ اعلیٰ تھے گرو نانک جنہوں نے سکھ مت کی اس نیت سے طرح ڈالی تھی کہ ہندو اور مسلم کی دوئی مٹا کر اس میں وحدت پیدا کر دیں اور دو کو ایک بنا دیں، لیکن تاریخ کا یہ ایک بڑا المیہ ہے کہ وہ دو کو ایک نہیں بنا سکے اور ان کی نیت کے علی الرغم سکھوں کے اضافے کے بعد دو کے تین بن گئے۔ ـــــــ "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"۔ لیکن ان کی تمنا ان کے پنچے کنور مہندر سنگھ بیدی نے پوری کر دی۔ جن کی ذات میں ہندو، مسلم اور سکھ۔ یہ تینوں گروہ مدغم ہو کر ایک اکائی کے سانچے میں ڈھل چکے ہیں۔"

کنور صاحب کی خود نوشت سوانح عمری "یادوں کا جشن" کے لئے جوش صاحب نے اپنے تاثرات قلمبند کئے تھے۔ ان تاثرات کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے:

"میں بڑی دیانت داری کے ساتھ کہتا ہوں کہ جب دنیا کے دو پاؤں پر چلنے والے اربوں درندوں کے درمیان جن کو دھوکے سے آدمی سمجھا جاتا ہے، بیدی صاحب کے سے انسان کو دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ اس ہولناک ماحول میں بیدی صاحب کا سا انسان کیوں کر پیدا ہو گیا۔ ہونہ ہو یہ روزگار کا ایک عظیم اعجاز ہے۔ ان کا کاسۂ سر اس قدر موزوں ہے کہ تاجِ انسانیت اس پر ٹھیک منطبق ہو جاتا ہے نہ ڈھیلا ہوتا ہے نہ تنگ۔"

جوش صاحب نے کنور صاحب کا سوانحی خاکہ مختصر ترین لیکن بہت جامع اور مکمل انداز میں ان الفاظ میں پیش کیا ہے: "سانولے سلونے دراز قامت، وسیع القلب، متناسب الاعضاء، شگفتہ جبین، وضع دار، خوش فکر، بلند حوصلہ، شعر اپرور، دوست پرست، دشمن نواز، بھیجے کے کھابچوں کے باوصف خوش گفتار اور داڑھی کے باوجود خوب صورت انسان۔"

انجمن ترقی اردو، اردو گھر، راؤز ایونیو، نئی دہلی

"یادوں کی برات" کی اشاعت کے کچھ سال بعد کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے "یادوں کے جشن" کے نام سے اپنی خود نوشت سوانح حیات لکھی تو اس میں جوش صاحب کا ذکر ان الفاظ میں کیا :-

"وائے تقدیر! افسوس صد افسوس خامہ بد دہن کہ آج مجھ بدنصیب کو اس تابندہ و درخشندہ و زندہ جوش کو مرحوم لکھنا پڑ رہا ہے۔ کلیجہ منہ کو آ رہا ہے۔ آنکھ سے سیل رواں جاری ہے۔ ایک ایک لمحہ، ایک ایک نقش وہ گراں بن کر مجھ پر ٹوٹ پڑا ہے۔ دل جذبات سے لبریز ہے، لیکن زبان اظہار سے قاصر —— یوں محسوس ہو رہا ہے کہ اس نظام شمسی سے آفتاب یکسر غروب ہو گیا۔ اب تا قیامت اندھیرا ہی اندھیرا رہے گا۔ وہ پیر مغاں جس پر لاکھوں زاہد قربان۔ وہ رند مست جس پر ہزاروں واعظ نچھاور ...... میں اس قدر غم زدہ ہوں کہ قلم نہیں اٹھتا۔"

کچھ خطوط ملاحظہ ہوں :

۶ر اپریل ۱۹۵۱ء

محترمی کنور صاحب، آپ خود انصاف اور دیانت داری پر نگاہ کر کے غور کریں کہ اگر کوئی صاحب :

۱۔ مجھے اصرار کر کے ٹھہرائیں۔
۲۔ مجھے دفتر سے رخصت لینے پر مجبور کریں۔ جس سے میری تنخواہ کے اضافے پر اثر پڑ گیا ہے۔
۳۔ مجھ سے سات آٹھ گیت لکھائیں۔
۴۔ اُن گیتوں میں بار بار ترمیم کرائیں۔
۵۔ میوزک ڈائریکٹر وغیرہ سب مل کر ان گیتوں کو منظور و قبول فرمالیں۔
۶۔ اور چلتے وقت گیت لکھانے والے صاحب یہ کہیں کہ وہ گیتوں کا معاوضہ آٹھ روز کے بعد دہلی آ کر ادا کر دیں گے۔ اور ان تمام مرحلوں کے بعد پھر وہی صاحب جب معاوضہ اُن سے طلب کیا جائے تو آپ کو چپکے سے یہ لکھ دیں کہ وہ گیت استعمال نہیں کر رہے ہیں۔

اگر یہ بات انصاف اور ایمان کے مطابق ہے، تو بے شک میں معاوضے کا طالب نہیں ہوں —— اور اگر یہ نا انصافی ہے تو —— جانے بھی دیجئے۔ مطالبے سے دست بردار ہو کر میں معاف کرتا ہوں۔ چلئے قصہ ختم ہوا——

زندگی میں بھی کتنے تلخ تجربے ہوتے رہتے ہیں۔ مکھن لال صاحب کو میرا سلام ضرور لکھ دیجئے، ماشاء اللہ۔

نیاز مند
جوش

۱/۷۰
دی مال، شملہ
۱۰ر جون ۱۹۵۴ء

بیدی صاحب راج دُلارے
بھولے بھالے پیارے پیارے
نین تمہارے رس کے دھارے
جن میں کوئی کا جل پارے
دھرتی ماتا بوجھ سہارے
شملہ تم پر جی کو وارے
ٹہلو آ کر ساتھ ہمارے
بیدی صاحب راج دُلارے
بھولے بھالے، پیارے پیارے

چٹھی ہے یہ جوش پیا کی
جو نوری ہے، گو ہے خاکی

اُردو منزل، جمشید روڈ، کراچی ۲۹
۳ر مارچ ۱۹۶۲ء

اشد ضروری کا بھی جدا مجد

بندہ نواز، مشاعروں کی شرکت کو اپنے واسطے ننگ سمجھتا ہوں، لیکن اس کا کیا علاج کہ کمبخت مشاعرے ہی کی بدولت بچھڑے دوستوں سے ملاقات کا موقع مل جاتا ہے۔

اس لئے آپ سری رام والے مشاعرے کے واسطے میرے پاس دعوت نامہ بھجوائیے (کرائے کے علاوہ ایک ہزار) اور عیش صاحب ٹونکی کو بھی بلوائیے (کرائے کے علاوہ ڈھائی سو)

گزشتہ سال سری رام والے مشاعرے میں صرف ایک ہزار مع کرایہ دیا گیا تھا جس پر میں نے مہتمم مشاعرہ سے کہہ دیا تھا کہ آئندہ میں اس رقم کے ساتھ شریک نہیں ہوں گا۔

ابھی اور بھی بہت کچھ لکھنا تھا کہ ایک ضروری کام کا فون آ گیا، اس لئے فوراً باہر جا رہا ہوں۔

آپ کا پرستار
جوش

ذرا شنکر صاحب سے بھی اس مسئلے میں بات کیجئے گا۔

پیارے کنور صاحب، آپ کے دل سے لکھے ہوئے خط کا جواب آج لکھ رہا ہوں۔ آپ نے میرا کوئی کام نہیں کیا۔ حالاں کہ آپ سے اس قدر بے پروائی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

بہر حال میں فروری میں آنے کا قصد کر رہا ہوں۔ اگر خدا نہ خواستہ زندہ رہا تو آپ کے دیدار سے شاد کام ہوں گا۔

آپ کا چاہنے والا :
جوش مرحوم

۱۰ر نومبر ۱۹۶۷ء اسلام آباد

شنکر پرشاد صاحب دہلی کے چیف کمشنر تھے اور شعر و شاعری کے دلدادہ ہیں۔ جوش ملیح آبادی کے خاص دوستوں میں ہیں۔ بلکہ مربی ہیں۔ جوش ملیح آبادی صاحب کو اُن کی ذات سے بہت فائدہ پہنچا۔ لیکن نہ جانے کیوں "یادوں کی برات" میں جوش صاحب نے بہت معمولی معمولی سے لوگوں کا ذکر تو کیا لیکن شنکر پرشاد صاحب کا نام اُن کے ذہن سے اتر گیا۔ بہر حال شنکر پرشاد صاحب

بڑے سیکولر آدمی ہیں ۔ بہت اچھی اُردو جانتے ہیں اور اُردو زبان اور اردو شاعری کے عاشق ہیں ۔ ان ہی کی کوششوں سے دہلی میں کئی شاندار انڈوپاک مشاعرے منعقد ہوئے ۔ ان کے بارے میں کنور مہندر سنگھ بیدی سحر صاحب نے اپنی خودنوشت سوانح عمری "یادوں کا جشن" میں لکھا ہے :

"تقسیم وطن کے وقت آپ اجمیر کے چیف کمشنر تھے اور پھر دہلی تعینات کر دیے گئے ۔ میں ان دنوں دہلی کا سٹی مجسٹریٹ تھا ۔ میں ان سے پہلے کبھی نہیں ملا تھا اور جب پہلی بار ملا تو یوں محسوس ہوا کہ وہ میرے بارے میں لاعلم نہیں ہیں ۔ فرائض منصبی کی ادائیگی میں مجھے ان سے ہر دوسرے تیسرے دن ملنا ہوتا تھا ۔ ان دنوں مہاجرین دہلی میں کثیر تعداد میں وارد ہو چکے تھے اور ان کی بحالی کا مسئلہ ایک بڑی اہمیت اختیار کئے ہوئے تھا ۔ مہاتما گاندھی زور دے رہے تھے کہ جن مساجد اور دوسری عمارتوں اور عبادت گاہوں پر مہاجرین نے قبضہ کر لیا ہے وہ فوراً خالی کرائی جائیں اور ان بیچاروں کو سر چھپانے کے لئے بھی جگہ نہیں مل رہی تھی ــ مگر ان تمام مشکلات کے باوجود شنکر پرشاد جی نے بڑی محنت اور ہمدردی سے اس مشکل کو حل کیا ۔"

شنکر پرشاد صاحب الحمدللہ حیات ہیں وہ چیف کمشنری کے عہدے سے سبکدوش ہو کر دہلی کے حوض خاص کالونی میں اپنے بنگلے میں مقیم ہیں ۔ معمّر ہونے کی وجہ سے اب صحت جواب دے گئی ہے ۔ گھر سے بہت کم نکلتے ہیں ۔ شنکر صاحب کے نام جوش صاحب کے تیس چالیس خطوط ہیں جو محترمہ ممتاز مرزا کے توسط سے مجھے ملے ہیں چند خطوط ملاحظہ ہوں :-

۲۷-۱۰-۱۹۴۸ء

محترمی

۔ میں نے آپ کی خدمت میں درخواست دی تھی کہ میرے مکان میں جو قمقمے بلب ہیں ، براہِ کرم "بدستور قائم رکھا جائے" لیکن اس درخواست کا جو حشر ہوا وہ منسلک مراسلے سے آپ کو معلوم ہو جائے گا ۔

وہ شخص جو اپنے قلم سے اپنے ملک میں روشنی پھیلانے کی تقریباً نصف صدی سے کوشش کر رہا ہے ، اُسے آزاد ہندوستان میں یہ دھمکی دی جا رہی ہے کہ تیرے مکان کی بجلی تین روز میں منقطع ہو جائے گی ۔ کیا یہ عبرت کا مقام نہیں ؟

ظلم کے طوفان ہیں نا قدریوں کی لہر ہے
شاعرِ ہندوستاں ہونا خدا کا قہر ہے

نیازمند
جوش

بہت اچھا کٹوا دیجیے میرے گھر کی بجلی ۔ یہ آپ کی کمشنری کا کارنامہ یاد رہے گا ۔

۱۰-۳-۱۹۴۹ء

بندہ پرور ۔

آپ نے مہربانی فرما کے میرے بھائی کی لائسنس کی درخواست منظور فرمائی ۔ یہ مجھ پر بڑا کرم کیا ۔ کہاں تک آپ کی اس نوازش کا شکریہ ادا کروں ، شکریہ یہ ایک ایسی رسمی چیز بن چکا ہے کہ شکریہ ادا کرتے شرم آتی ہے ۔ لیکن یقین فرمایئے کہ ہم اہلِ خرابات کبھی اور کسی عالم میں بھی رسوم کے پابند نہیں ہو سکتے ، اور جب ہماری زبان سے کوئی لفظ نکلتا ہے ، وہ زبان ہی سے نہیں ، دل سے بھی نکلتا ہے ۔

آپ کا مخلص
وہی آوارۂ کوئے بُتاں
جوش

۱۱-۷-۱۹۴۹ء

شفیقی !

کچھ اوپر ایک ہفتہ گزر گیا ، یہ خیال کرتے ہوئے کہ آپ کی خدمت میں خط لکھوں ۔ ہجوم نے فرصت ہی نہیں دی ، بہرحال اگر صبح کا بھولا شام کو آ جائے تو اُسے بھولا نہیں کہتے ۔ میری اس تحریر کو بھی اسی طرح کی ایک چیز خیال فرمایئے ۔

بات چھوٹی ہو یا بڑی ، حساس دلوں پر بے حد اثر کرتی ہے اور بات کا "چھوٹا" "بڑا" ہونا صرف ایک اضافی Relative بات ہے ۔ اثرات میں کم و بیش تمام چیزیں اہمیت رکھتی ہیں ۔

آپ نے میرے بنگلے کے کارنش ہول کو بجلی بھی عطا فرما دی ، اس سے قبل مجھے پسٹل کا لائسنس مرحمت کیا اور میرے چھوٹے بھائی کو بھی لائسنس دیا ۔

اس لئے میرا فرض ہے کہ میں آپ کا نہایت گرم جوشی کے ساتھ شکریہ ادا کروں ۔ ہم رندانِ خرابات دکھاوے کی رسمی باتیں نہیں کیا کرتے ۔ اس لیے میرے شکریے کو حقیقی اور پائدار شکریہ سمجھیے ۔

لگے ہاتھوں یہ بھی عرض کر دوں کہ میں آئی سی ایس طبقے کا سخت مخالف ہوں ۔ اس لیے کہ سیاسی اور اخلاقی دونوں حیثیتوں سے میں نے اس طبقے کے افراد کو غدار و بے ادب پایا ہے ، لیکن جب میں آپ کو دیکھتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ شیطانی کارخانے سے آپ کا سا فرشتہ کیوں کر پیدا ہو گیا ۔ آپ کو اپنی شرافت پر ناز کرنا چاہیے ۔

نیازمند :
جوش

۹-۵-۱۹۵۰

کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی

مجھے صاف جواب آ گیا آپ کی بارگاہِ عالی سے کہ کچھ روشنی کے پوائنٹ کم کرو تو پاور دی جائے یعنی آنکھیں گنواؤ تو برقی لہر پاؤ ۔ یہ سب آپ کے شرطاً صاحب کی بندہ پروری ہے ۔

"ناصاحب میں باور سے باز آیا ۔ میں اپنے گھر کے فُدر پر ریلفری جوہر کے سرور کو ترجیح نہیں دے سکتا ۔ لگے ہاتھوں یہ نظم پڑھ لیجیے ، جو اسی سلسلے میں پانچ منٹ کے اندر قلم سے بے ساختہ ٹپک پڑی ہے ۔

ذرا قانونوں کی چادر دیکھئے گا ۔ بیاد تو آپ کر ہی چکے اب داد بھی دے دیں ۔

"تو بڑی دل نوازی، بڑی مہربانی"

فریاد نامہ

مانگ پاؤڈر کاٹ آدھے بلب
واہ کیا کیا ملے کرم فرما
حیف مانگا جو برف کا صندوق
وہ دکھانے لگے مجھے گرما
ٹاٹ کا ٹوپ سامنے رکھا
جب کہ میں نے طلب کیا نرما
چاہتے ہیں مجھے نہ حاصل ہو
لطفِ گرما نہ عشرتِ سرما
مانگتا ہوں جو میں کلی ان سے
وہ دکھاتے ہیں دُور سے برما
ان کو بھاتی نہیں مری پرواز
چاہتے ہیں کروں میں پیکرما
مجھ پہ بجلی گرا کے ہنستے ہیں
جن میں K.K بھرا ہے وہ شرما!

جوش مرحوم

۱۲-۵-۱۹۵۰ء

حضورِ والا صفات نامہ حاضر ہے۔

بہت شکر گزار ہوں گا اگر جنابِ عالی مجھ مُردۂ صد سالہ کے باب تصدیق فرما دیں گے کہ یہ بدبخت اس دنیائے دَنی کے شدائد برداشت کرنے کے لیے بدقسمتی سے ابھی تک زندہ ہے۔ ہر چند زندہ در گور سہی۔ "اللہ" آپ کا بھلا کرے گا اور یہ بندہ شکر گزار رہے گا۔

کیا مختصر جواب یہ ہوتا کہ مر گیا۔

وہی آوارۂ کوئے بتاں
جوش

۲۴-۱-۱۹۵۱ء

میرے کرم گستر

کوئی دو تین دن کی بات ہے کہ ساحلِ جمنا پر میں حسبِ دستور عبادتِ سحر میں مشغول ٹہل رہا تھا کہ پشت کی جانب سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز آئی۔ جب سوار قریب آ کر ٹھہر گئے تو میں نے انتہائی شوق سے اس امید میں آنکھیں اُٹھائیں کہ آپ کا رخِ زیبا دیکھوں گا، لیکن چودھری صاحب کے چہرے پر نظر پڑی۔ میری مایوسی کو دیکھ کر وہ فرمانے لگے کہ آپ کے دوست آج کسی اور طرف نکل گئے ہیں۔ آپ اُن کی غیر حاضری پر چند شعر ضرور کہیں۔ چنانچہ چند شعر حاضر ہیں، جو میرے دل کی آواز ہیں:

ہزار حیف کہ ساحل پہ آج وقتِ سحر
فضا ملول تھی، دریا بھی خوش گوار نہ تھا
جو سر میں گونج اُٹھے وہ نہ تھی صدائے چمن
جو دل کو موہ لے وہ رنگِ سبزہ زار نہ تھا
جو وردوں کو جگاتا ہے صبح کے ہنگام
وہ لطفِ نغمۂ مرغانِ شاخسار نہ تھا
اُفق کی گود میں بھی نہ تابِ روئے حبیب
صبا کی لہر میں بھی عطرِ زلفِ یار نہ تھا
مرے ندیم مجھے کچھ خبر بھی ہے اس کی
کہ آج باغ میں کیوں حسنِ برگ و بار نہ تھا
سبب یہ ہے کہ گلستاں میں آج وقتِ سحر
گلوں کو ناز ہے جس پر وہ گل عذار نہ تھا
ہزار حیف کہ حلقے میں شہسواروں کے
فقط ہے جس پہ مرا دل وہ شہسوار نہ تھا

بندۂ مدہوش
مرحوم جوش

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا!

۱۲-۹-۱۹۵۱ء

چھوڑ جاتا ہے جو وہ گھر میں اکیلا مجھ کو
در و دیوار سے رونے کی صدا آتی ہے

میرے دل نواز و چارہ ساز، آپ خیر سے، کشمیر چلے گئے، اور میرے واسطے بھری پُری دلی سُونی ہو کر رہ گئی۔ آپ کے بغیر یہ راجدھانی ایسی نظر آ رہی ہے جیسے کسی حسین کی نتھ اُتر گئی ہو۔

آپ تو جنت میں ہیں، سو آپ تصور نہیں کر سکتے کہ ایک نامراد دوزخی آپ کو کس بُری طرح یاد کر رہا ہے۔

میرے محترم دوست، اگر خدا ہوتا تو میں اُس کا واسطہ دے کر آپ سے کہتا کہ خدا کے واسطے پلٹ آئیے، جلد پلٹ آئیے۔

خوب جانتا ہوں کہ آپ وقت سے پہلے ہرگز نہیں آنے کے۔ اس صورت میں اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں کہ آپ سے یہ خواہش کروں کہ براہِ کرم، اپنی خیریت، اور حالاتِ سفر ہی سے مطلع فرمائیے۔

مجھے یقین ہے کہ میری بچوں کی موجودگی میں "خدا کے فضل سے" آپ کا یہ سفر خوش گوار ثابت نہیں ہوگا اور چونکہ میں دلی پڑا ہوا ہوں، مجھے اس تصور سے خوشی ہو رہی ہے کہ آپ بھی وہاں خوش نہیں ہوں گے، اور جائیے تنہا۔

ہم بھی کائے یار ہیں کالا

آپ کے جواب کا امیدوار
دہلی جوش بادہ خوار

۸-۸-۱۹۵۱ء

سنیے حضورِ والا - بدقسمتی اس کا نام ہے۔ کشمیر جانے سے پہلے آپ نے وعدہ کیا تھا کہ میرے بیٹے کو "بار" کا لائسنس عطا فرما دیں گے۔ آج معلوم ہوا کہ وہ لائسنس آپ نے کسی اور کو عطا فرما دیا — میں اپنے کو اس خوش قسمتی کے موقع پر جان و دل سے مبارکباد دیتا ہوں۔

مبارک ہو جوش صاحب قبلہ، آپ کے پیارے دوست شنکر پرشاد صاحب

نے آپ کے بیٹے کو دنیا میں اس لیے چھوڑ دیا کہ وہ آپ کے انتقال فرما جانے کے بعد ٹھوکریں کھاتا پھرے۔ خطا معاف، جوش صاحب! اب تو آپ ماشاءاللہ بڑے ہی اطمینان کے ساتھ انتقال فرمائیں گے۔
برادر شنکر پرشاد جی کی جے!

۱۱-۱۲-۱۹۵۱ء

ہم سے کتنے ہی تری راہ میں برباد رہے
تُو سلامت رہے، کوچہ ترا آباد رہے

بندہ پرور، شکایت اس بات کی نہیں ہے کہ ہری چند اختر کی جگہ راجندر ناتھ شیدا کا تقرر کیوں کیا گیا اور اس کی دو وجہیں ہیں ایک تو یہ کہ آپ میری سفارش کے پابند نہیں۔ آپ کو اختیار حاصل ہے کہ جسے چاہیں رکھیں۔ اور جسے چاہیں نہ رکھیں۔ میں کون ہوتا ہوں جو دخل دوں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ شیدا صاحب بھی میرے دوست اور لائق آدمی ہیں۔ میں خود اُن کے واسطے کئی جگہ کوشش کر چکا تھا اور اب اس خیال سے خوش ہوں کہ وہ برسرِ روزگار ہو گئے ہیں۔

لیکن مجھے آپ سے اس بات کی بے حد شکایت ہے کہ آپ نے شیدا صاحب کے تقرر کے وقت مجھے طلب کر کے یہ نہیں سمجھایا کہ آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ اگر آپ ایسا کرتے تو ظاہر ہے کہ میں شیدا صاحب کی مخالفت تو ہرگز نہیں کرتا لیکن میرے دل کو اس خیال سے بڑی تسکین ہو جاتی کہ آپ نے مجھے بھی اپنا ایک نیازمند سمجھا۔ ایسا نیازمند جس کی تھوڑی بہت رعایت کی جاتی ہے۔

مجھے آپ سے بہت محبت ہے۔ اس لئے نہیں کہ آپ چیف کمشنر بہادر ہیں، بلکہ اس لئے کہ میں نے آپ کو ایک ایسا انسان پایا ہے جو اس زمانے میں کہیں دُور دُور بھی نظر نہیں آتا اور اپنی اسی محبت کی بنا پر میں آپ کی ذات پر اپنا یہ حق سمجھتا ہوں کہ آپ مجھ سے محبت نہ کرتے ہوئے بھی کوئی ایسی بات نہ کریں جس سے میرا دل ٹوٹ جائے۔ لیکن افسوس کہ آپ نے میرے دل کو توڑ دیا۔ خیر سلامت رہیے۔

ساجن، دردین ٹوٹ گیا!!

پھر بھی آپ کا شیدائی:
جوش

۱۷-۱-۱۹۵۲ء

میرے محبوب کرم فرما،
ہری چند اختر ایم اے کے باب میں پھر عرض کرتا ہوں کہ آپ کی مہربانی کی اُمید میں وہ ایک مدّتِ دراز سے رخصت پر ہیں۔ لیکن اب اُن کی رخصت بارہ دن کی اور باقی رہ گئی ہے۔

پس ان بارہ دنوں کے اندر اندر اگر آپ کی چشمِ کرم اُن کی طرف اُٹھ جائے تو بڑی عنایت ہو۔

ورما صاحب کہتے ہیں کہ وہ اختر صاحب کو انفارمیشن میں جلد لے لیں گے۔ یہ آپ کے علم میں آ جانا اختر صاحب کے حق میں بہت مفید ہے کہ اختر صاحب گورنمنٹ آف انڈیا میں انفارمیشن افسر رہ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ سات آٹھ برس تک حکومتِ ہند میں گزٹیڈ آفیسر کی حیثیت سے سات آٹھ سو روپے ماہانہ پر بہ خیر و خوبی کام کر چکے ہیں۔

اس لئے آپ کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ میں آپ کے روبرو خالص عربی گھوڑا لا رہا ہوں۔ خچر کو پیش نہیں کر رہا ہوں۔ سمجھے حضورِ والا؟
اب بھی آپ نہ سمجھیں تو خدا مجھ سے سمجھے

نیاز کوش
جوش

اب رہا میرے لڑکے کے پرمٹ کا سوال، جو مجھے جینے کی اُمیدواری کے بعد نااُمیدی میں بدل گیا اس کے متعلق زیادہ نہیں لکھوں گا۔ وہ آپ کا بچّہ ہے، آپ چاہیں نوازیں، چاہیں نہ نوازیں۔

۲۵-۳-۱۹۵۲

میرے محبوب اور میرے محسن، کاش آپ کو بھول جانے کی عادت نہ ہوتی۔ قدرت نے آپ کو کس درجہ شریف انسان بنایا ہے۔ آپ کو کس قدر خوبیاں بخشی ہیں۔ آپ کی فطرت کو کتنا حیرت ناک حُسن و جمال عطا فرمایا ہے۔ لیکن ان تمام قابلِ پرستش صفتوں کے ساتھ ساتھ آپ کو بھول جانے کا مادہ بھی دے دیا ہے۔ جس سے بنے بنائے کام بگڑ جاتے ہیں اور ہونے والے کام ہوتے نہیں۔

میرے ولی عہد بہادر کے پرمٹ ہی کو لے لیجیے۔ ڈیڑھ برس سے اُمیدواری کر رہا ہوں اور اسی اُمید میں جی جی کر مر رہا ہوں۔

آپ نے ہونہ ہو، شاید دل ہی دل میں یہ امر طے فرما لیا ہے کہ جس روز میں انتقال فرما جاؤں گا اُس کے عین تیسرے دن آپ میرے یتیم بیٹے کو پرمٹ دے کر اُس کے غم اور نقصان کی تلافی کر دیں گے ـــ بہت اچھا، اگر یہی مرضی ہے سرکار کی، تو یہ بندۂ ناچیز اور یہ آپ کا چاہنے والا انشاءاللہ باقی ایڑی چوٹی کا زور لگا دے گا اس امر میں کہ جلد سے جلد انتقال فرما جائے۔

کہا جو جینے کو، جی اُٹھے ہم کہا جو مرنے کو مر گئے ہم
اب اور کیا چاہتا ہے ظالم ترے اشاروں پہ چل رہے ہیں

بندۂ درگاہ
جوش مرگ خواہ

سبحان اللہ سبحان اللہ
اور نکلے ہوئے ہیں ہری چند اختر بھی ماشاءاللہ

۳-۲-۱۹۵۴ء

حضرت سلامت! مخلصانہ صاف گوئی، تمام اچھی باتوں کی طرح اگر اب تک ایک ناروا ناجائز بات قرار نہیں دے دی گئی ہے تو مہربانی فرما کر مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت مرحمت فرمایئے کہ آپ نے کل ریڈیو کے مشاعرے کی صدارت سے انکار فرما کر میرے دل کو آزار بھی پہنچایا اور ریڈیو والوں کے روبرو، جنہیں یہ یقین تھا کہ آپ خصوصیت کے ساتھ میری اس ذرا سی درخواست کو ٹھکرا ہی نہیں سکتے، مجھے بے آبرو بھی کیا۔

آپ سے اس قدر بے مروتی اور رکھائی کا اندیشہ نہیں تھا۔ خیر اچھا کیا جو کچھ کیا۔

دوسری بات یہ عرض کرنا ہے کہ براہِ عنایت اس منسلک درخواست کو ضرور منظور فرمائیے۔ یہ درخواست سجاد حیدر کے پٹرول پمپ میں سروس اسٹیشن قائم کرنے کے لیے ہے۔ کیوں کہ اس مقابلے کے زمانے میں سروس اسٹیشن کے بغیر خالی پٹرول پمپ ایک بے معنی سی چیز ہے۔

آپ کا پرستار
جوش قدح خوار

۱۰-۶-۱۹۵۴ء

میرے محبوب، شملے میں آپ کی یاد ستا رہی ہے۔ پرسوں سے کئی بار دل میں یہ بات آئی کہ اگر آپ بھی یہاں ہوتے تو کیا لطف آتا۔

آپ کی صحبت نے مجھے بے کار کر رکھا ہے۔ واللہ کسی اور کی صحبت میں جی ہی نہیں لگتا۔ اے بلبل ہزار داستاں تیرے سامنے تو بڑے بڑے پرندے کاٹھ کے الّو نظر آتے ہیں۔

کیا کوئی صورت نکل سکتی ہے آپ کے یہاں آنے کی۔ شاید نہیں، کیسی بدنصیبی ہے۔ شملہ آپ کے بغیر، جیسے محفل شمع کے بغیر اور حسین عورت کی یکجائی بے شراب کے۔

سارا جی لگا ہوا ہے میرا آپ میں۔ کیوں کہ آپ کو بخار میں چھوڑ آیا تھا۔ اب تو نصیبِ دشمناں بخار نہیں ہے۔

اور ہاں وہ گمشدہ گھڑی ملی کہ نہیں۔ حیرت ہے اس کے گم ہو جانے پر۔ اب آئندہ سے گھڑی اُتار کر میز پر نہ رکھیے گا اور اس کی گھڑی کی خیر منائیے گا۔ کیا معاملہ ہوا، سمجھ میں نہیں آتا۔

اپنے مزاج کی کیفیت سے جلد تر آگاہ فرمائیے اور ایک ہفتے کے واسطے شملے آنے کا وعدہ کر لیجیے۔ خواہ جھوٹا ہی سہی۔ فریبِ وعدۂ دیدارِ یار کیا کہنا!

آپ کا پرستار:
وہی آوارۂ کوہسار
یعنی جوش بادہ خوار

۲۶-۶-۱۹۵۴ء

یہ ہیں حاضر ہیں یہ میرے بھانجے اور داماد التفات۔ عرض کر چکا ہوں کہ یہ دہلی کالج سے محض تین سو روپے پاتے ہیں۔

نو بچے، ایک بیوی، ایک خود، اور کم سے کم ایک نوکر۔ سب ملا کر ایک درجن آدمیوں کی پرورش کو دیکھیے اور تین سو روپلیوں پر نگاہ کیجیے — اور پھر اس زمانے کی گرانی پر نگاہ ڈالیے۔

التفات معمولی گریجویٹ نہیں۔ واقعی پڑھا لکھا آدمی ہے — ایمان دار، وفادار، محنتی اور سوجھ بوجھ رکھنے والا ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ اپنے فرائض اس قدر غیر معمولی قابلیت سے انجام دے گا کہ آپ کو دل ہی دل میں یہ کہنا نہیں پڑے گا کہ جوش مردود نے میرے گلے میں کیسا بندر باندھ دیا ہے۔

دہلی کالج کے تمام استادوں کو فوجی تربیت دیے جانے کا فتنہ بہت جلد برپا ہونے والا ہے اور چونکہ اس سلسلے میں آدمی پر آدمی چڑھا کر دوڑایا جاتا اور یہاں کی کالی دی جاتی ہے۔ اس لیے التفات مستعفی ہو جائے گا۔ جس کے یہ معنی ہوں گے کہ یہ تین سو روپے ماہانہ کی رقم بھی بند ہو جائے گی۔

بندہ پرور جس قدر جلد ہو اُسے روزگار سے لگا کر میرے سر کا سب سے بڑا بوجھ اُتار دیجیے۔ ورنہ اس خاکسار کا انتقال ہو جائے گا اور آپ "ہائے" کر کے رہ جائیں گے اور پھر پچھتانے اور ہوش میں آنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

اتنا اور سن لیجیے کہ اس التفات کی زبان موٹی ہے، یہ آپ کو اپنی باتوں سے ہرگز متاثر نہیں کر سکے گا۔ لیکن یقین فرمائیے کہ اس کی زبان جس قدر موٹی ہے، ویسی ہی اس کی عقل باریک ہے۔

آپ کا پرستار
جوش

۲-۷-۱۹۵۴ء

بندہ پرور، یہ گناہگار کا غذی روپ میں پھر نمودار ہوا ہے۔ سلام قبول فرمائیے۔ کل سے یہاں بارش کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ اس وقت دھواں دھار گھٹائیں جھوم رہی ہیں۔

اُٹھی گھٹا وہ رنگ و بُو کا کارواں لیے ہوئے
جلو میں کائنات کی جوانیاں لیے ہوئے
دُھواں دُھواں لیے ہوئے بلندیوں پہ چرخ کی
بلندیوں پہ چرخ کی دُھواں دُھواں لیے ہوئے

وہاں دہلی میں کیا رنگ موسم ہے۔ خدا کرے ایک آدھ چھینٹا وہاں بھی پڑ چکا ہو اور آپ لُو کے سنّاٹے سے محفوظ ہو چکے ہوں۔

میں آپ کے خط کی شیرینی لیے ہوئے مثالی کی طرف چل پڑوں۔

پرسوں مجھے اس قدر غصہ آ گیا تھا کہ اگر کوئی کھایا ہوا شیر ببر بھی میرے سامنے آ جاتا تو میں اس کے دونوں کان توڑ کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیتا۔

بات یہ ہوئی کہ میں نے پنڈت جواہر لال کے سکریٹری کو فون کیا کہ میں پنڈت جی سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ مردود غالباً مدراسی تھا۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں میرا اسمِ مبارک ہی نہیں آیا۔ جب میں نے انگریزی میں اپنے نام کے ہجے بتائے۔ جے۔ او۔ ایس۔ ایچ۔ تو اس کمبخت نے مجھ سے کہا کہ آپ اپنے کچھ بھی بتائیے تو میں نے کہا کہ آپ صرف میرا نام پنڈت کے سامنے لے لیجیے وہ سمجھ جائیں گے۔

دو گھنٹے بعد اس جانگلوش نے مجھ سے خشک لہجے میں یہ کہا کہ پنڈت جی یہاں آرام کرنے آئے ہیں، آپ دہلی میں مل لیجیے گا۔

بس یہ سننا تھا کہ جیمبر میں دھائیں سے ایک ایٹم بم پھٹ گیا اور اسی غضب ناک عالم میں پنڈت جی کو میں نے ایک شعلہ فشاں خط لکھ ڈالا۔

میں نے پنڈت جی کو لکھا آپ نے میری سخت توہین کی ہے جسے میں معاف نہیں کر سکتا۔ آپ مجھے اپنا بزرگ سمجھتے ہیں۔ کیا ہندوستان میں

بزرگوں کے ساتھ اب بھی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ آپ پرائم منسٹر سہی، یا مدر میں فقیر سہی، لیکن میری   فرو بھکر مر جاؤں گا، لیکن آپ سے اب کبھی۔۔۔۔۔۔۔

اس خط کے بعد اندرا کا فون آیا کہ کل پانچ بجے میرے ساتھ چائے پیجیے۔ میں نے اندرا کی دعوت قبول کر لی۔ مگر یہ تہیّہ کر لیا کہ اندرا کے باپ سے، اگر وہ اصرار بھی کریں گی، ہرگز نہیں ملوں گا۔

لیکن جب وہاں پہنچا تو پنڈت جی سامنے ہی کھڑے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی مسکرائے۔ میں نہیں مسکرایا، وہ بڑھے اور کہنے لگے پہلے چائے پی لیجیے۔

چائے کے بعد انہوں نے شکایت کی کہ ایسا گرم خط آپ کو نہیں لکھنا چاہیے تھا۔ میں نے کہا۔ ہم لوگ شیشہ گری کی دکان میں آہستہ سے قدم رکھنا چاہیے۔

اس کے بعد پنڈت جی نے مجھے سمجھایا کہ میں نے یہ نہیں کہا بلکہ وہ کہا تھا۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی۔ تب جا کر اس پٹھان کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔

میں نے یہ ساری کتھا آپ کو اس لیے نہیں لکھی ہے کہ آپ سے اس امر کی داد لوں کہ دیکھیے میں کس قدر تنک مزاج ہوں۔ اس لیے کہ تنک مزاجی میرے نزدیک بسا اوقات کوئی ایسی چیز نہیں ہوتی جسے وصف یا ہنر کہا جا سکے۔

بلکہ اس کے برعکس میں آپ کو یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ پرائم منسٹر کس قدر غیر معمولی شریف انسان ہے۔ اگر میں اس قدر تو دیتا ہوا خط کسی معمولی سب انسپکٹر کو بھی لکھ مارتا تو لڑائی ہو جاتی یا کم سے کم تعلقات کا رشتہ عمر بھر کے واسطے منقطع ہو جاتا۔

واقعی یہ نازک اندام آدمی، جسے جواہر لال نہرو کہتے ہیں، ہر حیثیت سے اس قابل ہے کہ اس سے شدت کے ساتھ محبت کی جائے اور خوب بھینچ بھینچ کر اس کا منہ چوما جائے۔

آپ کا پوجنے والا
شبیر حسن خاں جوش

حضور والا ذرا التفات پر جلد التفات فرمائیے، میری کشتی میں بہت پانی جمع ہو رہا ہے۔ ہر چند اُلیچ رہا ہوں۔ مگر پانی بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔

ڈوبنے سے پہلے ناخدائی فرمائیے۔

رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی سے معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

میرے مہربان و محبوب دوست شنکر پرشاد صاحب، لوگ، آپ کے محکمے میں نوکری کے واسطے میرے پاس آتے ہیں کہ آپ شنکر پرشاد صاحب کا ہاتھ پکڑ کر ان سے حکم لکھا سکتے ہیں اور میں دل ہی دل میں کہتا ہوں کہ یہ لوگ کتنے احمق ہیں، اگر شنکر پرشاد صاحب میرے ایسے ہی اختیار میں ہوتے تو میرے داماد کے تقرر میں اس قدر ہول ناک تاخیر کیوں کرتے۔

جناب والا، اب زندگی کے شدائد سے تنگ آ کر میری لڑکی میرے ہی پاس آ گئی ہے۔ اس لیے کہ میرے داماد کو صرف پونے تین سو تنخواہ ملتی ہے جس میں پورا نہیں ہوتا اور جب وہ بھی مہینوں نہ ملے تو آدمی جی کیوں کر سکتا ہے۔

میں لڑکی اور لڑکے کا بار کس طرح اُٹھا رہا ہوں آپ تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔

اگر آپ کو میرے ساتھ محبت یا کم سے کم ہمدردی ہے تو التفات کو اپنے محکمے میں جلد تر لے لیجیے۔ اب زیادہ انتظار نہ کرائیے۔ میں پاگل ہونے کے قریب ہوں۔ بس۔

درد انگیز اُمیدواری سے مایوسی بہتر ہوتی ہے   بندہ نواز۔

آپ کا پرستار
جوش

بندہ پرور! دوسروں کی سفارش کرتے ہوئے جو کچھ ہو سکا ہے میں کہہ گزرتا ہوں۔ لیکن اب اپنے متعلق کہنے کا جو موقع آیا ہے تو بے تعلقی کے باوجود شرمایا جا رہا ہوں۔ بہت مشکل بات ہے لیکن کہنا ہی پڑے گا۔

جہاں تک دنیوی عقل کا تعلق ہے میں ایک "خالص احمق" آدمی ہوں، اس لیے اپنی عقل سے نہیں بلکہ اپنی زوجۂ محترمہ کی عقل سے یہ خط لکھ رہا ہوں۔

میری بیوی مجھ سے کہتی ہیں کہ تم نرے پاگل ہو۔ شنکر پرشاد صاحب سے اپنی حالت صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ تمہیں اُن کی امداد کی سخت ضرورت ہے۔ اور اگر شنکر پرشاد صاحب چاہیں تو تمہاری ساری مصیبتیں دور ہو سکتی ہیں اور وہ اس طرح:

۱۔ سجاد کو ٹرک چلانے، یا اسی قسم کا کوئی پرمٹ دے دیں تاکہ وہ روزی کمانے لگے اور ہم دونوں اس اطمینان کے ساتھ مریں کہ وہ ٹھوکریں کھاتا نہیں پھرے گا۔

۲۔ "شعلہ و شبنم" کے واسطے شنکر پرشاد صاحب اپنے براہ راست اثر سے اشتہارات دلا دیں۔ کنور مہندر سنگھ سے یہ کام نہیں ہو سکتا۔

۳۔ اور اُس کمبخت شنکر لال کو ذرا سا اشارہ کر دیں کہ وہ "شعلہ و شبنم" اور "بک ڈپو" کی مالی امداد کر دے۔ ہزار اُس کے نزدیک ایک نہایت حقیر رقم ہے۔ لیکن زمانے کی رفتار نے آج ہماری یہ حالت کر دی ہے کہ ہزار کی سی حقیر رقم ہمارے نزدیک نہایت اہم ہے۔

سو حضور والا، یہ تین کام آپ کے سپرد کر رہا ہوں، اللہ کے بھروسے پر نہیں، صرف آپ کی محبت و شرافت کے بھروسے پر۔ جی میں آئے تو یہ کام کیجیے، نہ آئے تو نہ کیجیے۔ میں ہر حالت میں آپ کو چاہے جاؤں گا — چاہنے والوں کو اس کی پروا نہیں کہ معشوق بے وفا ہے یا وفادار۔

البتہ ایک بات کہہ دوں اور وہ یہ ہے کہ اگر میری امداد سے آپ کی پوزیشن پر کوئی حرف آئے تو میں آپ سے اپنے سر کی قسم دے کر کہتا ہوں کہ ہرگز ہرگز میری امداد نہ کیجیے گا۔ اس لیے کہ آپ کی پوزیشن کو

میں اپنی جان کے برابر سمجھتا ہوں۔

شرمندگی کے بوجھ سے دبا ہوا
جوشؔ بادہ نوش

بی-۲۰۹
سندھ مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی
کراچی۔
۱-۱۲-۱۹۵۵ء

میرے محبوب دوست، یہ کاغذات اور یہ خطوط براہ کرم سجاد کو اپنی خدمت میں طلب فرما کر اس کے حوالے کر دیجیے۔
سجاد کا پتہ ہے: 86/C اگر آپ عرشؔ صاحب کو فون کر کے ان سے یہ ارشاد فرما دیں گے کہ سجاد کو آپ کے پاس فوراً روانہ کر دیں تو وہ آجائے گا۔

سجاد سے یہ بھی کہہ دیجیے گا کہ وہ آپ کے پاس روپیہ جمع کرے اور آپ سے، جیسا کہ زبانی عرض کر چکا ہوں، مزید یہ کہنا ہے کہ آپ اس میں حسبِ مراد امداد فرما دیں۔
میں اپنے اہلِ خاندان کو یہاں نصب کر کے دہلی آؤں گا اور آپ کے جمالِ جہاں آرا سے آنکھوں کو روشنی سے دو چار کروں گا۔
یہاں جب تنہا بیٹھتا ہوں تو دل سے برابر آواز آتی رہتی ہے "ہائے شنکر پرشاد، ہائے شنکر پرشاد، یہ کیا جادو کر دیا ہے، آپ نے میرے دل پر؟

آپ کا عاشقِ زار
جوشِ بادہ خوار

بگرامی خدمت شنکر پرشاد صاحب محبوبِ جوشؔ

B ۲۰۹
سندھ مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی
کراچی
۱۳-۱۲-۱۹۵۵ء

میرے محبوب دوست، آپ نے اب تک بھولے سے بھی یاد نہیں کیا۔ اس کا بے حد قلق ہے۔
بہر حال کسی اور وقت یہ دکھڑا بیان کروں گا۔ اس وقت یہ کہنا ہے کہ وہ پانسو روپے جو آپ کے پی۔ اے نے میری جانب سے جھانسی روانہ کیے تھے۔ معلوم ہوا ہے کہ اب تک وہاں نہیں پہنچے ہیں۔
ممکن ہے کہ وہ روپے واپس آگئے ہوں، اگر ایسا ہے تو اپنے پی۔ اے کو براہ کرم ہدایت فرما دیجیے کہ وہ مندرجہ ذیل پتے سے:
عبداللہ خاں، میرزا گنج، ملیح آباد، لکھنؤ
روپیہ روانہ کر دیں۔

سجاد کو طلب کر کے کہہ دیجیے کہ ایمرجنسی سرٹیفکیٹ کے بعد ہندوستانی کسٹم سے کوئی تعلق باقی نہیں رہتا۔ وہ راجہ غضنفر علی خاں سے اسباب کے یہاں لے آنے کا اجازت نامہ لے لیں۔
باقی پھر ——

آپ کی محبت کا گرفتار
وہی جوشِ بادہ خمار

B-۲۰۹
سندھ مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی، کراچی
۲۴-۱۲-۱۹۵۵ء

حضرت، آپ کی مروّت کو کیا غرض پڑی ہے کہ مجھ دور افتادہ کو خط لکھنے کی زحمت گوارہ فرمائیں۔
اس وقت دو نہایت ضروری اور اہم کاموں کے واسطے آپ کو یہ خط لکھ رہا ہوں۔
ایک بات تو یہ ہے کہ میرے نہایت قدیم و قابل دوست حبیب اللہ صاحب رُشدی کو ڈالمیا سیمنٹ کا ڈیلر بنوا دیجیے۔
اس کام میں خواہ آپ کو کتنی ہی محنت و زحمت کا سامنا ہو، مگر اس کام کو کر دیجیے ضرور —— اگر آپ یہ سمجھیں کہ یہ کام سفارش سے نہیں، بیلنے سے چل سکتا ہے تو میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ بے دریغ ڈالمیا کو بیٹ ڈالیں اور رُشدی صاحب کو ڈیلر بنوا دیں۔ یہ احسان میری ذات پر ہوگا بندہ پرور۔
اور دوسری بات یہ ہے کہ میرا خاندان ابھی تک دہلی میں پڑا ہوا ہے۔ آپ سجاد کو اسی وقت طلب کر کے تاخیر کے اسباب معلوم کریں اور بن پڑے تو اس اُن کے نکلنے کی مدد کریں۔

آپ کا شکوہ سنج
جوشؔ

اور یہاں سجاد کو چالیس روپے دے دیجیے گا کہ وہ اظہار کو دے دیں۔ بیوی کو میں نے لکھا تھا کہ وہ اظہار کو روپے دے دیں۔ مگر ان کا بخل پیسے نہیں دینے دے رہا ہے۔ زندہ رہا تو دہلی آپ کا یہ روپیہ واپس کر دوں گا۔

B-۲۰۹
سندھ مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی، کراچی
۱۳-۴-۱۹۵۶ء

حضرتِ مکرم۔ نہ آپ نے اب تک خود ہی خط لکھا، نہ میرے خط کا جواب ہی دیا ہے۔ اگر میرے بھتیجے افتخار علی کا معاملہ نہ ہوتا تو میں آپ کو خط لکھ کر بے حیائی کا ارتکاب نہ کرتا۔ اگر آپ یہاں کے منیجر کو افتخار کے واسطے براہ کرم ہدایت کر دیں تو وہ روزگار سے لگ جائے گا اور میں آپ کا احسان مند ہوں گا۔ اور اگر آپ نہیں لکھیں گے تو جس طرح آپ نے میرے داماد کے لیے کچھ نہیں کیا تھا اور میں اپنا سا منہ لے کر رہ گیا تھا، اس موقع پر بھی خفیف ہو کر بیٹھ جاؤں گا۔
لیکن اس کے باوجود آپ کی محبت سے دست بردار نہیں ہوں گا۔ اللہ اکبر آپ کی محبت بھی کیسی ضدی ہے کہ آپ مجھے ٹھکراتے ہیں، لیکن وہ ملنے کا نام نہیں لیتی۔ واقعی عاشق سالا بڑا بے غیرت ہوتا ہے۔

جواب سے مایوس
جوشؔ

شاعری کا ترجمہ : ہر چند میں تصوف کے دائرے سے نکل کر فکر کی جانب آہستگی کے ساتھ مڑ رہا تھا، مگر ٹیگور کی شاعری اس کے باوجود مجھے بے حد متاثر کیا کرتی تھی اور میں ان کے ترجمے پڑھ پڑھ کر سر دُھنا کرتا تھا اور اب بھی میرے دل میں یہ چور ہے کہ گاہ گاہ صوفیانہ شاعری پر میں وجد کرنے لگتا ہوں ۔ اور اس کی شاید یہ علت ہو کہ شاعر کسی منزل میں بھی خشک اور کھُردرا فلسفی نہیں بن سکتا۔ اگر میں بنگالی زبان سے واقف ہوتا تو ٹیگور کی شاعری کو سمجھنے کی طرح سمجھ سکتا۔ لیکن مجھے اس کا بے حد افسوس ہے کہ میں نے ان کی شاعری کو انگریزی کی وساطت سے پڑھا اور بنگالیوں کی طرح سمجھ نہیں سکا۔

میرا یہ دعویٰ ہے کہ شاعری ایک ایسا جادو ہے جس کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ شاعری آبگینہ ہے اور ترجمہ گھن۔ شاعری شیشہ ہے اور ترجمہ پتھر ــــ شاعری حباب ہے اور ترجمہ ہوائے تند کا تھپیڑا۔

جب شاعری کا ترجمہ کیا جاتا ہے تو اس کا کندن مٹی کا ایک ڈھیر بن جاتا ہے۔ اس کے لالہ و گُل پلاسٹک کے پھولوں کا لباس پہن لیتے ہیں۔ اور اس کا شعلۂ جوالہ راکھ میں تبدیل ہو کر رہ جاتا ہے۔ میں یہاں تک مان لینے پر تو اپنے کو آمادہ کر سکتا ہوں کہ فکری اور آفاقی مسائل کی شاعری کا تو کسی حد تک ترجمہ ہو سکتا ہے۔ لیکن شاعری کے اس کھنکتے طلسمی دائرے میں ترجمہ باریاب نہیں ہو سکتا؟ جہاں الفاظ کو ان کے لغوی معنی سے جدا کر کے استعمال کیا جاتا ہے اور ان کے سروں پر بالکل جدید معنی کے تاج رکھے جاتے ہیں۔ جہاں نجوں کی ایک ایک کروٹ اور الفاظ کی ایک ایک پرت کے نیچے سے نئے نئے مطالب کے صد ہا چشمے پھوٹا کرتے ہیں۔ جہاں مختلف النسل لفظوں کے نقطہ ہائے اتصال سے خیالات کی ایک نئی نسل پیدا کی جاتی ہے۔ جہاں طوافِ حرم کو رقص اور رقص کو طوافِ حرم کے سانچے میں ڈھالا جاتا ہے، جہاں اکائی کے میدان میں اعداد کے میلے ہوا کرتے ہیں، جہاں دو اور دو مل کر چار نہیں ایک ہو جاتے ہیں۔ جہاں روشِ نفی پر علمِ اثبات لہرایا جاتا ہے، جہاں تلوار کی دھار سے مرہم ٹپکتا ہے، جہاں نشتروں کی نوک سے زخموں میں ٹانکے لگائے جاتے ہیں۔ جہاں سبو کے دستے سے کعبہ کا در کھٹکھٹایا جاتا ہے، جہاں کانٹے گنگناتے اور پھول کراہتے ہیں۔ جہاں موتیوں سے آنسو اور آنسوؤں سے موتی برسائے جاتے ہیں۔ جہاں نازک حبابوں کے گھن سے چٹانیں توڑی جاتی ہیں۔ جہاں بوندوں کے کٹاؤ میں کٹاریاں مچلتی ہیں ــــ جہاں اولوں کے مسامات سے چنگاریاں برستی ہیں۔ جہاں ڈوب جانے کے بعد سفینے اُبھرتے ہیں۔ جہاں تانوں کے تیشوں سے مجسمے تراشے جاتے ہیں۔ جہاں نوحوں کی گود میں راگنیاں پروان چڑھتی ہیں۔ جہاں پلکوں کی نوک پر آسمان تولے جاتے ہیں، جہاں نکہتوں سے فولاد پرمایا جاتا ہے۔ جہاں ذہن کے سوپ میں اجرام پھٹکے جاتے ہیں۔ جہاں شعور کی چھلنی میں کائنات چھانی جاتی ہے۔ جہاں فکر کے پروں پر ذات و صفات کو اُسایا جاتا ہے۔ جہاں اوس کی بوندوں میں الاؤ روشن کئے جاتے ہیں۔ جہاں آنسو کی لہروں میں زہرا کی کمر لچکتی ہے۔ جہاں لُوئے گل گیت بن جاتی ہے اور گیت زہرہ جبینوں کے مکھڑے بن جاتے ہیں۔ جہاں ہواؤں کو دیکھا اور صداؤں کو چکھا جاتا ہے۔ جہاں تتلیوں کی دھاریوں پر کرۂ ارض کو نچایا جاتا ہے۔ جہاں ایک ایک آن کی ہتھیلی پر کروڑوں صدیاں تھرکتی نظر آتی ہیں۔ اور جہاں جزویت اپنے ماتھے پر کلّیت کا تاج رکھ کے آفاق کو اپنے جوڑے میں لپیٹ لیتی ہے۔

مترجم جب اس دائرۂ رقصاں کی جانب نگاہ اُٹھاتا ہے تو اس کے الفاظ کی ہڈیاں بولنے لگتی ہیں۔ اس کے تخیل کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں اور اس کے وجود کا ڈوراجیٹ سے ٹوٹ کر رہ جاتا ہے۔

کاش نوبل پرائز کے اربابِ حل و عقد سے کوئی یہ جا کر کہہ دے کہ اے سخن ناشناسو اور قدامت پرست اندھو اگر تم ادب کے قدر دان ہو تو شاعر کے کلام کو اس کی زبان میں پڑھو۔ خود نہیں پڑھ سکتے تو تم اس کے ہم زبان اکابر کی ایک کمیٹی بنا کر اس کے سپرد کرو وہ کرو وہ اپنی رائے سے تم کو مطلع کرے۔

تمہیں آخر یہ کون سا دماغی مرض لاحق ہو گیا ہے کہ تم شاعری کے جیتے جاگتے جسم کی جانب تو کوئی اعتنا نہیں کرتے اور جب ترجمہ اس گرم جسم کو ٹھنڈی لاش میں تبدیل کر دیتا ہے تو اس لاش کو تم کلیجے سے لگا لیتے ہو ــــ اے جسم بیزارو، لاش نواز لوگو! ادب کی دلیوی تمہاری بے سوادی پر ماتم کر رہی ہے۔

("یادوں کی برات" صفحہ: ۱۵۶۔۱۵۷)

پروفیسر گوپی چند نارنگ

جوش کی شاعری
باغیانہ اور منظریہ جہات

کون نہیں جانتا کہ بیسویں صدی میں ٹیگور اور اقبال کے بعد جتنی عزت، شہرت اور مقبولیت جوش ملیح آبادی کو نصیب ہوئی، کسی دوسرے شاعر کے حصے میں نہیں آئی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ۱۹۵۶ء میں جب جوش نے ہندوستان چھوڑا تو دونوں ملکوں یعنی پورے برصغیر کے طول و عرض میں جوش کے نام کا ڈنکا بجتا تھا۔ کیا یہ امر غور طلب نہیں کہ قطع نظر اس ذاتی واقعے کے بیانیہ شاعری کا وہ انداز جس کے جوش اتنے زبردست ترجمان تھے، تاریخی اعتبار سے اس کے خاتم ہونے کا اعزاز بھی انھیں کو نصیب ہونے والا تھا۔ کیوں کہ آزادی کے بعد کے چند برسوں میں کیا یہ انداز اپنی بساط تہ نہیں کر رہا تھا؟ جب زمانہ بدلتا ہے تو مذاق بھی بدلتا ہے۔ ادبی تبدیلیاں اگرچہ خاموشی سے رونما ہوتی ہیں، لیکن کبھی بار یہ سیاسی طوفانوں اور تہلکوں سے کم ہوش رُبا اور روح فرسا نہیں ہوتیں۔ کیا یہ واقعہ نہیں کہ آزادی کی ایک دہائی کے اندر اندر ہی پاکستان اور ہندوستان میں اردو شعر و ادب کی سطح پر دوررس تبدیلیوں کے آثار سامنے آنے لگے۔ چنانچہ جب مذاق بدلنے لگا تو انقلاب کی صدا لگانے والے خود اک انقلاب کی زد میں آگئے۔ ہماری شاعری کی حالیہ تاریخ ان تبدیلیوں کی خاموش تماشائی ہے۔ گوشِ نصیحت نیوش ہو یا نہ ہو دیدۂ عبرت نگاہ تو خون کے آنسو بھی رو چکی اور رُلا بھی چکی۔

جوش اس قدر جلد روایتِ پارینہ بن جائیں گے، آزادی کے فوراً بعد اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ تاہم وہ ہماری کتابِ شعر کا ایسا باب ہیں جس کے بعض نقوش کی چمک آسانی سے ماند نہ ہوگی۔ جوش کی اُٹھان میں بلا کا زور تھا۔ انھوں نے اپنا تخلص جوش بلا وجہ اختیار نہ کیا ہوگا۔ غالباً اپنی فطرت کے ہیجان انگیز عناصر کا انھیں شروع ہی سے شدید احساس تھا۔ ان کے یہاں ابتدا ہی سے ایک زبردست قوتِ نمو، تخلیقی اُمنگ، پھوٹ پڑنے اور بے اختیار نہ بہائے جانے کی کیفیت ملتی ہے۔ وہ ایک بگولے کی طرح اُٹھے اور طوفان بن کر چھا گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے انھوں نے اپنی تہلکہ خیزیوں سے ایوانِ شعر کے در و دیوار کو لرزا دیا۔ وہ سر تا سر ایک رومانی شاعر تھے اور شدید باغی، ایسا باغی جو بالآخر خود اپنی ہی آگ کی نذر ہو گیا۔ مشاقی، پُرگوئی، شوکتِ الفاظ اور قادر الکلامی ان پر ختم تھی۔ ان کی شاعری سے لگتا ہے کہ وہ جس موضوع یا منظر کو جیسا چاہتے آناً فاناً نظم کر دیتے تھے۔ لفظوں کا ایسا بڑا جادوگر انیس کے بعد دوسرا پیدا نہیں ہوا۔ زبان کے ساتھ ان کا رویہ انتہائی حاکمانہ اور آمرانہ تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ہزاروں لاکھوں الفاظ قطار اندر قطار ہاتھ باندھے کھڑے ہیں اور ادنیٰ سا اشارہ پاتے ہی سر جھکائے شعر میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں۔ جوش کے لہجے میں ایسا طنطنہ اور مردانگی تھی اور ان کی آواز میں ایسی گھن گرج، کڑک اور دبدبہ تھا کہ معلوم ہوتا تھا گویا ہمالیہ لرز رہا ہے یا زلزلہ آگیا ہے۔ "شعلہ و شبنم" کے بعد ان کا یہ شعر بلا وجہ زبان زدِ خاص و عام نہیں ہو گیا تھا:

کام ہے میرا تغیّر نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

یوں وہ شاعرِ انقلاب کے ساتھ ساتھ شاعرِ شباب بھی کہے جانے لگے۔ بیک وقت شاعرِ انقلاب اور شاعرِ شباب ہونا جوش ہی کا کمال تھا۔ تضاد کا یہ سلسلہ جوش کی پوری شاعری میں ملتا ہے۔ جوش کو اس پر بھی فخر تھا۔ انھوں نے اپنے مجموعوں کے نام "شعلہ و شبنم"، "سنبل و سلاسل"، "سیف و سبو"، "حرف و حکایت"، "فکر و نشاط"، "جنون و حکمت"، "سرود و خروش"، "الہام و افکار"، "عرش و فرش"، "آیات و نغمات"، "سموم و صبا" بلا وجہ نہیں رکھے۔ جوش کی پوری شاعری میں یہی کیفیت ہے کہ ایک جذبہ دوسرے کی نفی کرتا ہے اور ایک رنگ دوسرے کو بے رنگی سے کاٹتا ہے۔ لیکن جوش اب پُل کے دوسری طرف جا چکے ہیں۔ سوال اٹھتا ہے کہ وقت کے اس ظلمات میں ان کی شاعری کا جو چہرہ ابھرتا ہے، وہ کیسا ہے اور صرصر و سموم کے اس دشت سے گزرنے کے بعد جس کا نام دنیا ہے، جوش کی شاعری کے وہ کون سے نقوش ہیں جو بعد میں بھی روشن رہیں گے۔ اس کے جواب کے لیے زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں۔ جوش اپنے وقت سے آگے نہ سہی، اپنے وقت کی آواز ضرور تھے اور یہ سعادت معمولی

ڈی۔۲۵۲، سرودیہ انکلیو، نئی دہلی

نہیں ۔ خلافت تحریک اور اس کے بعد سے یہ برصغیر سیاسی بیداری اور قومی جوش و خروش کے جس اُبال سے گزر رہا تھا، جوش کی شاعری اس کی فطری نقیب بن گئی تھی ۔ آزادی کے ترانے چھیڑنے والوں میں جوش اکیلے نہیں تھے ۔ شبلی، حسرت موہانی، چکبست، اکبر الہ آبادی، اقبال، ظفر علی خاں، اقبال سہیل اور کئی دوسرے شعرا سامراج دشمنی کی فضا تیار کر چکے تھے ۔ لیکن جوش کی آواز جوش کی آواز تھی ۔ ان کی باغیانہ تڑپ اور گھن گرج سب سے الگ تھی ۔ شاعرِ انقلاب کہلانے کا اعزاز کسی کو ملا تو صرف جوش کو۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو وہ شاعری کی سطح پر ہندوستان اور پاکستان کی آزادی کے قافلہ سالاروں میں سے تھے ۔ اور جس مجاہدانہ جوش و خروش اور ہمت و پامردی سے انہوں نے سامراج دشمنی اور انقلاب کے ترانے گائے اور انگریز کے خلاف بغاوت کی آگ کو سینے میں دہکایا، وہ دونوں ملکوں کی قومی تاریخ کا حصہ ہے ۔ رہا شاعرِ شباب کا معاملہ تو اس کی کیفیت دوسری ہے ۔ ان کی شدید جذباتیت سے شاید جتنا فائدہ ان کی انقلابیت اور بغاوت پسندی کو پہنچا، اس نسبت سے اتنا یا اس سے زیادہ نقصان ان کی عاشقانہ شاعری کو پہنچا ۔ جسم و جمال کے تذکروں میں لذت اندوزی اور ہوس پرستی کی سطح پر اتر آنے کی وجہ بھی یہی تھی ۔ جوش کا عورت کا تصور سراسر جسمانی تھا ۔ تاہم باغیانہ لے سے ہٹ کر ان کی شاعری کا اگر کوئی اور روشن پہلو ہو سکتا ہے تو وہ منظریہ پہلو ہے ...... جس میں نسوانی حسن و جمال کی منظر کشی اور فطرت کی منظر کشی دونوں شامل ہیں ۔ حسن سے بے پناہ لگاؤ ان کی افتادِ طبع کا حصہ تھا ۔ حسن خواہ عورت کا ہو یا فطرت کا، لگتا ہے اس کی کشش سے جوش پر ربودگی کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی ۔ انہوں نے عورت اور فطرت کے حسن و جمال کے جو مرقعے کھینچے ہیں اور البیلی صبحوں، ڈھلتی شاموں، ساون کے مہینوں اور گرجتی برستی گھٹاؤں سے آواز کی سیڑھیوں کے ذریعے جو باتیں کی ہیں اور دن 'رات' لو، گرمی، تپش بہار اور برسات کی جو کیفیتیں بیان کی ہیں، وہ پوری اردو شاعری میں اپنا جواب نہیں رکھتیں ۔ جوش کی شاعری کے اس پہلو کی طرف اتنی توجہ نہیں ہوئی جتنی اس کا حق ہے ۔ یہاں ان دونوں پہلوؤں کا مختصراً تذکرہ کیا جائے گا اور ان اسلوبیاتی جہات کی طرف بھی اشارہ کیا جائے گا جو جوش کی شاعری کا امتیازی نشان ہیں ۔

جوش کی باغیانہ شاعری کے تین پہلو خاص ہیں ۔

عوامی سماجی پہلو جہاں انہوں نے سماج کی خرابیاں دکھائی ہیں اور عوام کی حالت بیان کی ہے ۔ دوسرے وہ نظمیں جن میں انہوں نے بغاوت و آزادی کے ترانے چھیڑے ہیں اور تیسرے وہ نظمیں جن میں سامراج دشمنی کا کھل کر اظہار ہوا ہے ۔ ان میں ہر ہر سطح کا تفصیلی تجزیہ ممکن نہ ہوگا ۔ بعض جگہ صرف اشاروں سے کام لیا جائے گا ۔

جوش کی باغیانہ شاعری میں عوامی سماجی پہلو خاص اہمیت رکھتا ہے ۔ وہ ہمارے پہلے بڑے شاعر ہیں جنہوں نے بغیر کسی خارجی سہارے کے انسان کی مرکزیت کو تسلیم کیا اور اُسے انقلاب کی پہلی اور بنیادی کڑی کے طور پر پیش کیا ۔ وہ اس نئے انسان کی بشارت دیتے ہیں جسے اپنی قوت پر بھروسا ہے اور جو سامراج سے ٹکر لینے کے عزم و ولولے سے سرشار ہے ۔ ترقی پسند تحریک کی سالاری بعد کی چیز ہے ۔ اس نوع کے جذبات جوش کے یہاں ترقی پسند تحریک کے آغاز کے دس پندرہ برس پہلے یعنی ۱۹۲۱ ۔ ۱۹۲۲ء سے ملنے لگے تھے ۔ "انسان کا ترانہ" "باغی انسان" "پست قوم" "جھریاں" "مہاجن اور مفلس" "ضعیفہ" "بھوکا ہندوستان" اور بالخصوص "کسان" اور "ہماری سوسائٹی" اور اس طرح کی دوسری نظموں میں جوش نے برصغیر کے عوامی دکھ درد، افلاس، ناداری اور جہالت کو طرح طرح سے بیان کیا ہے اور ہم وطنوں کو بیدار کرنے کے لئے ان کی عزت کو للکارا ہے ۔ باستثنائے "کسان" اور "ہماری سوسائٹی" جو اعلیٰ پائے کی نظمیں ہیں ۔ دوسری عوامی سماجی نظموں میں دو کمیاں خاص طور پر کھٹکتی ہیں ۔ اول تو جوش جہاں بھی عورت کو دیکھتے ہیں اُن کی انقلابیت شبستانِ طرب میں پہنچ جاتی ہے ۔ "حسن اور مزدوری" کا شمار بعض نرم دل حضرات جوش کی بہترین نظموں میں کرتے ہیں ۔ اس کے جذبۂ عوام دوستی اور وطنیت میں کلام نہیں ۔ ایک دوشیزہ سڑک پر دھوپ میں پتھر توڑ رہی ہے ۔ رخساروں پہ گرد ہے اور زلفیں خاک میں اٹی ہوئی ہیں ۔ چوڑیوں کے ساز میں سوز بھرا ہوا ہے ۔ یہ منظر دیکھ کر شاعر کے دل سے دھواں اُٹھتا ہے اور وہ افلاس کے مارے ہوئے ہندوستان پر افسوس کرتا ہے، لیکن اس جذبۂ وطنیت کی تان بالآخر اس خیال پر ٹوٹتی ہے :

دستِ نازک کو رسن سے اب چھڑانا چاہیے
اس کلائی میں تو کنگن جگمگانا چاہیے

دوسرے یہ کہ عوام سے خطاب کرتے ہوئے اکثر جوش کا لہجہ اتنا تلخ ہو جاتا ہے کہ ان کی ہمدردی اور خلوص پر شبہ ہونے لگتا ہے ۔ اتنی بات واضح ہے کہ جوش کا تصورِ سماج کسی سنجیدہ غور و فکر کا نتیجہ نہیں تھا ۔ وہ ہر چیز کو ذاتی برتری کی نظر سے دیکھتے تھے ۔ اس میں کچھ ہاتھ ان کے رئیسانہ مزاج اور خاندانی وجاہت کا بھی تھا ۔ ایک جگہ کہا ہے کہ "ہند کے غلامانِ روسیاہ "شاعر سے نگاہ ملانے کے قابل ہی نہیں ۔" فرنگی کے غلام" "روسیاہ" "کمینے" "وحشی" "بے حیا" "بدگمان" جیسے الفاظ جوش کے نوکِ زبان پر تھے ۔ وہ اکثر گلا کرتے تھے کہ وہ "نامرد قوم" میں پیدا ہی کیوں ہوئے (کلامِ جوش سے خطاب") ایسے مقامات پر ان کا رویّہ اپنے ہم وطنوں کے لئے اہانت آمیز ہو جاتا ہے ۔ اصلاً وہ ایسا غیرت دلانے اور خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لئے کرتے تھے ۔ لیکن غیظ و غضب سے شعر پایۂ اعتبار سے فروتر ہو جاتا ہے ۔ جوش کی عوامی سماجی نظموں سے وہ نظمیں کہیں بہتر ہیں، جن میں انہوں نے آزادی اور بغاوت کے ترانے گائے ہیں اور انقلاب کے لئے بیدار کیا ہے ۔ جوش کے لہجے میں جو مردانگی، شکوہ، بلند آہنگی اور طنطنہ تھا ۔ وہ جذبۂ بغاوت اور آزادی کی تڑپ کے اظہار سے خاص مناسبت رکھتا تھا ۔ جوش کی آواز کی للکار اور کڑک ولولوں کو بڑھانے اور ہمتوں کو بلند کرنے کے لئے آگ کا کام کرتی تھی ۔ نعرۂ شباب

میں کہتے ہیں :

کام ہے میرا تغیّر نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ "انقلاب" و "انقلاب" و "انقلاب"

رنگ سورج کا اُڑا تا ہے مرے سینے کا داغ
بادِ صرصر کا بدل رہتا ہے رُخ میرا چراغ

تیر جاتی ہے دلِ فولاد میں میری نظر
خون میرا خندہ زن رہتا ہے موجِ برق پر

ایک دینِ نو کی لکھوں گا کتابِ زرفشاں
ثبت ہو گا جس کی زرّیں جلد پر "ہندوستاں"

پھر اُٹھوں گا ابر کی مانند بَل کھاتا ہوا
گھومتا ، گھِرتا ، گرجتا ، گونجتا ، گاتا ہوا

ولولوں سے برق کی مانند لہرایا ہوا
موت کے سائے میں رہ کر موت پر چھایا ہوا

ایسی نظموں میں "سلام" "بغاوت" "ناخدا کہاں ہے" "بیدار ہو بیدار" "پیکار" اور "نظامِ نو" میں آزادی اور بغاوت کی آگ بھری ہوئی ہے۔ ان سے آج بھی اس پُر آشوب عہد کی ولولہ خیزیوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے :

بھرا ہوا غیظ میں سمندر فضا کی جانب دہک رہا ہے
گرج کڑک ہے ، کڑک چمک ہے ، چمک ہوا ہے ، ہوا گھٹا ہے
جھنن جھنن ہے ، گھرڑ گھرڑ ہے ، گھنن گھنن ہے ، دَنا دَنا ہے
فلک کے ہونٹوں پہ الحذر ہے ، زمیں کے لب پہ الاماں ہے
کوئی خدا کے لئے بتاؤ کہ ناخدا کون ہے ، کہاں ہے ؟

—— ناخدا کہاں ہے

اُٹھو اور زمیں پہ نیا لالہ زار پیدا کر
نہ آئی ہو جو کبھی وہ بہار پیدا کر
نظامِ کہنہ نیلی رواق ، وہم و فریب
نیا تصوّرِ لیل و نہار پیدا کر
بہار میں تو زمیں سے بہار اُگتی ہے
جو مرد ہے تو خزاں میں بہار پیدا کر

—— پیدا کر

محراب کی ہوس ہے نہ منبر کی آرزو
ہم کو ہے طبل و پرچم و لشکر کی آرزو
کانٹوں پہ حق پرست بدلتے ہیں کروٹیں
بالش کا اشتیاق نہ بستر کی آرزو
اُس آرزو سے میرے لہو میں ہے جزر و مد
دشتِ بلا میں تھی جو بہتّر کی آرزو
بادِ مراد و آبِ طرب کا نہیں ہے وقت
طوفاں کا اشتیاق ہے صرصر کی آرزو
رقصِ پری وشاں و خرامِ صبا حرام
دل کو ہے ضربِ فاتحِ خیبر کی آرزو
تُرّش اُس سبوئے قلب پہ کون و مکاں نثار
غلطاں ہو جس پہ ساقیِ کوثر کی آرزو

—— سلام

ہاں بغاوت ! آگ ، بجلی ، موت ، آندھی میرا نام
میرے گرد و پیش اجل ، میری جلو میں قتلِ عام
زرد ہو جاتا ہے میرے سامنے روئے حیات
کانپ اُٹھتی ہے مری چینِ جبیں سے کائنات
ذکر ہوتا ہے مرا پُر ہول پیکاروں کے ساتھ
ذہن میں آتی ہوں تلواروں کی جھنکاروں کے ساتھ
اللہ اللہ کروٹیں میرے دلِ آزاد کی
جن سے گر جاتی ہیں دیواریں قصرِ استبداد کی
الحذر ! میری کڑک کا زورِ ہنگامِ مصاف
صاف بڑھ جاتا ہے ایوانِ حکومت میں شگاف
الاماں و الحذر ! میری کڑک میرا جلال
خون ، سفّاکی ، گرج ، طوفان ، بربادی ، قتال
برچھیاں ، بھالے ، کمانیں ، تیر ، تلواریں ، کٹار
بکتریں ، پرچم ، علم ، گھوڑے ، پیادے ، شہسوار
جنگ کی صورت سے گو ہنگامہ کرتی ہوں شروع
امن کی صبحیں مرے خنجر سے ہوتی ہیں طلوع
اے جفا پرورِ امارت ! دیکھ ناداروں سے بھاگ
بھاگ ، دیوانوں کی خوں آشام تلواروں سے بھاگ
حُرّیت کی تند لہروں میں ٹھہر سکتا ہے کون ؟
جذبۂ خلقِ خدا کو فتح کر سکتا ہے کون ؟
رعبِ سلطانی سے یہ چہرہ اُتر سکتا نہیں
جو خدائی سے لڑے ، شاہی سے ڈر سکتا نہیں

—— بغاوت

لیکن ان سے بھی زیادہ آگ ان نظموں میں ہے جہاں جوش نے

سامراجی نظام پر کھل کر وار کیا ہے۔ اُن نظموں میں جوش کے مجاہدانہ تیور دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کسی آتش فشاں پہاڑ کا دہانہ کھل گیا ہے اور شعلے برس رہے ہیں۔ انہوں نے فرنگیوں کو للکارا ہے اور سامراجی نظام کے پارہ پارہ ہونے کی نوید دی ہے۔ ایسی نظموں میں "زوالِ جہانبانی" "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام" "وفادارانِ ازلی کا پیامِ شہنشاہِ ہندوستان کے نام" اور "شکستِ زنداں کا خواب" خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ یہ وہ نظمیں ہیں جنہیں برِصغیر کی آزادی کی تاریخ میں ہرگز ہرگز بھلایا نہیں جاسکے گا۔ "وفادارانِ ازلی کا پیامِ شہنشاہِ ہندوستان کے نام" میں طنز کی ایک زیریں لہر ہے جس نے پوری نظم میں تیغ کی آبداری پیدا کردی ہے۔ اس میں ہندوستان کے مجبور و بےبس عوام کی زبان میں انگریزوں سے بظاہر ڈرتے ڈرتے خطاب کیا ہے، لیکن درپردہ ایسا طنز کیا ہے جس کا وار نہایت گہرا ہے۔ اس سلسلے کی بہترین نظم بلاشبہ "شکستِ زنداں کا خواب" ہے۔ یہ پوری نظم آزادی سے پہلے کے اُبلتے کھولتے ہوئے ہندوستان کا استعارا ہے۔ پورا ملک زنداں کا منظر پیش کرتا ہے، جہاں بغاوت کا لاوا اُبلنے کو ہے۔ عوام قیدی ہیں جو دیواروں کے نیچے آکر جمع ہوگئے ہیں۔ سینوں میں تلاطم اور نظروں میں بجلی ہے۔ زنجیروں کی جھنکار بغاوت کا رجز بن گئی ہے۔ دیوار و در بیٹھ گئے ہیں اور انقلاب نے پرچم کھول دیا ہے۔ آٹھ شعروں کی اس مختصر سی نظم میں جوش نے جس طرح جذبۂ حرّیت کی ہیجان انگیزیوں اور ولولہ خیزیوں کو زندۂ جاوید کردیا ہے، انہیں کا حصہ ہے۔

کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے گونج رہی ہیں تکبیریں
اُکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں
دیواروں کے نیچے آ آکر یوں جمع ہوئے ہیں زندانی
سینوں میں تلاطم بجلی کا، آنکھوں میں جھلکتی شمشیریں
بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں
تقدیر کے لب کو جنبش ہے، دم توڑ رہی ہیں تدبیریں
آنکھوں میں گدا کی سُرخی ہے، بے نور ہے چہرہ سلطاں کا
تخریب نے پرچم کھولا ہے، سجدے میں پڑی ہیں تعمیریں
کیا اِن کو خبر تھی زیر و زبر رکھتے تھے جو روحِ ملت کو
اُبلیں گے زمیں سے مارِ سیہ برسیں گی فلک سے شمشیریں
کیا اِن کو خبر تھی سینوں سے جو خون چرایا کرتے تھے
اک روز اسی بے رنگی سے جھلکیں گی ہزاروں تصویریں
کیا اُن کو خبر تھی ہونٹوں پر جو قفل لگایا کرتے تھے
اک روز اسی خاموشی سے ٹپکیں گی دہکتی تقریریں
سنبھلو کہ وہ زنداں گونج اُٹھا، جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اُٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں، دوڑو کہ وہ ٹوٹیں زنجیریں

یہاں کچھ اشارے جوش کے تخلیقی اظہار کے اسلوبیاتی پیرایوں سے متعلق بھی ضروری ہیں۔ جوش نے یوں تو اپنی نظموں میں مختلف ہیئتوں سے کام لیا ہے، لیکن قصیدے اور مسدس کی روح اُن کی پوری نظم نگاری کو سرشار کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ سلام، مراثی، منقبت سے دورِ اول میں تخلیقی ربط رہا۔ پھر برسوں کے فصل کے بعد انہوں نے اسے "طلوعِ فکر" کے ذریعے جوڑا۔ اس ٹوٹتے جُڑتے ہوئے سلسلے کے باوصف انیس کی شعری روایت سے جوش کا جو تخلیقی رشتہ تھا اور جس طرح انہوں نے شعوری اور غیر شعوری طور پر اس سے استفادہ کیا، وہ مطالعاتِ جوش کا ایک الگ باب ہے۔ قصیدے اور مسدس کی ہیئتوں میں جو اسلوبیاتی ربط ہے، اس سے میں اپنے مضمون "اسلوبیاتِ انیس" میں بحث کرچکا ہوں۔ اس میں کلام نہیں کہ جوش نے اپنی خطابت سے ایک طاقتور حربہ کا کام لیا ہے اور اپنی مجاہدانہ بیانیہ شاعری میں ایک خاص شان پیدا کی، لیکن جہاں جہاں وہ اظہار کی کشتی کو جذباتیت کے تھپیڑوں کے حوالے کردیتے ہیں۔ تکرارِ لفظی سے ایسی صورت پیدا کردی ہے جس میں لفظ سے معنی کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے اور محض لفظیات کی ضربیں باقی رہ جاتی ہیں۔ ایسی صورت میں باوصف شدید روانی، تُرش اور تخلیقی قوتِ نمو کے نظم معنیاتی طور پر آگے نہیں بڑھتی۔ کیا یہ غور طلب نہیں کہ جوش کے یہاں بہت سے بند یا نظمیں ایسے الفاظ سے شروع ہوتی ہیں جن کی تکرار کو وہ خواہ مخواہ اپنے لئے لازم کرلیتے ہیں۔ مثلاً / قسم اُن کی جو جنس رعنائی میں اپنے نہاتے ہیں / قسم اُن گھن گرج پُر ہول توپوں کے دہانوں کی / قسم اُن غازیوں کی موت سے جو جنگ کرتے ہیں / یا پھر / قسم اُس دل کی چسکا ہے جسے صہبا پرستی کا / قسم اُس روح کی خو ہے جسے فطرت پرستی کی / قسموں کا یہ اکتا دینے والا سلسلہ شعر در شعر پوری نظم میں جاری رہتا ہے۔ اسی طرح اگر کبھی بھولے سے وہ / ساقی / سے خطاب کرلیں تو پھر اسے آساقی سے مچھڑتے نہیں۔ ان کی کئی نظمیں السلام سے شروع ہوتی ہیں۔ یہی حال / الحفیظ / الاماں / الحذر کا بھی ہے۔ ان لفظوں کے صرف میں وہ ایسی فیاضی برتتے ہیں کہ معنیاتی روح متاثر ہوتی ہے اور خالی لفظ باقی رہ جاتے ہیں۔

آخر میں حُسنِ نسوانی اور حُسنِ فطرت سے متعلق جوش کی اُن نظموں سے بھی استنباط ضروری ہے، جن کی طرف سے شروع میں اشارہ کیا گیا تھا اور جنہیں "منظریہ" کا نام دینا زیادہ مناسب ہوگا۔ ان نظموں کا ذکر کرتے ہوئے "شکستِ زنداں کا خواب" اور "وفادارانِ ازلی کا پیامِ شہنشاہِ ہندوستان کے نام" جیسی باغیانہ نظموں کو بھی نظر میں رکھنا ضروری ہے۔ کیونکہ بیانیہ اسلوبیاتی پیرایہ اور تخلیقی قوت کا سرشتہ ایک ہی ہے۔ "شکستِ زنداں کا خواب" ۱۹۲۱ء میں تحریکِ خلافت کے زمانۂ عروج میں لکھی گئی تھی۔ اس کے سات سال بعد یعنی ۱۹۲۷ء میں لکھی ہوئی ایک منظریہ نظم کا بند ملاحظہ ہو:

اُٹھو وہ صبح کا غنچہ کھلا، زنجیرِ شب ٹوٹی
وہ دیکھو پو پھٹی، غنچے کھلے، پہلی کرن پھوٹی!

اُٹھو، چونکو، بڑھو، منہ ہاتھ دھو، آنکھوں کو مل ڈالو
ہوائے انقلاب آنے کو ہے ہندوستاں والو!

—— آثارِ انقلاب

اس میں صبح کے غنچے کے کھلنے اور زنجیرِ شب کے ٹوٹنے سے قطع نظر /اُٹھو / دیکھو / چونکو / بڑھو / کی گونج سے معاً "شکستِ زنداں کا خواب" کے آخری شعر کی یاد تازہ ہو جاتی ہے:

سنبھلو کہ وہ زنداں گونج اُٹھا، جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اُٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں، دوڑو کہ وہ ٹوٹیں زنجیریں

/سنبھلو/ جھپٹو/ اُٹھو / دوڑو / کیا یہ افعال اور صرف یہ کلمات ایک باغی سالار کی للکار کے غماز نہیں۔ افعال کی یہ یورش جوش کے یہاں کئی جگہ نظر آتی ہے اور ایک خاص کیفیت پیدا کرتی ہے جوش کے یہاں متوازیت PARALLELISM ایک خاص جمالیاتی کردار ادا کرتی ہے۔

"بدلی کا چاند" سے یہ منظر دیکھئے:

خورشید وہ دیکھو ڈوب گیا، ظلمت کا نشاں لہرانے لگا
مہتاب وہ نکلے بادل سے، چاندی کے ورق برسانے لگا

سمٹی جو گھٹا تاریکی میں چاندی کے سفینے لے کے چلا
سنکی جو ہوا، تو بادل کے گرداب میں غوطے کھانے لگا

پردہ جو اٹھایا بادل کا، دریا پہ تبسم دوڑ گیا!
چلمن جو گرائی بدلی کی، میدان کا دل گھبرانے لگا

اُبھرا تو تجلی دوڑ گئی، ڈوبا تو فلک بے نور ہوا
اُلجھا تو سیاہی دوڑا دی، سلجھا تو ضیا برسانے لگا

قافیے، ردیف کی فعلیت سے قطع نظر مصرعوں کے اندر کے یہ ٹکڑے غور طلب ہیں۔ /سمٹی جو گھٹا/ سنکی جو ہوا/ پردہ جو اٹھایا بادل کا/ چلمن جو گرائی بدلی کی/ اُبھرا/ اُلجھا/ ڈوبا/ سلجھا/ یہ ساخت باہم دگر مربوط مصرعوں کی یکساں صرفی مطابقت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اس وضاحت کی ضرورت نہیں کہ یہ فعلیہ متوازیت کسی طرح غیر شعوری یا شعوری طور پر تخلیقی عمل کا حصہ بن جاتی ہے اور شعر میں لطف و تاثر کا جادو جگاتی ہے۔ اب اس کا دوسرا پہلو بھی دیکھیے۔ ذیل کی مختصر نظم "روپ متی" جو نسوانی حسن کی مرقع کشی کا شاہکار ہے، اسمار کے استعمال کا شاہکار بھی ہے۔ آٹھ اشعار کی اس نظم میں ایک بھی فعل نہیں۔ داخلی ساخت میں فعل کا وجود ہے۔ ....

.... لیکن خارجی ساخت میں اس کا یکسر حذف ہوا ہے:

رخسار میں شمعِ کعبہ کی ضَو
آنکھوں میں چراغِ دیر کی لَو
خوش پیکر و خوش جمال و خوش رُو
چھٹکی ہوئی چاندنی لبِ جو
پلکوں کی جھپک میں مسکراہٹ
شعلے کی خفیف تھرتھراہٹ
برسات کی راگنی کی تانیں
غلطیدہ حسین دست و باہیں
انفاس میں کمسنی کی خوشبو
بنگال کا، انکھڑیوں میں جادو
چہرے پہ شباب کا تلاطم
بت خانے کی صبح کا تبسم
عارض میں دمک، دمک میں ندرت
برسات کے چاند کی لطافت
رس کی بوندیں کہ نرم باتیں!
آواز میں مالوے کی راتیں!

بالکل یہی اسلوبیاتی کیفیت "گرمی اور دیہاتی بازار" کی بھی ہے۔ سارا ڈھانچہ اسمار پر ٹکا ہوا ہے۔ کہیں کہیں فعل ہونا کی شکلیں ہیں۔ یہ نظم بھی جوش کی شاہکار نظم ہے اور تمام تر کمال پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے:

دوپہر، بازار کا دن، گاؤں کی خلقت کا شور
خون کی پیاسی شعاعیں، روح فرسا لُو کا زور
آگ کی رَو، کاروبارِ زندگی کا پیچ و تاب
تند شعلے، سُرخ ذرّے، گرم جھونکے، آفتاب
شور، ہلچل، غلغلہ، ہیجان، لُو، گرمی، غبار
بَیل، گھوڑے، بکریاں، بھیڑیں، قطار اندر قطار
مکھیوں کی بھنبھناہٹ، گڑ کی بُو، مرچوں کی دھانس
خربزے، آلو، کھلی، گیہوں، کدو، تربوز، گھاس
دھوپ کی شدت، ہوا کی یورشیں، گرمی کی رَو
کملیوں پر سُرخ چاول، ٹاٹ کے ٹکڑوں پہ جَو

گرم ذرّوں کے شدائد، جھکّڑوں کی سختیاں
جھکّڑوں میں کھانستے بوڑھوں کی چلموں کا دھواں
ماؤں کے کاندھوں پہ بچے، گردنیں ڈالے ہوئے
بھوک کی آنکھوں کے تارے پیاس کے پالے ہوئے
بام و در لرزے ہوئے خورشید کی آفات سے
ہر نفس اک آنچ سی اٹھتی ہوئی ذرّات سے
مردوزن گردش میں چلموں کی صدا سنتے ہوئے
چلچلاتی دھوپ کی رَو میں چنے بھنتے ہوئے
میان سے موسم کی تیغ بے اماں نکلی ہوئی
پیاس سے انسان و حیواں کی زباں نکلی ہوئی
لو کے مارے بام و در کی روح گھبرائی ہوئی
دوستوں کی شکل پر بیگانگی چھائی ہوئی
یوں شعاعیں سایۂ اشجار سے چھنتی ہوئی
بے مروّت کی سپاٹ آنکھوں کی جیسے روشنی
آسماں پر ابر کے بھٹکے ہوئے ٹکڑوں کا رَم
نشے میں ممسک کا جیسے وعدۂ جود و کرم
ہر روش پر چیٹر چڑا پن، ہر صدا میں بے رُخی
ہر جگہ بھنّنا ہوا، ہر کھوپڑی پکتی ہوئی
سر پہ کافر دھوپ، جیسے روح پر عکسِ گناہ
تیز کرنیں، جیسے بوڑھے سُود خواروں کی نگاہ
(گرمی اور دیہاتی بازار)

جوش کی شاعری کا ایک بڑا حصّہ اس نوع کی نظموں پر مشتمل ہے جسے بالعموم شبابیات کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ نام اس اعتبار سے ان نظموں کی صحیح عکاسی نہیں کرتا کیوں کہ اس میں فقط حسنِ ظاہری کا بیان ہے۔ انسانی رشتوں کی کشاکش، پیچیدگیاں یا تہہ داری نہیں ہے۔ یہ اس نوع کا رواں دواں اور سبک بیانیہ ہیں۔ جس میں نسوانی حُسن کے اُبھار اور نکھار کو طرح طرح سے بیان کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دیکھنے والی آنکھ بوالہوسی کا زاویہ رکھتی ہے اور جوش اس کو کوئی راز بھی نہیں بناتے۔ کوہستانِ دکن کی عورتیں (پھٹ پڑا ہے جس پہ طوفان خیز پتھریلا شباب) کا بیان ہے۔ محوِ سخن ہوتے ہی کھلتے ہیں:

جسم ہیں کچھ اس قدر ٹھوس، الحفیظ و الاماں
نیچے جھٹکو تو پھسل جائیں خود اپنی اُنگلیاں

گویا شبابیات ذرا سے اشارے سے شہوانیات میں بدل جاتی ہے۔ اگر اس سے جمالیاتی اثر آفرینی ہوتی ہے تو یہ بھی ادب کی نوع ہے اور اگر نری جذباتیت یا بدذوقی ہے تو لا حاصل ہے۔ ویسے دنیا بھر کی زبانوں میں اس نوع کا ادب ملتا ہے۔ اس کی قاموسیں موجود ہیں۔ جوش کی شاعری کے ضمن میں کسی اخلاقی لیپ پوت کی ضرورت نہیں۔ یوں بھی کہ خود جوش نے اس پر کوئی پردہ نہیں ڈالا۔ جوش کے بعض سرکاری مداح خواہ مخواہ اس بارے میں شرمندہ ہوتے ہیں اور تاویلیں لاتے ہیں۔ ہوس کاری بالذّت اندوزی کے متعینہ معنی کہیں سے نازل نہیں ہوئے۔ خود ہمارے گھڑے اور قائم کئے ہوئے ہیں۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے ان معمولہ اخلاقی تصورات کو الگ کر دیں تو اندازہ ہوگا کہ بعض نظمیں (اگر کمزور اشعار کو حذف کر دیا جائے) کیف و کم کا شاہکار ہیں اور ان میں نسوانی جسم و جمال کی کشش اور لطافتوں کی جو مرقع کشی کی گئی ہے، بے مثال جمالیاتی ترفع رکھتی ہے۔ نوعیت ان کی بھی منظریہ ہے۔ لیکن حُسن کی یہ منظر کشی کہیں کہیں ربودگی کا عالم پیدا کر دیتی ہے، ان کی طوالت اور بھرتی کے اشعار ہیں جو رخنہ انداز ہوتے ہیں، ورنہ ان میں ایسے گوہرِ آبدار کی کمی نہیں جو 'شرنگار رس' میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ جوش کی اس نوع کی نظموں میں "بیں جامن والیاں" "بدلی کا چاند" "فتنۂ خانقاہ" "دوپٹے کو مسلے بدن کو چرائے" "گنگا کے گھاٹ پر" "جنگل کی شہزادی" "دھوپ چھاؤں" "الفرکامنی" "کیا گل بدنی ہے" اور "رنگین رات کا پچھلا پہر" کا شمار کرتا ہوں۔ ان سب کا جائزہ تو ممکن نہیں۔ دو تین حوالوں سے بات واضح ہو جائے گی۔ پہلے "گنگا گھاٹ پر" سے یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بڑھائے سُرخیٔ عارض ہوائے صحرا سے
نہا یا کون چلا آ رہا ہے گنگا سے
سرا ڈُلائی کا سر پر نظر جُھکائے ہوئے
دبائے دانتوں میں آنچل، بدن چُرائے ہوئے
دراز زلف میں جادو، سیاہ آنکھ میں مدھ
نسیمِ صبحِ بنارس، ہلالِ شامِ اودھ
خنک نسیم سے اُبھرے ہوئے نقوشِ شباب
صبا تھمی ہیں کہ برسات کی شبِ مہتاب
نمی ہے زلف میں، اشنان کر کے نکلی ہے
یہ کس کی موت کا سامان کر کے نکلی ہے

"جنگل کی شہزادی" بھی مزے کی نظم ہے جس میں ریل کے جنگل میں رُکنے اور ایک لڑکی کے حُسن کا نظارہ کرنے کا منظر ہے۔ جو طلسماتی کیفیت رکھتا ہے۔ جوش کی قادرالکلامی اس وقت ایک اور ہی شان رکھتی ہے جب وہ شباب کی آمد آمد یا کم سنی کے حُسن کا بیان کر رہے ہوں۔ "روپ متی" کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ "الفرکامنی" اور "دھوپ چھاؤں" بھی کمال کی نظمیں ہیں۔ ان منتخب اشعار کی منظریہ ربودگی، ترفع اور جمالیاتی اثر آفرینی سے بھلا کون انکار کر سکتا ہے:

ناز سے چونکی ہے یوں اک مست الھڑ کامنی
جیسے اخلاقی کرن سے رسمساتی ہے ندی
چاند سے ماتھے پہ جنبش میں مہکتی کا کلیں
کاکلوں کے زیرِ سایہ چھوٹ پڑنے کی موہنی
کروٹوں میں کم سنی کے ولولوں کی چٹکیاں
انکھڑیوں میں بھیر دیں انگڑائیاں لیتی ہوئی
کروٹوں سے کھل رہا ہے جسم کا یوں بند بند
کھل رہی ہے ناز سے گویا چنبیلی کی کلی
صبح کے مسلے ہوئے بستر پہ قامت کی پھبن
"شام" کے ترشے ہوئے ہونٹوں پہ جیسے بانسری
کانپتی لو سے لب و رخسار پہ وہ دھوپ چھاؤں
پھول بن میں جیسے اڑتے جگنوؤں کی روشنی
خفتہ باسی ہار پر بکھری ہوئی زلف دوتا
اور بکھری زلف میں الجھی ہوئی چمپا کلی
بن کے ڈھلے مکھڑے پر ایسی مسکراہٹ جس طرح
پنکھڑی کی اوس پر پچھلے پہر کی چاندنی!

(الھڑ کامنی)

رس، نیم سفید، نیم دھانی
آئینۂ طفلی و جوانی!
چڑھتا ہوا دلبری کا پارا
مڑتا ہوا کم سنی کا دھارا
رنگینیِ جسم سے، سحر کا
باریک مچھا ہوا شعلہ کا
شوخی میں صبا کی کسمساہٹ
بھیکے ہوئے تن میں گنگناہٹ
انگڑائی کے لوچ میں جماہی
اربابِ نگاہ کی تباہی
تن، نیم رسیدگی کے رس میں
رفتار نہیں خود اپنے بس میں
آنکھوں کی تہوں میں دھندلے دھندلے
نادیدہ و پرفسوں جزیرے
لہجے میں سرود کی چبھن سی،
آواز میں پھوٹتی کرن سی!
آنکھوں میں چڑھتی ہوئی پر آئیں
بھیگی ہوئی مالوے کی راتیں
پیچیدہ صبا، کلی کے تن میں
لو سی پھٹتی ہوئی بدن میں

پچھم کی طرف، روانہ مدھم
کرنوں کی عماریوں میں شبنم
ہر نقشِ قدم میں صبحِ بنگال!
پُل پر چڑھتے ہوئے مہ و سال
طفلی سے شباب کا تفنن
عقدے کے افق پہ صبحِ ناخن
تن میں طوفان ہو رہا ہے
یہ کون جوان ہو رہا ہے

(دھوپ چھاؤں)

ان نظموں کے منتخب اشعار پیش کرنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ان سے علاوہ جوش کی قادر الکلامی کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لانے کے اس بات کی بھی وضاحت ہو جائے کہ جہاں جوش نے اپنی تخلیقی قوت کو قابو میں رکھا ہے، اور اپنی جذباتیت کو زیرِ دام لاکر ضبط سے کام لیا ہے، نظم بے مثال ہو گئی ہے۔ اس پائے کی دوسری نظمیں "جادو کی سرزمین"، "آواز کی سیڑھیاں" اور "البیلی صبح" ہیں۔ جو اپنی طرح داری اور حسن کاری میں "الھڑ کامنی"، "دھوپ چھاؤں" اور "روپ متی" سے کسی طرح کم نہیں۔ اگر اوراق کی کوتاہ دامانی مانع نہ ہوتی تو ان نظموں پر بھی نظر ڈالی جاتی اور ان سے بحث کی جاتی۔ کیوں کہ جب تک متن نگاہ میں نہ ہو، ان کے لطف و اثر کا اندازہ لگانا ناممکن ہے اور یہ معلوم کرنا نہایت دشوار ہے کہ اپنی ایسی نظموں میں جوش نے بیانیہ شاعری کی کن بلندیوں کو چھو لیا ہے۔
برسات جوش کا پسندیدہ موضوع ہے۔ اس پر جوش نے "بھری برسات کی روح"، "برسات کی پہلی گھٹا"، "رم جھم"، "برسات ہے برسات"، "برسات کی چاندنی"، "برسات کی شفق"، "ساون کے مہینے" بیسیوں نظمیں کہی ہیں۔ یہاں آخر میں ایک چھوٹی سی نظم "برسات کی ایک شام" (راجپوتانہ) پیش کی جا رہی ہے۔ جس سے ان تمام باتوں کی توثیق ہو جائے گی جو جوش کی اس پائے کی نظموں کے بارے میں اوپر کہی گئی ہیں:

خنک ہواؤں میں اٹھتی جوانیوں کا خرام
کنارِ دشت میں برسات کی گلابی شام
زمیں کے چہرۂ رنگیں پہ آسماں کی ترنگ
خنک ہواؤں کی بھیگی ہوئی تہوں کا رنگ
فلک پہ بازیِ طفلانۂ ابر پاروں کی
ندی کے موڑ پہ انگڑائیاں نگاروں کی
ہر ایک ذرّے میں ہیجان مست ہونے کا
ذرا سا ریل کی پٹڑی پہ رنگ سونے کا

شفق، ہلال، ندی، رنگ، ابر، سبزہ، ہوا
ہوا میں مور کی آواز، جھینگروں کی صدا
خفیف زمزمہ، امواج کی روانی میں
فلک پہ رنگ، درختوں کے سائے پانی میں
فضا شگفتہ، گھٹا لال گوں، شفق چنچال
ہوا لطیف، زمیں نرم، آسماں سیّال
یہ جاں فروز مناظر، کہ دل لبھاتے ہیں
بچھڑ گیا ہوں کسی سے تو کھائے جاتے ہیں

یہ تو جوش پر تحقیق کرنے والے ہی بتائیں گے کہ جوش نے کتنے ہزار اشعار کا سرمایہ یادگار چھوڑا ہے۔ ایک عام تخمینے کے مطابق جوش نے پچاس ہزار اشعار سے کم کیا کہے ہوں گے۔ بیانیہ شاعری میں فیاضی اور فراوانی کی راہیں تو بہرحال کھلی ہی رہتی ہیں۔ قصیدے اور مسدس کی روایت کا شاعر جب کہنے پر آتا ہے تو سمجھا یہی جاتا ہے کہ موتیوں کے دریا بہا رہا ہے اور جوش کے مداح انہیں یہ باور کراتے بھی تھے۔ یہی زمانے کا رنگ بھی تھا۔ تاہم اشعار کے اس انبار میں گہرہائے آب دار کی بھی کمی نہیں۔ ایسے مقامات بھی آئے ہیں اور بار بار آئے ہیں، جہاں نظم کے آداب کا لحاظ رکھتے ہوئے اور اپنی تخلیقی قوت کو قابو میں لا کر جوش نے اپنی قادر الکلامی سے صحیح کام لیا ہے۔ بیانیہ اور منظریہ شاعری دونوں میں انہوں نے ایسے ایسے شاہکار چھوڑے ہیں جن کی کلاسیکی رچاؤ، حسن کاری اور سدا تابانی کے نقش کو زمانہ آسانی سے دھندلا نہ سکے گا۔ "ہماری برسات" "شکستِ زنداں کا خواب" "کسان" "گرمی اور دیہاتی بازار" "بدلی کا چاند" "روپ متی" "الھڑ کامنی" "دھوپ چھاؤں" "البیلی صبح" "برسات کی ایک شام" ہماری نظر میں اونچے پائے کی نظمیں ہیں کہ یہ بیسویں صدی کے اردو نظم کے سخت سے سخت انتخاب میں بھی جگہ پائیں گی۔ اور ان کے بغیر اردو نظم کی کوئی بحث مکمل ہی نہیں ہو سکتی۔ جوش ایک منفرد شاعر تھے، اپنی آواز کے اعتبار سے بھی، اور مزاج کے اعتبار سے بھی۔ ہر ہر طرح پر انہوں نے مسلمات پر شدید ضرب لگائی۔ ان کے کردار کا روشن ترین پہلو یہی ہے کہ انہوں نے ہر ہر تعصب سے بغاوت کی۔ وہ سماج کے بھی باغی تھے، سیاست کے بھی باغی تھے، اخلاق کے بھی باغی تھے۔ اور تو اور انہوں نے خود اپنے آپ سے بھی بغاوت کی۔ یعنی آدرشوں اور قدروں کو بھی پاش پاش کرنے سے نہیں چوکے جنہیں انہوں نے خود تراشا اور سنوارا تھا۔ یہی ان کا کارنامہ ہے، اور یہی ان کا المیہ۔

●●

سفارش

شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی کی شاعری میں بڑا زور، بڑا ولولہ تھا، مگر ان کی طبیعت میں بچوں جیسی سادگی پائی جاتی تھی۔ کنور مہندر سنگھ بیدی برسوں جوش کے ہم نوالہ و ہم پیالہ رہے۔ انہوں نے اپنی مزے دار آپ بیتی "یادوں کا جشن" میں لکھا ہے کہ جن دنوں جوش صاحب رسالہ "آج کل" کے ایڈیٹر تھے، ان کے تین نائب ہوا کرتے تھے۔ عرش ملسیانی، جگن ناتھ آزاد اور سردار بلونت سنگھ۔ سردار بلونت سنگھ ایک روز جوش کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ مجھے پستول کے لائسنس کی ضرورت ہے۔ مگر پستول کا لائسنس صرف چیف کمشنر دہلی دے سکتا ہے۔ ان دنوں شنکر پرشاد جی چیف کمشنر تھے۔ وہ جوش صاحب کی بہت قدر کرتے تھے۔ جوش صاحب سردار بلونت سنگھ کو لے کر ان کے پاس گئے۔ شنکر پرشاد جی نے پوچھا کہ "جوش صاحب! کہیے کیسے تشریف لائے؟" جوش صاحب نے بلونت سنگھ سے کہا: "بھئی بتاؤ، ہم کیسے آئے ہیں؟" بلونت سنگھ نے کہا: "مجھے پستول کا لائسنس چاہیے۔" شنکر پرشاد جی کہنے لگے: "بلونت سنگھ جی، آپ ایک رسالے کے نائب ایڈیٹر ہیں۔ بھلا آپ کو اس کی کیا ضرورت ہے۔" جوش صاحب نے کہا: "بلونت سنگھ جی، شنکر پرشاد جی صحیح فرما رہے ہیں۔ ایک ایڈیٹر، نائب ایڈیٹر کو پستول کی کیا ضرورت ہے؟" بلونت سنگھ، شنکر پرشاد جی سے مخاطب ہوئے اور کہا کہ "میرا گھر دور ہے اور شام کو دیر سے گھر پہنچتا ہوں۔ اندھیرا ہو جاتا ہے، راستہ مخدوش ہے اس لئے پستول کی ضرورت ہے۔" جوش صاحب بھی کہنے لگے کہ "بلونت سنگھ کا کہنا درست ہے یہ دیر سے گھر جاتے ہیں۔ راستہ مخدوش ہے۔ انہیں پستول چاہیے۔" شنکر پرشاد صاحب نے بلونت سنگھ سے کہا: "آپ دفتر سے اٹھ کر سیدھے گھر چلے جایا کیجیے۔" بلونت سنگھ نے کہا کہ "بعض اوقات میرے پاس دفتر کا کچھ کیش ہوتا ہے۔ اس کی حفاظت کے لئے بھی پستول ضروری ہے۔" جوش صاحب نے کہا کہ "یہ بات تو درست ہے۔ کیش کی حفاظت کے لئے پستول درکار ہے۔" شنکر پرشاد جی نے کہا کہ "دفتر کا کیش گھر لے جانے کی کیا ضرورت ہے؟ اسے دفتر ہی میں جمع کر دینا چاہیے۔" جوش صاحب نے بھی ہاں میں ہاں ملائی، اور کہنے لگے: "بلونت سنگھ! شنکر پرشاد جی بالکل درست فرما رہے ہیں۔ دفتر کا کیش دفتر ہی میں جمع ہونا چاہیے۔" اس پر بلونت سنگھ نے دم توڑ دیا اور ہاتھ جوڑ کر جوش صاحب سے کہنے لگے کہ "جوش صاحب، مجھے لائسنس ملے یا نہ ملے۔ آپ خدا کے لئے خاموش رہیے۔ میں آپ کی سفارش سے باز آیا۔" شنکر پرشاد جی ہنسنے لگے اور فرمانے لگے۔ "بلونت سنگھ جی! آپ جوش صاحب کو ساتھ لے کر آئے ہیں۔ میں آپ کو لائسنس ضرور دے دوں گا۔"

●● مرسلہ: نسیمہ بیگم، کراچی

وارث کرمانی

جوش کی شاعری پر ایک نظر

جوش ملیح آبادی کسی حد تک متنازعہ فیہ شاعر ہونے کے باوجود اپنے عہد پر حاوی رہے ہیں۔ میری نوعمری میں جوش اپنے اوج کمال پر تھے۔ اقبال کا انتقال ہو چکا تھا۔ فیض، مخدوم، جذبی، مجاز وغیرہ ابھر رہے تھے اور عمر اور شاعرانہ قد و قامت دونوں میں جوش سے کوئی نسبت نہیں رکھتے تھے۔ فانی، اصغر، جگر، حسرت اور یگانہ وغیرہ سے ان کا ٹکراؤ نہیں تھا۔ یہ لوگ شہسوارانِ بساطِ غزل تھے۔ جوش کا مزاج غزل کی نرمی و نزاکت اور رمزیت کا متحمل نہیں تھا۔ ان کی پروازِ فکر تو نقارۂ افلاک بجادینے پر آمادہ تھی۔ اتفاق سے وہ نظم کے عروج کا زمانہ بھی تھا اور غزل سے ایک عام بدظنی کی فضا سی باقی تھی۔ پھر کیا تھا وہ برصغیر کے شہنشاہِ سخن بن گئے۔ ملک کے طول و عرض میں ان کا طوطی بولنے لگا۔ دہلی، کلکتہ، بمبئی اور حیدرآباد جیسے بڑے شہر انہوں نے فتح کر ڈالے۔ لکھنؤ تو خیر ان کا وطن ہی تھا۔ تحریک آزادی سے وابستہ ہونے کے بعد ان کی تیغ سخن پر نئی دھار اور نئی کاٹ پیدا ہو گئی جس نے ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو کو بھی زخمی کئے بغیر نہ چھوڑا۔ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۵ء بلکہ کچھ اور آگے تک معلوم ہوتا تھا پورا ہندوستان سمٹ کر ایک چٹائی ہو گیا ہے اور اس چٹائی پر ایک دیو کھڑا ہے جس کا سر آسمان سے باتیں کر رہا ہے اور جس کی آواز کی گھن گرج اور لفظوں کی سحر انگیزی کے سامنے میر سے اقبال تک سارے اردو شاعر سر جھکائے کھڑے ہیں۔ معاصرین کا یہ حال کہ بڑے سے بڑا شاعر اور نقاد جوش کے سیلاب سخن کے آگے ٹھہر نہیں پاتا تھا اور جوش کی قربت اور دوستی میں فخر محسوس کرتا تھا۔ یہاں تک کہ ترقی پسند تحریک کے سربراہ ادیب جوش کو اپنا ساتھی اور ہم نوا ثابت کرتے تھے۔ حالانکہ ترقی پسند تحریک اور جوش میں بعد المشرقین تھا۔ مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے کہ جوش اپنے زمانے کے بہت سر بلند شاعر تھے اور اقبال کے بعد تو انہیں یکتائے زمانہ کہا جا سکتا تھا۔ ان کا یہ دعویٰ بہت زیادہ تعلّی پر مبنی نہیں تھا۔

اے روح عصر حاضر و ہندوستان نو
لایا ہے اک صحیفۂ سخنداں ترے لئے

اس صحیفِ عظیم کی اللہ ری وسعتیں
ہر حد ہے مشرقین بداماں ترے لئے

فراق جنہیں بعض حلقوں میں، بالخصوص نئے انداز کی غزل میں، جوش پر فوقیت حاصل تھی خود کو باوجود انانیت جوش سے کمتر رکھتے تھے۔ نیاز فتحپوری، مولانا آزاد، عبدالماجد دریابادی اور ان کے درجے کے دوسرے اہل علم جوش کی شوخ بیانی، طنز و مزاح، حتیٰ کہ تمسخرانہ جملوں کو ہنس کر برداشت کرتے تھے۔ کیا یہ جوش کے پٹھان ہونے سے ڈرتے تھے یا ان کی تعلقداری کے رعب میں رہتے تھے؟ نہیں، وہ جوش کی شاعرانہ عظمت کے آگے مہر بلب تھے۔

پھر ایسا ہوا کہ شعر گوئی و شعر فہمی اور تنقید نگاری 'ضرورت سے زیادہ' پڑھے لکھے ادیبوں کے زیر سایہ آگئی۔ ان کتاب زدہ لوگوں نے تنقید کے بے جان اور مغرب کے بے محل اصولوں پر شاعری کا محاسبہ شروع کر دیا اور اپنی ارتھمیٹک میں جوش کو فیل کر دیا۔ پھر اس قسم کے اعتراضات ہونے لگے جیسے طول کلام، خیالات کا دہرانا، رعب ڈالنے والا انداز بیان، فکر و فلسفے کا فقدان، مبالغہ آرائی، تصنع، تعلّی اور انانیت وغیرہ وغیرہ۔ اس موقع پر یہ کہنا ضروری ہے کہ راقم کو نہ جوش کی ان خامیوں کی مدافعت مقصود ہے اور نہ پہلے بیان کردہ خوبیوں کا اثبات پیش نظر ہے۔ جوش کا ایک متوازن محاسبہ آگے پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ لیکن چونکہ متوازن ہونا بھی ایک اضافی چیز ہے اور ہر شخص کی نظر کا توازن الگ الگ ہو سکتا ہے۔ اس لئے میں پہلے ہی صاف گوئی کے ساتھ اپنے تنقیدی رویے کا اظہار کر دوں۔

کہ ہر چند میں مغربی تنقید کا بہت احترام کرتا ہوں اور موجودہ ادبی تنقید زیادہ تر مغرب سے مستعار ہے اور میں خود اس پر عامل ہوں اور یہ بھی صحیح ہے کہ ہمارے یہاں تذکروں میں جس قسم کی ادبی تنقید ملتی ہے وہ تقریباً سوانح نگاری اور توصیفی اور مبالغہ آمیز ہے پھر بھی اردو اور فارسی شاعری کو پرکھنے کے لئے اس کی واقفیت ضروری ہے اور اس کی روایت کو نظر انداز کر کے محض مغربی تنقید کے اصولوں کے تحت اردو شاعری کا احتساب کرنا صحیح نتائج تک نہیں پہنچا سکتا۔ خود امریکہ اور انگلینڈ کے ناقدین کا یہی خیال ہے کہ ڈرائڈن اور پوپ سے لے کر آج بیسویں صدی کی آخری دہائی تک

اشروانی کوٹھی، سول لائنس، دودھپور، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲ (یو۔پی)

کوئی مغربی نقاد یا مفکر ایسا نہیں ہے جو اردو فارسی شاعری کا پورا عرفان حاصل کر سکے۔ اگرچہ نظری طور سے ان کی تنقیدی نگارشات بہت بصیرت افروز ہیں۔ انہیں یہ بھی اعتراض ہے کہ ہم اپنی روایتوں اور اپنے دانشوروں کو چھوڑ کر دوسری تہذیب اور روایت کے لوگوں کو اپنے مضامین میں کیوں جگہ بے جگہ پیش کرتے رہتے ہیں۔ دراصل اس ادبی رویے کی ابتدا مولانا حالی سے ہوتی ہے۔ جنہوں نے خود بے مثال اور بڑی حسین غزلیں کہنے کے باوجود انگریزی ادب کے رعب میں آکر غزل کو ناپاک دفتر کہا۔ پھر کلیم الدین احمد نے اُسے نیم وحشی صنفِ سخن قرار دیا۔ اور ان کے علاوہ بھی مختلف تحریکوں میں غنائی شاعری کے ساتھ ناروا سلوک برتا گیا اور اخلاقی و مذہبی رجحانات کے علاوہ سیاسی و سماجی واقعہ نگاری کو فروغ دیا گیا۔

برصغیر میں ایک ہزار برس سے جس روایت کے تحت اردو فارسی شاعری ہو رہی تھی، جوش کا کلام اُسی روایت کی تصدیق کرتا ہے اور اُسی پر اپنی بنیاد قائم کئے ہوئے ہے۔ اگرچہ جوش نے غزل کم کہی اور نظم اور رباعی کی طرف زیادہ توجہ کی لیکن ان کی نظم گوئی سے بھی ہزار سالہ عجمی روایت کی گرفت ڈھیلی نہیں پڑی۔ یہ بھی ایک تشریح طلب مسئلہ ہے۔ بظاہر جوش کا غزل کے بجائے نظم کہنا اُس وقت کے نئے نقادوں کے منشا کے عین مطابق تھا بلکہ موضوعات بھی عصری تقاضوں کو پورا کر رہے تھے۔ جیسے مزدور کی تعریف، مناظر فطرت کی عکاسی، عقل پسندی کی تبلیغ، سرمایہ داروں کے خلاف غم و غصہ کا اظہار، [illegible] اور ملا کی تضحیک۔ تو پھر یہ ضرورت سے زیادہ پڑھے لکھے نقاد یا جدید مزاج کے دعوے دار جوش کو بُرا کیوں کہتے تھے؟ اسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس میں بھی ایک نکتہ پوشیدہ ہے جس سے یہ معترضین خود آگاہ نہ تھے اور ادھر اُدھر کے فروعی الزامات جن کا ذکر شروع میں کیا جا چکا ہے، جوش کے سر لگاتے رہتے تھے۔ دراصل یہ لوگ اُسی حالی اور کلیم الدین احمد والی 'بدعت' کے تحت جوش سے بدکتے تھے۔ کیونکہ جوش نظم نگاری کے باوجود غزل ہی کے شاعر تھے۔ ان کی تمام تر شاعری غنائیت میں ڈوبی ہوئی ہے۔ غزل کی غنائیت اسی وسیع تر غنائیت کا جزو ہے۔ اسی لئے یہ لوگ ان کی نظم گوئی سے مطمئن نہ تھے۔ کیونکہ بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں نظم کا ڈکشن بدل رہا تھا۔ یہ ایک جدید رجحان تھا جس میں ترقی پسند شاعر اور حلقۂ ارباب ذوق والے شاعر برابر کے شریک تھے بلکہ آخرالذکر گروہ میں زیادہ اجتہاد تھا مثلاً میرا جی کی نظمیں بالکل ہی علیحدہ نوعیت کی تھیں اور راشد بھی جوش کی طرح انتہائی فارسی آمیز شاعر ہونے کے باوجود نظم کے ڈکشن کے ساتھ عجیب قسم کی دست اندازی کر رہے تھے۔

آ مری جان مرے پاس انگیٹھی کے قریب

نظم گوئی کے اس انداز کو سامنے رکھنے سے جوش کی نظموں کا تغزل سمجھ میں آسکتا ہے۔ میرا جی اور راشد تو علیحدہ نوعیت رکھتے تھے۔ فیض، مجاز، مخدوم، مجید امجد، کیفی اعظمی جنہیں جوش کے ڈکشن کے بہت قریب کہا جا سکتا ہے۔ ایسی نظمیں کہہ رہے تھے جن کا لہجہ جوش کی طرح کلاسیکی نہیں تھا۔ بات یہ ہے کہ جوش کے زمانے میں نئی تنقید ایک طرف مقصدیت کے تحت مطالب کے ابلاغ اور پروپیگنڈے پر زور دے رہی تھی تو دوسری طرف ایجاز و اختصار کے ساتھ دھیمی آواز میں احساسات کے اظہار کو شاعری کی خوبی سمجھتی تھی جس کے نتیجے میں شعری مجموعوں کے نام "سرگوشیاں" اور "سخن مختصر" وغیرہ رکھے جا رہے تھے۔ جوش کے یہاں ان دونوں خوبیوں کا فقدان تھا۔ شاعری کا یہ تصور مغرب سے زیادہ میل کھاتا ہے جبکہ مشرق کی شاعری یعنی عربی فارسی اور اردو میں اگرچہ تفصیلِ کلام اور اختصار کی تعریف کی گئی ہے، لیکن عملی طور سے ایسا نہیں ہوا۔ اردو کے مایۂ ناز شاعر میر انیس کہتے ہیں:

گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

لیکن میر انیس کی یہ تعلّی جسے نئی تنقید طولِ کلام ٹھہرا چکی تھی۔ جوش کے فکر و فن کا سارا سرمایہ تھی۔ بے شک ان کا انداز بیان اور قدرتِ کلام اردو شاعری میں منفرد اور خاصے کی چیز تھا۔ اور یہ طباعی اور زور بیان کسی دوسرے شاعر کے حصے میں نہیں آیا تاہم اس خوبی کے علاوہ جوش کی شاعری میں اور بہت کچھ ہے جس کی پوری قدر نہیں کی گئی بلکہ بعض لوگوں نے جوش کی شاعری کا ایسا ماتم کیا جیسے ان کے یہاں صرف لفاظی اور ڈھول میں پول ہے۔ یہ اہل نظر جوش کی شاعری میں مسجد قرطبہ کی فکر یا فیض کی علامتی نظموں کا پیچ و تاب یا اختر الایمان کے کھردرے لہجے کی دل گرفتگی اور گداز فکر ڈھونڈتے رہے۔ جب کہ جوش کا اپنا بانکپن، ان کی شخصیت کی بے مثال گلکاری اور ان کے تخیل کی پرواز انہیں چیخ چیخ کر آواز دیتی رہی۔ جوش کی شاعری کا وسیع کینوس جس میں ہندوستان کا جلال و جمال اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جھلکتا تھا۔ اور جس میں ہندوستانی زندگی کو نصف صدی تک مختلف سطحوں اور مختلف علاقوں میں برتنے کے تجربات کروٹیں لیتے تھے اور جس میں ایک بڑے شاعر کی باغ و بہار طبیعت کا 'اُبال' اس کی رنگینی و رعنائی و برنائی منعکس تھی۔ اردو زبان کا قابلِ قدر ہی نہیں 'قابلِ فخر' کارنامہ ہے جس کو سجا بنا کر ادب کے بازار میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ میں نظموں کے طولانی اقتباس بطور مثال پیش کرنے سے گریز کر رہا ہوں۔ لیکن "گرمی" اور "دیہاتی بازار" "فتنۂ خانقاہ" "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب" "ماتم آزادی" "مولوی" "گلبدنی" جیسی سیکڑوں نظمیں ہوں گی جن میں مشاہدات و واردات و جذبات کی اتنی رنگا رنگی اور بوقلمونی ہے کہ شاید ہی کسی دوسرے اُردو کے شاعر کے یہاں ملے گی۔

ان میں زندگی کی جو تصویریں نظر آتی ہیں وہ بڑے بڑے چترکار کے برش سے بھی نمایاں نہ ہو سکیں گی۔ مختلف پیشہ وروں اور کرداروں کے مافی الضمیر کی آواز اور ان کے تحت الشعور کی آہٹوں کو شاعر نے ان کے چہروں پر ابھار دیا ہے اور انہیں خاموش زبان عطا کر دی ہے۔ جوش کے معترضین نے صرف اپنے زمانے کے فیشن کو بڑی شاعری سمجھا۔ انہوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ فیشن گریز پا ہوتا ہے جب کہ شاعری دیرپا ہوتی ہے۔ نظیر اکبرآبادی کی منظومات، غالب کا فارسی کلام بالخصوص مثنوی چراغِ دیر، کیٹس، اسپنسر اور چاسر کی نظمیں جنہیں پکچر گیلری کہا گیا ہے۔ منوچہری، فرخی اور فردوسی کے کلام کی زندہ و تابندہ نقاشی آج بھی اب تک آسمانِ

ادب پر چمک رہی ہے تو کیا جوش کا سرمایۂ سخن اس عظیم روایت کی توسیع نہیں کرتا اور اسے ہماری اردو شاعری میں قابلِ قدر اضافہ نہیں سمجھا جائے گا؟ لیکن اس کا قرارِ واقعی اعتراف نہیں کیا گیا۔ اپنی عمر کے آخری حصے میں پاکستان میں رنج کہہ اور دکھ کے اس غریب الوطن شاعر نے کس دل سے یہ اشعار کہے ہوں گے:

ادھر کوریوں نے ارجن بان مارے — ادیبوں نے یہاں خنجر چلایا
رہا میں ہند کی نظروں میں مسلم — بنا کافر جو پاکستان آیا
ہر اک نقراط آنکھیں بند کر کے — مری نادانیوں پر مسکرایا
سبک اوہام کے پالے ہوؤں نے — مرے افکار کو مکتو ہنسایا
ہزاروں بار مجھ پر مفتیوں نے — بگڑ کر کفر کا فتویٰ لگایا

اسی کا نام ہے شانِ کریمی
رحیما دا ورا مولا خدایا

جوش کی شاعری میں خامیاں اور معائب بھی ہیں بلکہ ان کی ذات میں اور بھی بہت سی برائیاں ہو سکتی ہیں۔ ہندوستان سے پاکستان ہجرت کرنے پر دونوں ملکوں کے رہنے والوں نے ان کی خامیوں کو اور بھی متعصبانہ نظر سے دیکھا۔ ادیبوں اور ادب نوازوں نے وطن سے ان کی بے وفائی اور شاعری میں ان کی بے راہ روی پر بہت واویلا کی، لیکن سوال یہ ہے کہ ہم اس ہنگامی ردِ عمل اور نئے تنقیدی تقاضوں کو دیکھیں یا اس وسعتِ بے پر اس قبولِ عام کو دیکھیں جو اردو دنیا کے طول و عرض میں تہلکہ ڈالے ہوئے تھا۔ تعلیم یافتہ طبقے کے بعض سخن ناشناسوں کے چہرے کا اتار چڑھاؤ دیکھیں یا انسانی جبلت اور حسیات کو جھنجھوڑنے والے ان اثرات پر نظر رکھیں جو اس کے کلام سے پیدا ہو رہے تھے۔ احساسات کی اُس گھٹن کو ڈھونڈیں جس کی سفارش تنقیدی کتابوں کے بے جان الفاظ کر رہے تھے یا اُس پُر شکوہ اور تہلکہ ڈالنے والے اندازِ بیان کے جلال و جمال پر وجد کریں جو دل و دماغ کو آسمان پر اُڑائے لیے جا رہا تھا۔

یوں آتی ہے ہر نگاہ سے آوازِ الاماں
جیسے کوئی پہاڑ پہ آنگن میں دے اذاں

حقیقت یہ ہے کہ جوش کسی عقیدے یا نظریے کے آدمی نہ تھے۔ اُن کا مزاج آوارہ اور ہرجائی تھا۔ ان کی مذہبیت، ان کا الحاد، اُن کی عقل پسندی، ان کی مزدور دوستی اور سوشلزم جن کی گونج جا بجا ان کی نظموں میں سنائی دیتی ہے، سب پُر فریب اور ناقابلِ اعتبار تھی۔ بعض لکھنے والوں کے یہاں عمر کی مختلف منزلوں میں عقائد بدلے ہوئے نظر آتے ہیں، لیکن جوش کا تو صبح و شام کا بھی بھروسہ نہیں۔ ان کی ایک معمولی سی نظم پروگرام میں غیر سنجیدگی سے جو بات کہی گئی ہے وہ ان کی شاعری کی سچی تصویر بن گئی ہے۔ ؎

اے شخص اگر جوش کو تو ڈھونڈنا چاہے — وہ پچھلے پہر حلقۂ عرفاں میں ملے گا
اور صبح کو وہ ناظرِ نظارۂ قدرت — طرفِ چمن و صحنِ بیاباں میں ملے گا
اور دن کو وہ سرگشتۂ اسرارِ معانی — شہرِ ہنر و کوچۂ ادیاں میں ملے گا

اور اسی طرح شام کہیں اور رات کہیں بسر کرنے کی بات آنے والے شعروں میں کہی گئی ہے۔ آوارہ اور ہرجائی ہونے کی تصدیق خود شاعر کر رہا ہے۔ لیکن میں انہیں شاعر کی خامیاں نہیں بلکہ خوبیاں قرار دوں گا۔ جو اس کا ایمان ہو کر جھلکائے ہوئے ہیں۔ ہاں انہیں اگر کسی گھر گرہست انسان سے منسوب کر دیا جائے تو یہ شرمناک ہو جاتی ہیں۔ بقول غالب: ؎

ہر چہ در گفتار فخرِ تست آں ننگِ منست

ایک عام پڑھے لکھے آدمی یا ناقد سے جوش کے بارے میں پوچھا جائے تو بالعموم یہ جواب ملے گا کہ ان کے یہاں فکری عنصر بہت کم ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس عام رائے سے متاثر ہو کر جوش نے اس کمی کو پورا کرنے کی جہاں تہاں کوشش کی ہے۔ مثلاً اس نظم پر غور کیجیے جو مندرجہ ذیل شعر سے شروع ہوتی ہے۔

نہ جانے کب صباحِ ناز ہو گی زرفشاں ساقی
ابھی تو چہرِ رخ پر ہے صبحِ کاذب کا سماں ساقی

اس نظم میں جوش نے یونانی بلکہ مارکسی اندازِ فکر کی عقلیت کا اظہار کیا ہے اور بالواسطہ طور پر اقبال کے تصورِ عشق پر چوٹ کی ہے

قیامت ہے خودی کا دیوتا بھی یہ نہیں کہتا
کہ اے انسان تو خود ہے خدائے این و آں ساقی

پھر غالب کی مثنوی ابرِ گہربار کی طرح خالص علم و عقل کی تعریف میں شعر کہے ہیں:

کہ دانش صرف دانش ہے لباسِ مردمِ کامل
کہ حکمت صرف حکمت ہے کلاہِ مقبلاں ساقی

یہ شاعری نہیں وعظ ہے۔ اس سے دل متاثر نہیں ہو سکتا نہ ایسے شعروں سے عقل کی معقولیت و اہمیت میں کوئی قابلِ لحاظ اضافہ ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس جب ہم اقبال کے شعر عشق پر پڑھتے ہیں تو کسی اور ہی عالم میں پہنچ جاتے ہیں۔

عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام

یا ان مصرعوں پر غور کیجیے:

عشق سراپا حضور علم سراپا حجاب
علم ہے پیدا سوال عشق ہے پنہاں جواب

شعروں کے تقابل سے اقبال اور جوش کا فرق معلوم ہو جاتا ہے۔ آخر الذکر کی تمام توانائی اور برتری کے باوجود ماننا پڑتا ہے۔

ہر خوشی را خوشتری ہم بودہ است
گر سرے ہست افسری ہم بودہ است

جوش نے اقبال کا ذکر صرف اپنے احساسِ کمتری کی وجہ سے کیا۔ وہ اپنے زمانے کے برخود غلط انٹلکچول طبقے کے خود ستائی سے متاثر ہو کر علم و عقل کے رول پر ضرورت سے زیادہ زور دینے لگے تھے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اقبال نے بھی حافظِ شیراز کی شان میں گستاخی کی تھی۔

ہوشیار از حافظِ صہبا گسار
جامش از زہرِ اجل سرمایہ دار

لیکن اقبال کا اعتراض احساسِ کمتری کی وجہ سے نہیں بلکہ تنگ نظری اور تقشف کی وجہ سے تھا جس پر بعد میں اُنھیں شرمندہ ہونا پڑا۔ جوش اور اقبال دونوں کا حسن فارسی شاعری سے مستعار ہے، لیکن اپنے اپنے ڈھنگ سے۔ جوش کے یہاں شاعری کی سرمستیاں حافظ کے ذریعے سے آئیں اور اقبال کی بصیرت مولانا روم کی مرہونِ منت ہے۔ جوش نے حافظ سے اتنا اثر قبول کیا ہے کہ اس پر علیحدہ سے مضمون لکھا جا سکتا ہے۔ اس ناوابستگی یا چشم پوشی کو کیا کہیے کہ کتاب لکھی بھی گئی تو حافظ اور اقبال پر جن میں کوئی تال میل نہیں تھا۔ اقبال کے یہاں ایک دو جگہ چھوڑ کر کہیں آپ حافظ کی نشاندہی نہیں کر سکتے جب کہ جوش کے یہاں قدم قدم پر حافظ سے ملاقات ہوتی ہے۔ پہلے جوش کے اس مصرع کو ملاحظہ کیجیے:

وہ یار پری چہرہ کہ کل شب کو سدھارا

یہ حافظ کے مصرعے کا لفظ بہ لفظ ترجمہ ہے:

آں یار پری چہرہ کہ دوش از برِ ما رفت

جوش کہتے ہیں:

خادمانِ درِ ساقی کے سروں پر کج ہے
کلہِ خواجگیٔ کون و مکاں آج کی رات

حافظ کا شعر ہے:

بولائے تو کہ گر بندۂ خویشم خوانی
از سرِ خواجگیٔ کون و مکاں برخیزم

اسی طرح اپنی ایک نظم 'جمنا کے کنارے' کو حافظ کے دو شعروں سے اختتام پذیر کیا ہے:

حسنِ تو ہمیشہ در فزوں باد
رویت ہمہ سالہ لالہ گوں باد
قدِ ہمہ دلبرانِ عالم
در خدمتِ قامتت نگوں باد

یہ تو ایک سرسری جائزہ سا ہے۔ اس قسم کے نہ جانے کتنے شعر اور مصرعے ہوں گے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ جوش کے اسلوبِ بیان اور اسلوبِ فکر دونوں میں کہیں حافظ کی چھاپ اور بیشتر حافظ کی خوشبو پائی جاتی ہے ویسے انہوں نے خیام کا نام بھی حافظ کے ساتھ لیا ہے اور رباعیاں بھی بہت اعلیٰ پیمانے کی کہی ہیں۔ لیکن خیام کی رباعیوں کی معنویت اور اس کا حزن و ملال اور کائناتی طنز بہت بلند پایہ شاعری ہے۔ جوش وہاں تک نہیں پہنچے۔ ان کا مزاج ہی اس قسم کا نہیں ہے۔ صرف شراب اور رندمشربی سے کوئی خیام نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی جوش کی رباعیاں ان کے کلام میں نمایاں حیثیت رکھتی ہیں اور ان کی تعریف نہ کرنا ظلم ہوگا۔

کل رات گئے مست تھی جب موجِ نسیم — شبنم میں نہا رہی تھی پھولوں کی شمیم
اک حور نے ساغر سے نکل کر یہ کہا — میں روحِ مئے ہوش ربا ہوں، تسلیم

پامالِ غمِ انسان ہوا جاتا ہے — بے چارہ پریشان ہوا جاتا ہے
گھٹتا ہے تو آتا ہے فرشتوں کا نمود — بڑھتا ہے تو شیطان ہوا جاتا ہے

اور یہ رباعی ان کے اپنے خاص رنگ میں:

مرضی ہو تو سولی پہ چڑھانا یارب — سو بار جہنم میں جلانا یارب
معشوق کہیں آپ ہمارے ہیں بزرگ — ناچیز کو یہ دن نہ دکھانا یارب

جوش کی رندی و سرمستی، جذباتیت اور رومانیت سب کو فارسی شاعری کے اثرات نے جلا بخشی ہے۔ بلکہ اُسے لازوال بنا دیا۔ جوش کی طباعی اور غیرمعمولی ذہانت نے فارسی شاعری کی حلاوت، موسیقی، روانی اور فصاحت کو اپنی لکھنوی اردو میں ایسا جذب کیا تھا کہ ان کا شعری آہنگ تمام اردو شاعری میں امتیازی رنگ اختیار کر گیا۔ اُنھوں نے واقعی ایک خیال کو ہزاروں پیرایۂ بیان عطا کر کے شاعری میں ساحری کی تاثیر پیدا کر دی۔ افسوس کہ ان کے بعض کم نظر نقادوں نے اُسے لفاظی و لسانی پر محمول کیا اور شاعری کو فکر و فلسفے تک محدود رکھا۔ یہ لوگ جوش کی رندی و ہوسناکی سے بھی بدظن تھے۔ جوش نے خود اپنی نثری تصنیف 'یادوں کی برات' میں اس بدظنی کا خاصا سامان فراہم کیا ہے۔ لیکن یادوں کی برات کی تنقید کو شاعری کی تنقید پر عائد کرنا نا انصافی ہی نہیں جہالت بھی ہے۔ نقادوں کو اتنا ضرور سمجھنا چاہیے کہ جو بات نثر میں کہی جاتی ہے اُسے جب شعر میں منتقل کیا جاتا ہے تو کثافت کے بجائے زیبائی، لطافت اور کشش پیدا ہو جاتی ہے اور اس کیمیائی تبدیلی سے مفہوم میں حیرت انگیز ترفع آ جاتا ہے۔

دوپہر کی دھوپ میں مجھ کو بلانے کے لئے
وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

اس بات کو حسرت موہانی کسی محفل میں اگر نثر میں بیان کرتے تو ان کے صوفی عالم بزرگ اور حق پرست کردار کی کیا گت بنتی۔ جوش نے نسوانی حسن کی جس جوش و خروش اور مبالغے سے اپنی نظم 'گلبدنی' میں تعریف کی ہے۔ وہ اردو شاعری میں اپنی مثال آپ ہے۔ جسے سن کر زاہدانِ خشک بھی وجد میں آ جاتے ہیں۔ صرف ایک بند دیکھیے کیا قیامت ڈھاتا ہے:

عشوے ہیں کہ اک قوسِ قزح ٹوٹ رہی ہے
چھل بل ہے کہ چھاتی کو زمیں کوٹ رہی ہے
انگڑائی کا خم ہے کہ دھنک ٹوٹ رہی ہے
مکھڑا ہے کہ پربت پہ کرن پھوٹ رہی ہے
قامت ہے کہ رعنائی سروِ چمنی ہے
کیا گلبدنی گلبدنی گلبدنی ہے

ایک دوسری نظم 'ماتمِ آزادی' کا ایک بند بھی درج کیا جاتا ہے۔ جس کا طرزِ بیان فارسی کے جادوگر شاعر قاآنی کو غلام بنا لے اور جبرئیل کو شرمندہ کر دے۔

سروِ سہی نہ ساز نہ سنبل نہ سبزہ زار
بلبل نہ باغباں نہ بہاراں نہ برگ و بار
جیحوں نہ جامِ جسم نہ جوانی نہ جوئبار
گلشن نہ گلبدن نہ گلابی نہ گلعذار
اب بوئے گل نہ بادِ صبا مانگتے ہیں لوگ
وہ حبس ہے کہ لُو کی دُعا مانگتے ہیں لوگ

میں قواعدِ زبان اور صنائع بدائع کا متخصص نہیں لیکن اتنا بحیثیت شاعر جانتا ہوں کہ صرف اس بند میں جتنی صنعتیں یکجا کی گئی ہیں۔ اور ایک ایک لفظ میں جو نغمگی، صوتی آہنگ، تناسب اور تلمیح سی پوشیدہ ہے۔ اس پر صفحے کے صفحے لکھے جا سکتے ہیں۔ زبان و بیان کی یہ ایسی خوبیاں ہیں کہ اگر جوش کی شاعری میں کچھ اور نہ ہوتا تو بھی سحر انگیزی انہیں محمد حسین آزاد کے بقائے دوام کے دربار میں سنہری کرسی کا مستحق قرار دے دیتی۔

لیکن جوش کی شاعری جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے صرف زبان و بیان کا کرشمہ نہیں ہے، انہیں اہلِ نظر نے جوشِ اعظم اور جوش علیہ السلام جیسے خطابات سے یونہی نہیں نوازا ہے۔ اس کا ایک سبب اور بڑا سبب یہ بھی ہے کہ بیسویں صدی کا ہندوستان جوش کے قبضہ و تصرف میں نظر آتا ہے۔ یہ تصرف بھی اردو کے کسی دوسرے شاعر نے نہیں حاصل کیا۔ ہندوستان ایک وسیع و عریض ملک ہے، جس نے نہ جانے کتنے انقلابات دیکھے، کتنے سرد و گرم روزگار کے مزے چکھے اور کتنے زمانوں کے آثار اور نشانات، طرزِ زندگی یہاں تک کہ جغرافیائی کیفیات کو تاریخ میں دفن کر کے مستقبل کی طرف رواں دواں ہے۔ پچھلا ہندوستان ہماری نظروں سے اوجھل ہو چکا ہے۔ کیوں کہ تاریخ نے بادشاہوں اور فاتحوں کے کارنامے ریکارڈ کیے۔ اور ادب نے روایتی مضامین یا فلسفیانہ موضوعات پر زیادہ توجہ دی۔ زندگی سے پہلے آدمی کہاں تھا اور زندگی کے بعد یہ مخلوق کہاں جائے گی۔ خود اپنی زمین اور اپنی زندگی کے بارے میں اگر ذکر کیا تو وہ حسن و عشق کی نذر ہو گیا۔ یا پھر جلد ہی اُسے بھی صوفی حضرات آسمانوں کی طرف لے بھاگے۔ جوش ایسے شاعر ہیں جنہوں نے صرف زمینی زندگی سے سروکار رکھا ہے اور اس فنا پذیر دھوکے باز اور عارفوں اور عالموں کی راندۂ درگاہ حیاتِ ارضی کو سینے سے لگایا ہے اور اُسے اپنے شاعرانہ جوہر سے جگمگا دیا ہے۔

ہر منظرِ حیات کو دیکھا ہے غور سے
چھوڑا نہیں ہے کوئی بھی عنواں ترے لئے

یہ عنوان کیا ہیں۔ ان میں حیاتِ ارضی کی لذتیں اور برکتیں ہیں اور ایسے ولولہ انگیز جذبات ہیں جو زندگی کی تھکن اور افسردگی کو دور کرتے ہیں اس کے خوف و ہراس اور مایوسی کو زندہ دلی ستیزہ کاری اور خلاقی میں بدل دیتے ہیں:

اُٹھ اور زمیں پہ نیا لالہ زار پیدا کر
نہ آئی ہو جو کبھی وہ بہار پیدا کر
مذاقِ بندگیٔ عصرِ نو کی تھک کو ختم
نئے مزاج کا پروردگار پیدا کر

اور یہ چند شعر بھی جو ہمارے اور آپ کے روزانہ کے تلخ تجربات پر مبنی ہیں،

الٰہی یہی ہے اگر روزگار — کہ سینے رہیں اہلِ دل کے فگار
زمیں کی خوشامد کرے آسماں — مقلد ہوں گونگوں کے اہلِ زباں
جھکے خاک پر علم کی بارگاہ — جبینِ جہالت پہ کج ہو کلاہ
کھنچے بندگانِ ہوس کو حضور — خدایانِ علم و ادب کا غرور
سفاہت پھرے مسکراتی ہوئی — کڑے کو چھڑے سے بجاتی ہوئی

جوش نے اپنے وطن کے کروڑوں بسنے والوں کی زندگی اور ان کے جذبات و محسوسات کی ترجمانی کی ہے۔ اس ملک کی کراں تا کراں پھیلی ہوئی زمین کے دشت و دمن، کوہسار و جوئبار، ایمان کو تازہ کرنے والی رسولی جیسی صبحیں اور اسی ایمان کو لوٹنے والی شامیں، چمکتے ہوئے تالاب، جھومتے ہوئے سرسبز باغات، اپنے ہم عصروں کا بچپن، جوانی اور بڑھاپا، اپنے فلاکت زدہ وطن کی کراہتی ہوئی آواز، اس کی غلامی اور آزادی کی آویزش اور اس کا تشنج اور تناؤ جس اضطراب والتہاب و اشتعال کے ساتھ بیان کیا ہے، وہ اردو زبان کے کس شاعر کے یہاں ملتا ہے، الفاظ سے بچھے گا۔ میرا خیال ہے گزرتے ہوئے زمانوں میں ہر زمانہ دُھندلا جائے گا۔ لیکن بیسویں صدی کا ہندوستان جوش کی شاعری کے وسیلے سے زندہ و تابندہ رہے گا۔

○ ○

میاں کو یہ کب معلوم تھا کہ وہ جس شبیر کو مرد صالح بنانا اور بگڑنے سے بچانا چاہتے ہیں وہ بگڑنے بغیر مانے ہی گا نہیں۔ اور اس کو اگر بسم اللہ کے گنبد میں بند کر کے اس کے پاؤں میں "اخلاقِ جلالی کی زنجیریں بھی ڈال دی جائیں گی پھر بھی یہ شبیر اس گنبد اور ان زنجیروں کو توڑ پھوڑ کر حریمِ بتاں و بارگاہِ مغاں میں پہنچ جائے گا۔ کاش میاں ہی کو نہیں، دنیا کے تمام باپوں کو یہ معلوم ہوتا کہ اپنے بیٹے اور اس کے فطری میلان کے بیچ میں آ کر کوئی باپ تا دیر ٹھہر ہی نہیں سکتا۔ اس لئے کہ داخلی تقاضوں کو خارجی احکام تا دیر زیرِ چپ دکھا ہی نہیں سکتے۔ اگر کروڑوں انبیاء پانی کو یہ حکم دیں کہ وہ نشیب کی طرف نہیں فراز کی جانب بہنے لگے، پانی ان کا حکم نہیں مانے گا اور نشیب کی جانب ہی بہتا رہے گا۔ اگر یہ سُن کر کوئی انسان کے ذی شعور اور پانی کے بے شعور ہونے کی بات کرے گا تو غور کرنے کے بعد اس کو پتہ چل جائے کہ شعور بھی فطری تقاضوں اور جبلتوں کی زنجیر میں جکڑا ہوا ہے۔

("یادوں کی برات" صفحہ ۸۷)

مظہر امام

جوشؔ: جاہ وجلال کا شاعر

جوشؔ کی شاعرانہ اہمیت کا اعتراف کرنے کے لئے ہمیں موجودہ تنقیدی رویّوں پر نظرِ ثانی کرنی ہوگی۔ جوشؔ کی شاعری کو اس کے سیاسی اور سماجی پس منظر سے الگ کرکے نہیں دیکھا جاسکتا۔ انہوں نے اس وقت اپنی انفرادی راہ تلاش کرنے کی کوشش کی جب حالیؔ کی نئی شاعری نے پر پُرزے نکالے تھے اور اقبالؔ کے کلام سے اردو نظم کی وادی گونج رہی تھی۔ اس زمانے میں انقلابِ روس کا غلغلہ بھی شباب پر تھا اور ہندوستان صد سالہ غلامی کا جوا اُتار کر آزاد فضاؤں میں سانس لینے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔ حالیؔ کی شاعری ذہنی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کی تلقین تھی۔ اقبالؔ فکر و نظر کے فردوسِ گمشدہ کی بازیافت کر رہے تھے۔ جوشؔ شاعری کو عوام کی آواز بنانے کے لئے میدان میں اُتر آئے اور اُنہوں نے ظاہری طور پر ایک ایسی راہ اختیار کی جس میں ذاتی جذبات، ذاتی تجربات اور خاص شاعرانہ طرزِ ابلاغ کا دخل نہیں بلکہ اجتماعی مسائل و مطالبات کے منظوم اظہار کا عمل ہے۔ اس عمل کے باعث ان پر سستی جذباتیت اور نعرہ بازی کے الزامات عائد کئے گئے۔ ان کی بیانیہ شاعری موردِ عتاب ٹھہری۔ بیانیہ شاعری کی اپنی حدود سہی، لیکن ایسی شاعری کی بہت سی مثالیں موجود ہیں جو بیانیہ ہوتے ہوئے بھی اعلیٰ درجے پر فائز ہیں۔ ہومر نے داستان گوئی میں بھی شاعری کے بہترین نمونے پیش کئے اور اپنے یہاں میر حسن اور دیا شنکر نسیم نے مثنوی کے فارم میں اچھی شاعری کی درخشاں مثال قائم کی۔ غرض اندازِ بیان بیانیہ ہو یا تمثیلی، علامتی ہو یا استعاراتی، سوال اچھی شاعری کا ہے۔

جوشؔ ملیح آبادی طنطنہ اور طمطراق کے شاعر ہیں۔ ان کے یہاں جو شان و شوکت جو جاہ و جلال ہے، اس کا اندازہ اُن کے کلام کے سرسری مطالعے سے ہی ہو جاتا ہے۔ تشبیہات اُن کے آگے صف باندھے کھڑی رہتی ہیں۔ وہ الفاظ کے ذریعے بے جان چیزوں کو جان اور غیر مرئی اشیاء کو مرئی لباس عطا کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ وہ خلوت کے شاعر نہیں، جلوت کے شاعر ہیں، اُن کا کلام نہ تنہائی میں پڑھنے کی چیز ہے نہ سرگوشیوں میں سُنانے کی۔ ان کے کلام کا لطف وافر سرِ بزم بہ آوازِ بلند پڑھنے میں ہے۔

جوشؔ کے بارے میں متضاد اور متخالف خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ فراقؔ نے اپنی رُباعیوں کے مجموعے "رُوپ" کا انتساب کرتے ہوئے جوشؔ کو "شاعرِ اعظم" کا لقب دیا تھا۔ "شاعرِ انقلاب" کا خطاب تو اُن کے نام کا جزو ہی بن گیا ہے۔ اکبرؔ الہ آبادی نے جوشؔ کے پہلے مجموعۂ کلام "روحِ ادب" (مطبوعہ ۱۹۲۱ء) کے مقدمے میں اُنہیں مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا:

"کاش! کسی وقت میں آپ اور اقبالؔ یکجا ہوتے!"

ایک نوعمر شاعر کے غیر معمولی امکانات کا اس سے بڑا اعتراف اور کیا ہو سکتا ہے! جوشؔ ایک عرصے تک اپنے ہم عصروں میں سب سے ممتاز رہے اور اس وقت کے شاعروں کی نوجوان نسل پر اُنہوں نے گہرے اور دیرپا اثرات مرتسم کئے۔ مجازؔ، سردار جعفری، جاں نثار اخترؔ، پرویز شاہدی، علی جواد زیدی، مسعود اختر جمال اور کیفی اعظمی کی شاعری براہِ راست اُن سے متاثر ہے۔ ایک وقت تھا جب اُنہیں اقبالؔ کے بعد اردو کا سب سے بڑا شاعر سمجھا جاتا تھا۔ پھر ان کی قلمرو میں فراقؔ اور فیضؔ کی خودمختار ریاستیں اُبھر آئیں اور جوشؔ کی سلطنت پر حملے اور ہو گئیں۔ نیاز فتحپوری نے اختر حیدرآبادی کو جوشؔ کے مقابل کھڑا کیا۔ ملک راج آنند نے کہا تھا کہ جوشؔ یوں تو بہت ترک بھڑک دکھاتے ہیں، لیکن انگریزی میں ترجمہ کرنے بیٹھو تو گھاس پھوس معلوم ہوتے ہیں۔ اسی زمانے (۱۹۴۵ء) میں فیضؔ نے اپنے ایک مضمون (مطبوعہ "آج کل") کے ذریعے جوشؔ پر وار کیا اور ان کی شاعری کے کھوکھلے پن کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے جوشؔ کی شاعری کا محاسبہ کیا اور جمیل مظہری پر مضمون لکھتے ہوئے اُنہیں جوشؔ سے بہتر اور برتر ثابت کرنے میں اپنی تنقیدی قوت صرف کی۔ "جدیدیوں" کے نزدیک تو جوشؔ "حرفِ غلط" ہی ٹھہرے۔

ہندوستان میں قیام کے دوران ہی جوشؔ کی شاعرانہ عظمت کے بارے میں شکوک کا اظہار ہونے لگا تھا۔ پاکستان جانے کے بعد ان کی شاعری جاں کنی میں گرفتار ہوگئی۔ ان کی زندگی کے آخری پچیس برسوں میں ان کی شاعری کم زیرِ بحث آئی۔ ان کی شخصیت زیادہ موضوعِ سخن بنی۔ نقلِ وطن سے کچھ پہلے جوشؔ کو پدم وبھوشن کا خطاب ملا تھا۔ محفلوں میں خوب خوب چہ میگوئیاں ہوئیں۔ عموماً تمسخرانہ انداز میں۔ ان کی پاکستان کی

۱۷۶۔ بی، پاکٹ ۱، میور وہار، فیز ۱، دہلی ۱۱۰۰۹۱

ہجرت نے ہندوستان اور پاکستان کے ادبی، سماجی اور سیاسی حلقوں میں ایک زلزلہ سا پیدا کر دیا۔ جواہر لال نہرو اور ابوالکلام آزاد سے ان کے ذاتی تعلقات کی تشہیر ہوئی۔ جوش نے پاکستان جا کر "یادوں کی برات" کے نام سے "آپ بیتی" لکھی۔ کہا گیا ہے کہ اس میں جھوٹ کا پلڑا بھاری ہے۔ مقدمہ بازی بھی ہوئی۔ "ساقی" نے مخالفت میں اور "افکار" نے حمایت میں ضخیم خاص نمبر نکالے۔ ریستوراں کی "ادبی گپ بازی" کے دوران سنا گیا کہ فیض اور حفیظ جالندھری ان کے زبردست مخالف ہیں۔ آخری عشرے میں ان کے ایک انٹرویو پر سخت چیخ پکار ہوئی۔ جو ریڈیو پاکستان کو اس شرط پر دیا گیا تھا کہ وہ ان کی زندگی میں نشر نہیں کیا جائے گا۔

۱۹۵۵ء کے بعد بھی جوش باقاعدگی سے شعر کہتے رہے۔ عمر کے آخری دور میں ان کی توجہ مرثیوں کی جانب زیادہ رہی۔ لیکن جب ہم جوش کی مجموعی شاعری پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کے انتقال سے پہلے کے ۲۵ سالہ شعری سرمائے پر ہماری نگاہ نہیں جاتی۔ اس دوران ان کا نام، ان کے کلام کی بنا پر نہیں بلکہ یا تو "یادوں کی برات" کے حوالے سے چلتا رہا۔ یا ان کی شخصیت کے متنازعہ فیہ پہلوؤں کی وجہ سے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جوش ۱۹۵۵ء تک بحیثیت شاعر مرحوم ہو چکے تھے۔ پاکستان جانے کے بعد غالباً ان کے صرف ایک مجموعۂ کلام "الہام و افکار" اور ایک مسدس "طلوعِ فکر" کی اشاعت ہو سکی۔ اس لئے جوش کی شاعری کا جائزہ "روحِ ادب" (۱۹۲۱ء) "نقش و نگار" (۱۹۳۶ء) "شعلہ و شبنم" (۱۹۳۶ء) "فکر و نشاط" (۱۹۳۷ء) "جنون و حکمت" (۱۹۳۷ء) "حرف و حکایت" (۱۹۳۸ء) "آیات و نغمات" (۱۹۴۰ء) "عرش و فرش" (۱۹۴۰ء) "رامش و رنگ" (۱۹۴۵ء) "سنبل و سلاسل" (۱۹۴۷ء) "سرود و خروش" (۱۹۵۳ء) اور "سموم و صبا" (۱۹۵۴ء) کی روشنی میں ہی لینا کافی اور مناسب ہوگا۔

جوش ملیح آبادی ایک آفریدی پٹھان گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد اور دادا دونوں شاعر تھے۔ انہیں اپنے رئیس ابن رئیس ہونے کا ہمیشہ فخر رہا۔ وہ غروبِ آفتاب کے بعد "پیمانہ بکف طلوع" ہوتے تھے۔ کچھ خاص آداب اور متعین وقت کے ساتھ۔ مجاز نے اسی لئے کہا تھا کہ جوش صاحب اپنے سامنے گھڑی رکھ کر پیتے ہیں، میں گھڑا رکھ کر پیتا ہوں۔ جوش نے اپنے دعوے کے مطابق اٹھارہ کامیاب عشق کئے۔ جوش کی شخصیت میں یقیناً ایک کشش تھی۔ اور یہ کشش زیبِ داستان کے لئے بڑھائے ہوئے "کچھ" کی ہی نہیں، "بہت کچھ" کی مرہونِ منت ہے۔ ان کے الحاد اور مذہبی عقائد کے بارے میں بھی بڑی مبالغہ آرائیاں ہوتی رہی ہیں۔ یہ سب اپنی جگہ درست لیکن اب جب جوش ہمارے درمیان نہیں رہے اور ان کی شخصیت کے بہت سے افسانے ماضی کی گرد کے تلے دب گئے ہیں، ان کی شاعری کا مطالعہ تعصبات اور مفروضات سے الگ ہو کر کرنے کی ضرورت ہے۔ ممکن ہے جوش کی شخصیت کا مطالعہ، ان کے کلام کے بعض گوشوں کی تفہیم میں ہماری معاونت کر سکے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ شاعر کا کلام ہی اس کی خوبیوں اور خامیوں کی واحد امتحان گاہ ہے۔ شاعر کی شخصیت کا ہیولا اور ہالا زیادہ دیر تک اور زیادہ دیر تک ہمارا ساتھ نہیں دیتا۔

جوش کے قادر الکلام ہونے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ انہوں نے مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور مختلف ہیئتوں میں اپنے محسوسات اور تجربات کا اظہار کیا ہے — غزل، نظم، مثنوی، مرثیہ، رباعی، قطعہ، مسدس، مخمس، ترکیب بند، ترجیع بند۔ جوش نے غزلیں اچھی خاصی بڑی تعداد میں کہی ہیں۔ ان کی ابتدائی غزل گوئی امکانات کا پتہ دیتی ہے:

دل کی چوٹوں نے کبھی چین سے رہنے نہ دیا
جب چلی سرد ہوا، میں نے تجھے یاد کیا
میری ہر سانس ہے اس بات کی شاہد اے موت!
میں نے ہر لطف کے موقعے پہ تجھے یاد کیا
مجھ کو تو ہوش نہیں، تم کو خبر ہو شاید
لوگ کہتے ہیں کہ تم نے مجھے برباد کیا (۱۹۲۱ء)

مرے خدا نے مرے سب گناہ بخش دئے
کسی کا رات کا یوں میں نے انتظار کیا (۱۹۲۳ء)

زحمت نہ ہو تو در پہ ذرا چل کے دیکھ لو
آیا ہے کوئی اپنا پتہ پوچھتا ہوا (۱۹۲۵ء)

لیکن ان کی بعد کی غزلوں میں نظم ہی کی سی گھن گرج پیدا ہو گئی ہے:

آ، اور جہاں کو غرقِ لبِ نوش خند کر
آوازۂ فسونِ جوانی بلند کر

ان کی اکثر غزلیں، خیالات اور کیفیات کے باہمی ربط کے باعث غزلِ مسلسل کے زمرے میں آتی ہیں جسے بعض نباضانِ سخن نے غزل کی ایک بہتر صورت قرار دی ہے۔ لیکن جوش کی اس نوع کی غزلوں میں بھی وہی نظم کا آہنگ حاوی ہے۔

اٹھی وہ گھٹا، رنگ سامانیاں کر
گہرپاشیاں کر، زرافشانیاں کر
وہ چھلکے عنادل، وہ سنکی ہوائیں
گلوں کی طرح چاک دامانیاں کر
صراحی جھکا اور دھوم میں مچا دے
گلابی اٹھا اور گل افشانیاں کر

ان کی غزلوں میں شاذ ہی کوئی ایسا شعر ملتا ہے جو دل کی گہرائیوں میں اتر جائے اور جو ہمارے احساس کی جمالیاتی صلاحیتوں کو مہمیز دے سکے۔
جوش بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں۔ ان کے یہاں خیالات کا وفور ہے، الفاظ کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے۔ (مجاز نے اپنے مخصوص انداز میں کہا تھا کہ میں ڈکشن کا شاعر ہوں اور جوش ڈکشنری کے) ان کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے۔ لیکن زیادہ گوئی میں یاوہ گوئی کا

بھی خطوہ رہتا ہے۔ مختصر الفاظ میں اپنا مافی الضمیر ادا کیا جاسکتا ہے، لیکن جوش کو ایجاز وا ختصار مرغوب نہیں۔ وہ تفصیل اور اطناب کے شاعر ہیں۔ وہ ایک پھول کے مضمون کو سو رنگ سے باندھتے ہیں۔ وہ کہیں رکنے کا نام نہیں لیتے۔ وہ اشعار پر اشعار کہے جاتے ہیں۔ ان میں نئی باتیں کم ہوتی ہیں۔ اکثر ایک ہی خیال کا اعادہ ہوتا ہے۔

جوش کی شاعری بیانیہ شاعری ہے۔ انیس اور حالی کی شاعری بھی بیانیہ ہے۔ آج کی تنقید ایسی شاعری کو مطعون کرتی ہے، جس میں واشگاف انداز میں کوئی بات کہی گئی ہو۔ کسان اور مزدور کے تعلق سے کہی ہوئی شاعری گردن زدنی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس طرح کے موضوعات پر رسمی شاعری بہت ہوئی ہے۔ لیکن جوش کی نظم "کسان" جس منظر کشی سے شروع ہوتی ہے، اس کے شاعرانہ حسن سے انکار ایمان داری کے منافی ہے:

جھٹپٹے کا نرم رو دریا، شفق کا اضطراب
کھیتیاں، میدان، خاموشی، غروب آفتاب
دشت کے کام و دہن کو دن کی تلخی سے فراغ
دُور، دریا کے کنارے، دھندلے دھندلے سے چراغ
زیر لب ارض و سما میں باہمی گفت و شنود
مشعل گردوں کے بجھ جانے سے اک ہلکا سا دُود

یہ الگ بات ہے کہ جب وہ مبالغہ آرائی پر اُتر آتے ہیں تو کسان کو "ارتقا کا پیشوا" "تہذیب کا پروردگار" "ماہر آئین قدرت" اور "ناظم بزم جہاں" کہنے لگتے ہیں۔ مبالغہ آرائی کا یہ سلسلہ بیس اشعار تک چلتا رہتا ہے۔ بیل کی تعریف میں رطب اللسان ہوتے ہیں تو آٹھ اشعار اس کی نذر کر دیتے ہیں لیکن اسی دوران ایسے شعر سے بھی ہماری ملاقات ہوتی ہے:

جس کے ماتھے پر پسینہ نازنین مہ جبیں
کروٹوں پر کروٹیں لیتی ہے لیلائے زمیں

اور اس قوس کے مصرعے سے بھی:

جس کا لوہا مان کر سونا اگلتی ہے زمیں

"ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام" جوش کی وہ مشہور نظم ہے جس نے اُنہیں شاعر انقلاب بنایا۔ یہ نظم کیا ہے، ایک کف در دہاں چیخ ہے، جس کی اپیل مخصوص سیاسی حالات کی بنا پر ایک وقت میں بہت زیادہ تھی:

کس زباں سے کہہ رہے ہو آج اے سوداگرو!
دہر میں انسانیت کے نام کو اونچا کرو
جس کو سب کہتے ہیں ہٹلر بھیڑیا ہے بھیڑیا
بھیڑیے کو مار دو گولی پئے امن و بقا

وہ انگریزوں کو ان کے ظلم و ستم یاد دلاتے ہیں۔ یہ نظم چند تاریخی صداقتوں کا منظوم بیان ہے۔ یہ ایک ارتجالی احتجاجی نظم ہے۔ یہاں شاعرانہ حسن کی تلاش بے معنی ہوگی۔ لیکن اسی نظم میں جب جوش انگریزوں پر طنز کرنے لگتے

ہیں تو ان کی شاعری کی دلکشی بھی لَو دینے لگتی ہے:

دیر سے بیٹھے ہو نخل راستی کی چھاؤں میں
کیا خدا ناکردہ کچھ موچ آگئی ہے پاؤں میں؟
گونج نالوں کی، نہ آبادی نہ ویرانے میں ہے
خیر تو ہے اسپ تازی کیا شفاخانے میں ہے؟
آج کل تو ہر نظر میں رحم کا انداز ہے
کیا طبیعت کچھ بہ نصیب دشمناں ناساز ہے؟

حتیٰ کہ جب وہ انتقامی جذبے کے تحت انگریزوں کے خون کے طالب ہوتے ہیں تب بھی اُن کی شاعرانہ حس بیدار رہتی ہے:

اک کہانی وقت لکھے گا نئے مضمون کی
جس کی سُرخی کو ضرورت ہے تمہارے خون کی

جوش کا زمانہ سیاسی بیداری اور انگریزوں کی غلامی کے خلاف جدوجہد کا زمانہ تھا۔ معاشرے میں پھیلے ہوئے معاشی اور مذہبی استحصال، بے ایمانی اور ریاکاری سے نفرت کا زمانہ تھا۔ اقبال مطلع شاعری پر آفتاب کی طرح جگمگا رہے تھے۔ جوش کو پیام بھی دینا تھا، بغاوت کے لئے آمادہ بھی کرنا تھا، ریاکاروں کا پردہ بھی چاک کرنا تھا اور اقبال کی موجودگی میں اپنی علیحدہ، منفرد آواز بھی کاڑھنی تھی۔ جوش کے پاس اقبال کا علم، بصیرت اور وژن نہیں تھا۔ اقبال کے یہاں ایک مربوط نظام فکر ہے۔ جوش کے یہاں کوئی نظام فکر نہیں، کوئی سوچا سمجھا ہوا نقطۂ نظر نہیں۔ وہ مزاجاً رومانی ہیں ان کی بغاوت بھی رومانی ہے۔ حسن اور عشق، شراب اور شباب اُن کی شاعری کے خاص موضوعات ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ اُن کی شاعری کے اصل جوہر ایسے ہی موضوعات کے اظہار کے وقت کھلتے ہیں۔ حسن کی تفصیلات اور جزئیات اُنہوں نے نت نئے رنگوں کے ساتھ موقع بے موقع پیش کی ہیں۔ "جنگل کی شہزادی" کے حسن کی صفات جب وہ بیان کرنے لگتے ہیں تو رکنے کو بھی نہیں آتے۔ محض نمونے کے طور پر چند شعر ملاحظہ فرمائیے:

زاہد فریب، گل رُخ، کافر، دراز مژگاں
سیمیں بدن، پری رُخ، نوخیز، حشر ساماں
خوش چشم، خوبصورت، خوش وضع، ماہ پیکر
نازک بدن، شکر لب، شیریں ادا، فسوں گر
کافر ادا، شگفتہ، گل پیرہن، سمن بو
سرو چمن، سہی قد، رنگیں جمال، خوش رُو
گیسو کمند، مہوش، کافور فام، قاتل
نظارہ سوز، دلکش، سرمست، شمع محفل
ابرو ہلال، مے گوں، جاں بخش، روح پرور
نسریں بدن، پری رُخ، سیمیں عذار، دلبر
آہو نگاہ، نورس، گل گوں، بہشت سیما
یاقوت لب، صدف گوں، شیریں، بلند بالا

— جوش تشبیہات اور استعارات کے بادشاہ ہیں اور الفاظ کے شہنشاہ
"کوہستانِ دکن کی عورتیں" نسبتاً ایک مختصر نظم ہے ۔ اس کا ہر شعر تشبیہ و
استعارے کے حسن ، تصویر کشی اور پیکر تراشی کی دلکشی کے اعتبار سے داد و
تحسین کا طالب ہے ۔ مثال کے طور پر یہ چند اشعار :

یہ اُبلتی عورتیں اس چلچلاتی دھوپ میں
سنگِ اسود کی چٹانیں آدمی کے رُوپ میں
چال : جیسے تُند چیتے ، تیوریاں : جیسے غزال
عارضوں میں جامنوں کا رنگ ، آنکھیں بے مثال
عورتیں ہیں یا کہ ہیں برسات کی راتوں کے خواب
پھٹ پڑا ہے جن پہ طوفان خیز ہیجان لا شباب
ان بناتِ کوہ کی کڑیل جوانی ، الاماں
پتھروں کا دودھ پی کر ہوتی ہیں جو جواں

جوش ملیح آبادی نے بہت کچھ پایا ۔ بہت سی کامیابیوں نے ان کے قدم
چُومے ، لیکن اُن سے بہت سی غلطیاں بھی سرزد ہوئیں — زندگی کرنے کے
انداز میں بھی اور شعری صداقتوں کی پہچان میں بھی ۔ اب شاعری کا مزاج
اور آہنگ بدل گیا ہے ۔ وہ حالات بدل گئے ہیں جن میں جوش کی شاعری
پروان چڑھی ۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جوش ایک بڑا تخلیقی ذہن رکھتے
تھے ۔ ممکن ہے وہ اس سے بھرپور مصرف نہ لے سکے ہوں ۔ اس کے باوجود وہ
ایک عہد ساز شاعر تھے ۔ اور اپنے رنگ کے آخری بڑے شاعر ۔

عام خیال یہی ہے کہ جوش ، نیاز فتح پوری کے ناپسندیدہ شاعر تھے ۔
وہ جوش کے کلام میں وقتاً فوقتاً کیڑے نکالتے رہے ۔ حتیٰ کہ جوش کی جانب
سے نیاز کے حق میں فحش کلامی بھی ہوئی اور "نگار" میں شائع ہوئی ۔ لیکن اپنے
انتقال سے ایک ماہ بیشتر لکھے ہوئے نیاز کے ایک مختصر سے مضمون سے جوش
کے بارے میں ان کی ایک ادبی رائے سامنے آتی ہے ۔ یہ مضمون نیاز کے
انتقال کے بہت بعد اور جوش کی وفات کے فوراً بعد پہلی بار "نگار" پاکستان
کراچی کے جنوری ، فروری ۱۹۸۲ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا ۔ اس مضمون
میں نیاز اور باتوں کے علاوہ یہ بھی لکھتے ہیں :

"یہ بالکل درست ہے کہ میں نے جوش کی بعض نظموں پر
بڑی سخت جارحانہ تنقید کی ہے اور اس کی بنا پر یہ خیال
قائم ہو سکتا ہے کہ میں جوش کو معمولی درجے کا شاعر سمجھتا
ہوں ، لیکن باور کیجئے کہ یہ خیال کبھی ایک لمحے کے لئے بھی
میرے دل میں نہیں گزرا اور میں نے ہمیشہ جوش کو اپنے
عہد کا بڑا اچھا ، بڑا اہل اور بڑا خوش فکر شاعر سمجھا اور
اب بھی اُن کی اس اہلیت کا معترف ہوں ۔"

اس مضمون میں نیاز نے جوش کی شاعری کے بعض پہلوؤں سے اپنے
اختلاف کا بھی ذکر کیا ہے ۔ ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ ہم قافیہ ، خوش آہنگ
اور زوردار الفاظ کو ایک جگہ جمع کر دینا زیادہ مشکل کام نہیں بلکہ اس کا
تعلق شاعری سے زیادہ فرہنگ نویسی سے ہے ۔" اختلاف کا دوسرا پہلو
جوش کی تعلّی ہے ۔ کیونکہ بقول نیاز "پتھر کو نچوڑ کر زمزم و شبنم ٹپکا دینے
والے شاعر محض ناظم ہیں ، شاعر نہیں ۔" ان اختلافات کے اظہار کے بعد
نیاز کہتے ہیں :

"باوجود ان تمام باتوں کے جوش کو میں بڑا زبردست
شاعر سمجھتا ہوں اور جب ان کی نظم نگاری کا وہ
دَور میرے سامنے آتا ہے جب ان میں شاعر و مفکر ، نقاش و
فیلسوف سب پوری قوت سے ایک جگہ کام کرتے ہوئے
نظر آتے تھے تو میری روح جوش کی شاعری کے سامنے
دوزانو ہو جاتی ہے ۔"

نیاز نے اپنے اس بیان کی تائید میں جوش کی ایک نظم "فریبِ ہستی"
پیش کی ہے ، جس کا حوالہ جوش پر لکھے ہوئے تنقیدی مضامین میں شاید
کبھی نہیں آیا ۔ اس نظم کی مدح میں جوش حد سے تجاوز کرتے ہوئے نظر آتے
ہیں جب وہ کہتے ہیں کہ اگر جوش اس نظم کے سوا اور کچھ نہ کہتے تو بھی میں
حالی اور اقبال کی صف میں اُنہیں بٹھا دیتا ۔" بہر حال پندرہ اشعار
کی اس نظم میں سے یہ آٹھ اشعار ملاحظہ فرمائیں جو اس نظم کا لبِ لباب ہیں :

چمن کی خاک نے تا دیر کی عرق ریزی
کہ گھٹ کے آرزوئے تخمِ گُل نہ رہنے پائے
گھٹا کی جیب تراشی ، فضا پہ ڈالے دام
قدم بہ شمس کی تڑپی ، قمر کے ناز اُٹھائے
گرہ لگائی ہوا کی ، مثلِ نرگسِ مخمور
اور اس طرح کہ ہواؤں کی رَو میں کھلتی جائے
اور ان تمام مراحل کے بعد ایک کلی
چمن فروز ہوئی پتیوں سے مُنہ کو چھپائے
سحر کے وقت بالآخر کھِلی گلاب بنی
مشامِ جاں کو کیا مست ، بوستاں مہکائے
اور اس کے بعد جو دیکھا غروب کے ہنگام
پڑی ہوئی تھی سرِ خاک ناوکِ غم کھائے
یہ کیا نظام ہے معبود ! بزمِ ہستی کا ؟
کھِلے جو صبح کو وقتِ غروب کمہلا جائے
جب ایک پل میں ہو تعمیرِ ماہ و سال خراب
تو کس امید پہ کوئی فریبِ ہستی کھائے

ڈاکٹر پریتم سینی

کلامِ جوشؔ میں عورت کا تصوّر

جوشؔ ملیح آبادی ۱۹۴۷ء سے قبل اردو ادب کے افق پر چھائے ہوئے تھے۔ لیکن اس آفتاب میں کتنی تمازت یا حرارت تھی۔ اور اس کے نور نے کتنے رہروانِ ادب کی راہ نمائی کی اور کتنوں کو گمراہ کیا۔ یہ ایک متنازعہ فیہ امر ہے۔ وہ جاگیردارانہ نقطۂ نظر رکھنے والے بے انتہا انفرادیت پسند انسان تھے۔ انقلاب کے بارے میں اُن کا تصور گدڑیے فرماں رواؤں کی جگہ ملکی حاکموں کو کرسئ اقتدار پر بٹھلانے تک ہی محدود تھا۔ اس طرح اُن کا عورت سے متعلق تصوّر بھی ناقص یا ادھورا ہے۔ وہ عورت کو عشق و حُسن کا مجسمہ یا شبستانِ عیش کی پری کے رُوپ میں ہی دیکھتے تھے۔ وہ اُسے بُزدلی کمزوری یا عشوہ و غمزہ کی پُتلی ہی جانتے تھے۔ اُن کے خیال میں مجاہدہ یا محنت کرنا عورت کے بس کا روگ نہیں۔

مرد کی بالادستی والے جاگیردارانہ سماج میں عورت کو مساوی زاویۂ نگاہ سے دیکھنا ناممکن تھا۔ یہی وجہ کہ اس برصغیر کے ادب میں عورت کے حسن و شباب کی توصیف میں چاہے زمین آسمان کے قلابے ملائے گئے ہیں پھر بھی مجموعی طور پر اس کا کردار صحیح طور پر نہیں سمجھا گیا ہے۔ بھرتری ہری، کبیرؔ اور تلسی داس کی شاعری میں ایسے کئی اشعار مل جاتے ہیں جو عورتوں کی یک رُخی تصویر پیش کرتے ہیں۔ اردو کی شاعرانہ روایت کا منبع زیادہ طور پر فارسی شاعری کا رہا ہے۔ فارسی میں بھی عورت کے کردار کی صحیح عکاسی نہیں کی گئی ہے۔

لیکن جوشؔ کی شاعری کا تعلق عہدِ حاضر سے ہے۔ جب کہ زندگی کے ہر شعبے میں عورت اور مرد کو مساوی حقوق دینے کا نعرہ ہر طرف لگ رہا تھا۔ مردوں کی طرح ہزارہا عورتیں بھی ہندوستان کی جنگِ آزادی میں مردوں کے شانہ بشانہ برسرِ پیکار رہیں۔ جنسی تفاوت کے باوجود آج تو رفتارِ زمانہ نے عورت کو ایسا معتبر مقام عطا کیا ہے کہ عورت کی تحقیر و تذلیل کرنے والا شاعر خود تکریم و تعظیم کا حق دار نہیں رہتا۔ آج جب کہ پاکستان، بنگلہ دیش اور ترکی جیسے مسلم ممالک کی عنانِ سلطنت عورتوں کے ہاتھ میں ہے۔ عورت کو ادنیٰ مقام دینے والی شاعری جدید ذہن کو جھنجھوڑتی ہے۔

جوشؔ کے لگ بھگ سبھی مجموعہ ہائے کلام میں عورت کے حُسن و شباب کی تعریف مبالغے سے پُر ہے۔ نقش و نگار سے ہی کچھ مثالیں :

گُل پیرہن و گُل بدن و گُل رُخ و گُل رنگ
ایماں شکن، آئینہ جبیں، انجمن آرا

نظریں جو اُٹھائے تو لرزنے لگے خورشید
ابرو کو جو بل دے تو ہو مہتاب دو پارا

کاکُل کے خم و پیچ سے افشاں کا جھلکنا
ظلمات سے تھا چشمۂ حیواں کا اشارا

سرشار جوانی تھی کہ اُمڈے ہوئے بادل
شاداب تبسّم تھا کہ جنّت کا نظارا

(یار پری چہرہ)

جوشؔ کی رومانی فطرت غریب طبقوں کی عورتوں میں بھی شباب کا جمال دیکھتی ہے۔ محنت کے جلال پر اُن کی نظریں نہیں جاتیں۔

آ رہی ہے باغ سے مالن وہ اٹھلاتی ہوئی
مسکرانے میں لبوں سے پھول برساتی ہوئی

ہائے کیا گوری کلائی میں ہے کھچا دلفریب
ہائے کیا چاندی کی ہیکل ہے ستم ڈھاتی ہوئی

(مالن)

اور

روحِ شاعر آج پھر ہے وجد میں آئی ہوئی
آم کے باغوں پہ ہے کالی گھٹا چھائی ہوئی

آ رہی ہیں ناز سے نوخیز جامن والیاں
ٹھوکروں میں اجنبیت چال اٹھلاتی ہوئی

ایڑیں لٹکے ہوئے پوروں کا دستِ پا میں لوچ
دھوپ سے تپتے ہوئے کھیتوں کی سنولائی ہوئی

دونوں ہاتھوں سے سنبھالے ہیں سروں کی ٹوکری
ہاتھ انگڑائی کی صورت آنکھ شرمائی ہوئی

ہائے یہ بکھری ہوئی زلفیں یہ کالی جامنیں
ہائے یہ گلشن یہ ساون کی گھٹا چھائی ہوئی

(جامن والیاں)

پٹیالہ گیٹ، سنگرور، پنجاب

جوش ریل گاڑی پر سوار تھے۔ جنگل میں وہ ریل گاڑی رکتی ہے تو وہاں کھڑی ایک لڑکی پر ان کی نظر پڑتی ہے۔ وہ شاید لکڑیاں اکٹھی کر رہی تھی۔ اُسے دیکھتے ہی شاعر کی رومانی طبیعت میں ہیجان پیدا ہو جاتا ہے اور وہ پکار اٹھتے ہیں:

زاہد فریب، گل رُخ، کافر، دراز مژگاں
سیمیں بدن، پری رُخ، نوخیز، حشر ساماں
(جنگل کی شہزادی)

ہمارے یہ شاعرِ انقلاب رومان پرور ہونے کے باعث محنت کی عظمت کا ادراک نہیں رکھتے تھے۔ ایک محنت کش دوشیزہ کے بارے میں ان کے خیالات ملاحظہ فرمائیں۔ اپنی "حُسن اور مزدوری" نظم میں جوش چیتھڑوں میں ملبوس، دھوپ میں پتھر توڑ رہی ایک دوشیزہ کا المیہ پیش کرتے ہیں۔ اُنہیں اس بات کا دُکھ تو ہے کہ ایک عورت کوائی محنت مشقت کرنی پڑ رہی ہے جس سے یہ تو ظاہر ہوتا ہے کہ اُنہیں اس سے بڑی ہمدردی ہے۔ مگر آخری شعر میں اس کی جگہ "شبستانِ طرب" بتائی ہے۔ اس سے ان کے ذہنی رویے کی غمازی ہوتی ہے۔

پی رہی ہیں سرخ کرنیں مہرِ آتش بار کی
نرگسی آنکھوں کا رنگ اور چمپئی رخسار کی

چیتھڑوں میں دیدنی ہے روئے غمگین شباب
ابر کے آوارہ ٹکڑوں میں ہو جیسے ماہتاب

اُف یہ ناداری! مرے سینے سے اُٹھتا ہے دھواں
آہ اے افلاس کے مارے ہوئے ہندوستاں

حُسن ہو مجبور کنکر توڑنے کے واسطے
دستِ نازک اور پتھر توڑنے کے واسطے

آسماں جانِ طرب کو وقفِ رنجوری کرے
صنفِ نازک بھوک سے تنگ آ کے مزدوری کرے

اُس جبیں پر اور پسینہ ہو جھلکنے کے لئے
جو جبیں نازؔ ہو افشاں چھڑکنے کے لئے

بھیک میں وہ ہاتھ اُٹھیں التجا کے واسطے
جن کو قدرت نے بنایا ہو حنا کے واسطے

نازکی سے جو اُٹھا سکتی نہ ہو کاجل کا بار
اُن سیہ پلکوں پہ بیٹھے راہ کا بوجھل غبار

کیوں فلک مجبور ہوں آنسو بہانے کے لئے
انکھڑیاں ہوں جو دلوں میں ڈوب جانے کے لئے

مفلسی چھانٹے اُسے قہر و غضب کے واسطے
جس کا مکھڑا ہو شبستانِ طرب کے واسطے

ادھر کوٹھوں پر عصمت فروشی کرنے والی مجبور عورتوں سے بھی جوش کو کوئی ہمدردی نہیں۔ "آیات و نغمات" میں درج نظم "خبردار اے دل" میں وہ رقم طراز ہیں:

یہ عبرت کی محفل ہے عشرت کی منزل
معاذ اللہ! اس بخت کا حُسنِ محمل

اگر دُور ہے تو مسیحا مماثل
جو نزدیک آئے تو سفّاک قاتل

اسے بھول کر بھی نہ چمکار اے دل
خبردار اے دل، خبردار اے دل

بظاہر محبت، بہ باطن ستم ہے
جو دیکھو تو امرت جو چکھو تو سم ہے

یہ نازک سے پیکر میں جو پیچ و خم ہے
تشنج یہ دراصل بہرِ درم ہے

تشنج میں ہے جنبشِ مار اے دل
خبردار اے دل، خبردار اے دل

نہ گا حُسنِ بازار کے راگ ناداں
یہ پانی نہیں آگ ہے آگ ناداں

یہ کاکل نہیں، ناگ ہے ناگ، ناداں
ارے بھاگ ناداں، ارے بھاگ ناداں

وہ رینگا ارے ناگ، ہشیار اے دل
خبردار اے دل، خبردار اے دل

جوش کے دل و دماغ پر یہ بات ثبت تھی کہ عورت اور مرد میں کسی قسم کی کوئی یکسانیت اور مساوات ہو ہی نہیں سکتی۔ ان کا خیال تھا کہ قدرت نے ان دونوں کو الگ الگ رول عطا کئے ہیں۔

جب ضمیرِ حق میں انساں کا ہیولیٰ بن چکا
مرد کو فصلِ خزاں کی دھوپ نے پیدا کیا

اور عورت کو بنایا اک سبک رو نہر سے
موسمِ گل کی معطر چاندنی کی لہر سے

مرد کو تحفے میں دی شمشیر و تدبیرِ حیات
اور عورت کو چراغ و بربط و قند و نبات

راستے میں مرد کے ڈالے گئے تیغ و تبر
اور عورت کی طرف پھینکے گئے گل برگِ تر

مرد کے اعضا کو بخشا سنگ و آہن کا جلال
اور عورت کو صبا کا لوچ، شبنم کا جمال

مرد کو بخشا لہو افسردۂ میدانِ جنگ
اور عورت کو ملا پگھلے ہوئے سونے کا رنگ

اُس نے صولت پائی اس نے جلوۂ سحر طراز
اُس کو محنت دی گئی اس کو محبت کا گداز

اس کو طبلِ جنگ کا ہنگامۂ دہشت فزا
اِس کو ہلکی نرم کلیوں کے چٹکنے کی صدا

اس کو طوفاں گاہِ بیداری، اسے خوابِ خیال
اس کو چشمِ ضیغم و شاہیں، اسے چشمِ غزال

اس کو شانِ مہر، اس کو جلوۂ ماہِ منیر
اس کو سنگِ آشوبِ تیشہ، اس کو رقصِ جوئے شیر

اس کو تاجِ غزنوی، اس کو خمِ زلفِ ایاز
اس کے ماتھے کو شکن، اس کے لبوں کو موجِ ناز

اس کو بخشا نازِ خمِ دندانِ تلاطم کے لئے
اس کو رکھا پاک، بچوں کے تبسم کے لئے

اس کو شورِ حرب، اس کو شوخیٔ گفتار دی
تیغ دی اس کو، اسے پازیب کی جھنکار دی

(خاتونِ مشرق ۔ فکر و نشاط)

اس لئے کلامِ جوش میں عورت کا تصور بالکل روایتی ہے۔ وہ دنیا کی تمام جدوجہد اور کشمکش کو مرد سے منسوب کرتے ہیں اور عورت کو صرف حسن و شباب کا مجسمہ

جوش نے اپنی شاعری میں عورت کا جو تصور پیش کیا ہے، وہ وہی تصور ہے جو اس وقت رائج اور معتبر تھا اور ہمیں اس لحاظ سے مایوسی ہوتی ہے کہ ان کی انقلابی شاعری میں بھی عورت کا وہی کردار اور رول ہے جو خالص جاگیردارانہ نظام کا مظہر ہے، لیکن اس نظام میں عورت کو ایک باوقار مقام ضرور حاصل تھا، لیکن ۴۷ء کے فسادات میں عورتوں پر وحشیانہ مظالم کئے گئے تو جوش چیخ اٹھے۔ ؎

کس کس مزے سے ہم نے اچھالی ہیں عورتیں
سانچے میں بے حیائی کے ڈھالی ہیں عورتیں

شہوت کی بھٹیوں میں اُبالی ہیں عورتیں
گھر سے برہنہ کرکے نکالی ہیں عورتیں

کیا کیا نہ کنواریوں کو کھنچایا ہے دھوم سے
کیا کیا نہ چھوکروں کو رُلایا ہے دھوم سے

بہنوں پہ بھائیوں کو گرایا ہے دھوم سے
باپوں کو بیٹیوں پہ چڑھایا ہے دھوم سے

جب بھی زنا کیا ہے تو قرآں اس آن پہ
زوجہ کے سر کو رکھا ہے شوہر کی ران پہ

"یادوں کی برات" میں جوش نے سروجنی نائیڈو کی بڑی تعریف کی ہے۔ کیوں کہ وہ اچھی شاعرہ ہی نہیں بلکہ جنگِ آزادی کی عظیم مجاہدہ بھی تھیں۔ لیکن ان کی شاعری میں عورت کا جو عمومی تصور ہے وہ سروجنی نائیڈو جیسی خواتین کے لئے نہیں ہے۔ ان کی شاعری میں عورت کے حسن و شباب کی تعریف تو ہے، لیکن مجموعی طور پر عورت کو وہ مساوی درجہ نہیں دیا گیا ہے جس کی وہ مستحق تھی۔

جوش کی انسان دوستی، حب الوطنی، سامراج دشمنی، قدرت سے پیار، حسن پرستی، زبان دانی، سخن فہمی اور بسیار گوئی مسلّم ہے۔ لیکن ان کی خود ستائی، لاابالی پن اور علومِ جدیدہ کے مطالعے کی کمی انہیں وہ مقام نہ دلوا سکی جس کے وہ مستحق تھے۔

●

عقیل شاداب

شاعرِ انقلاب

(بیادِ جوش)

بہتر یہی ہے اس کو خدائے سخن کہیں
خود اپنے آپ میں اسے اک انجمن کہیں
ذرّے کو آفتاب بنا کر دکھا گیا
اک انقلاب شعر میں لا کر دکھا گیا
اس نے فرنگیوں کو بھی بخشا نہیں کبھی
مانا شکستہ ہند کا نقشہ نہیں کبھی
اس کے قلم نے گل کو گلستاں بنا دیا
اپنے جنوں سے گھر کو بیاباں بنا دیا
اس کا ہر ایک حرف حکایت سے کم نہ تھا
وہ خود بھی ایک زندہ روایت سے کم نہ تھا
عرشِ بریں لرزتا تھا اس کے عروج سے
دنیائے علم کانپ اٹھی تھی خروش سے
لفظوں کا بادشاہ معانی کا راز داں
سوچا نہ تھا کسی نے بھی وہ کر گیا یہاں
آزاد کا حبیب تھا نہرو کا یار تھا
اندرا کے دل میں اس کا ادب تھا وقار تھا
افسوس ہند و پاک کے جھگڑوں میں بٹ گیا
اور ایک دن خود اپنی ہی مٹی سے کٹ گیا
انساں ہی کیا اس کی تو جنگ خدا سے تھی
طوفاں سے تھی جنگ لڑائی ہوا سے تھی
مرنے سے قبل خود کو وہ مرحوم لکھ گیا
معلوم ہی کیا جو نہ تھا معلوم لکھ گیا
ہم سے خفا جو ہو گیا پیغمبرِ سخن
اب اس کو ڈھونڈتی ہے یہاں کی ہر انجمن
ہر آنکھ اشکبار ہے ہر دل دو نیم ہے
وہ تھا عظیم اس کا تعلق بھی عظیم ہے
تھا نام جوش کام جمال و جلال تھا
حرف و ہنر کے باب میں وہ بے مثال تھا

برج راج پورہ، کوٹہ ۳۲۴۰۰۶ (راجستھان)

جوشؔ ملیح آبادی: مراثی اور سلام میں احساسِ حُسن!

شکیل الرحمٰن

جوشؔ ملیح آبادی احساسِ حُسن کے ایک منفرد شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں حُسن کا غیر معمولی احساس ملتا ہے۔ یہ احساس اردو کلچر کی ایک بڑی نعمت ہے۔ جب جوشؔ کی جمالیات پر کام ہوگا تب ہی حُسن کے احساس کی سچی پہچان ہوگی۔ اُن کا اسلوب، جلال و جمال کے تجربوں کے رنگ و آہنگ کی دین ہے کہ جس کا مطالعہ ہونا چاہیئے۔ مراثی اور سلام میں بھی اُن کا احساسِ حُسن روشن اور تابناک ہے۔ کربلا کے المیے کا احساس کتنا شدید اور کس قدر جان لیوا ہے۔ اس کا اندازہ صرف ایک ہی شعر سے ہو جاتا ہے۔ ؎

کہہ دوں تو دل سے خون کا چشمہ اُبل پڑے
اور چُپ رہوں تو منھ سے کلیجہ نکل پڑے

اس جان لیوا احساس کے ساتھ مراثی لکھتے ہیں اور زندگی اور موت، اعلیٰ تریں، افضل تریں اقدار اور پُر عظمت شخصیتوں پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے اپنے احساسِ حُسن کو محسوس بنا جاتے ہیں۔ ان کے مراثی میں جلال و جمال کے تجربے غیر معمولی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔

جوشؔ کا جمالیاتی تصوّر اس لئے بھی زیادہ قابلِ توجہ ہے کہ شاعر تمام تخلیقات، کائنات کی ہر شے میں حُسن اور حُسن کے کسی نہ کسی پہلو کو پاتا اور محسوس کرتا ہے۔ جوشؔ کی نظر میں کوئی شے بدشکل نہیں ہے، ہر بات، ہر ادا، زندگی کا ہر رُخ ایک حُسن رکھتا ہے، نفاست ہے ہر پہلو میں اور جمال ہے ہر جہت اور ہر منظر میں! ’وژن‘ ہو تو نگاہ ہر شے کے جمال تک پہنچ جاتی ہے۔ نار میں نور اور ذرّے میں طور کا جلوہ نظر آنے لگتا ہے۔ کہا ہے:

لیلائے شب تار ہے یا حورِ سحر ہے
جس حال میں ہوں حُسن مرے پیشِ نظر ہے

جوشؔ نے حُسن کو ایک مثبت قدر تصوّر کیا ہے جو جبلّت کی پیداوار ہے، حُسن سے انبساط حاصل ہوتا ہے تو اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ یہ خدا ہے، خالق ہے، حُسن خدا ہے اور خدا حُسن، ہر شے میں اسی کی تصویر نظر آتی ہے۔

خدا یا خالقِ کائنات کی وجہ سے جمال و جلال میں تصوّر میں وسعت اور گہرائی پیدا ہوئی ہے، طوفانوں اور بگولوں کے جلال میں بھی اُسی کی صورت نظر آتی ہے۔ اور اس سے دل مسرتوں سے آشنا ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں:

سینے میں چھپائے ہوں جو انوار کسی کے
دل میں نہیں آتے ہیں خیالات دوئی کے
روتے کے ہوں اسباب کہ سامان ہنسی کے
جو چیز ہے ڈھل جاتی ہے سانچے میں خوشی کے
لیلائے شب تار ہے یا حورِ سحر ہے
جس حال میں ہوں حُسن مرے پیشِ نظر ہے

اغیار کی فوجیں ہوں کہ احباب کی محفل
گرمی کے بگولے ہوں کہ لیلیٰ کی ہو محمل
راہوں کی صعوبت ہو کہ خوابِ سرِ محفل
ہوتا ہے ہر اک چیز سے بشاش مرا دل
صد شکر مرے دل پہ حقیقت یہ عیاں ہے
ہر آئینے میں دوست کی تصویر نہاں ہے

ہر بات میں اک حُسن ہے، ہر شے میں نفاست
بدشکل کوئی چیز نہیں ہو جو بصارت
رونا بھی ہے اک راگ جو کامل ہے سماعت
ہر اشک کے ساغر سے اُبلتی ہے بشاشت
آنکھیں ہوں اگر نار میں ہے نور کا جلوہ
ہر ذرّۂ ناچیز میں ہے طور کا جلوہ!

اردو شاعری میں یہ متوازن اور خیال انگیز تصوّر اور لہجہ کہیں نہیں ملتا۔ یہ خیال تو ملتا ہے کہ ظلمات کے حجاب میں تنویر بھی تو ہے، لیکن یہ بات اور کہیں نہیں ملتی کہ ’ہر بات میں اک حُسن ہے، ہر شے میں نفاست‘ بدشکل کوئی چیز نہیں ہو جو بصارت!“ جوشؔ حُسن کو زندگی کی رُوح بنا دیتے ہیں۔

سدھوبن، سائنلہ سٹی، گڑگاؤں، ہریانہ

ایسی قدر کی صورت اُجاگر کرتے ہیں کہ جس سے جمالیاتی انبساط حاصل ہوتا ہے' کلام میں حُسن ایک ایسا جذبہ ہے جو ذہن کو قدروں کے عام اور فرسودہ تصوّر سے نکال کر ایک صحت مند، لطیف اور سحر آفریں قدر سے آشنا کرتا ہے۔ لہجے کی لطافت اور دلکشی ایسی ہے کہ تجربے بڑی شدت سے اثر انداز ہوتے ہیں۔

جوشؔ تمام اشیاء و عناصر اور تمام جذبات اور تمام تجربات کو ایک وحدت کی صورت دیکھتے ہیں۔ وہ ایک ایسی نگاہ یا ایسے 'وژن' کا تقاضا کرتے ہیں جس سے ان کی وحدت اور جمالیاتی وحدت کی پہچان ہو جائے۔ ان کی نظر میں سچائی یہ ہے:

ہو رنگ کا انبار کہ برسات کا دریا
وہ جیٹھ کی ہو دھوپ کہ بادل ہو وہ پرلا
وہ لُو کے تھپیڑے ہوں کہ ہو موجِ صبا کا
وہ خال سیہ ہو کہ چمکتا ہوا تارا

اے حُسن کے صانع' ترے اسرار نہاں ہیں
ہر شے میں کم و بیش کچھ انوار نہاں ہیں!

اور تقاضا یہ کرتے ہیں:

آشوبِ جہاں، شامِ بلا، صبحِ مسرت
سب ایک نظر آئیں جو ہو روح میں قوت
ہم دل کا اگر ساز ستاروں سے ملا دیں
گو تار بہت سے ہیں مگر ایک صدا دیں!

کہا گیا ہے 'بدصورتی' بھی حُسن کی ایک قدر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بدصورتی کوئی چیز ہی نہیں، اُس نے جو چیز بنائی حسین بنائی، المیہ اور تاریکی بھی جلال و جمال کی ایک صورت ہے، جیسے کبھی جمالیاتی لذت اور مسرت عطا کرتی ہے۔ اس بات کو کبھی اس طرح سمجھاتے ہیں:

کانٹے میں بھی اک شان ہے جو گل میں نہیں ہے

کبھی اس طرح:

در پردہ یہ سب ایک ہیں ظاہر میں جُدا ہیں
سب اپنے مقامات پہ تصویرِ خدا ہیں

حُسن کے احساس کے ساتھ کبھی اس طرح گویا ہوتے ہیں:

پیشانیٔ تشویش میں ہے جلوۂ تمکیں
تلخی میں بھی پوشیدہ ہیں کچھ جوہرِ شیریں
ہر درد کی ایذا میں ہے اک پہلوئے تسکیں
جو داغ ہے وہ دل کے لئے تاج ہے زریں

یہ دل جو دھڑکتا ہے تو اک ضم کی گت ہے
یہ زہر میں سطحے ہیں کہ تریاق کا ست ہے!

جوشؔ کربلا کے المیے کا دردِ منفی اقدار و رجحان سے گریز کرتے ہیں اور اس المیے کو انسان کے تجربوں اور زندگی کا جلوہ بنا دیتے ہیں' زخموں کی بہار دکھانے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ داستانِ کربلا کے کرداروں اور شخصیتوں کو حُسن کی علامتیں بنا دیتے ہیں' شخصیتوں کی داخلی توانائی یا 'انرجی' سے مرثیوں میں ایک عجیب چمک پیدا ہوئی ہے کہ جس سے بار بار میر انیسؔ کے مرثیوں کی روایت کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ غالباً یہ کہنا غلط نہ ہو کہ جوشؔ، میر انیسؔ کی روایت کے ایسے امین ہیں جو اُسے لے کر آگے بڑھے ہیں اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں اور داخلی توانائی اور داستانِ کربلا کے تجربوں کے آہنگ سے اپنے مرثیوں کو انفرادیت بخشی ہے۔

ادبی اور فنی نقطۂ نگاہ سے جوشؔ کے مرثیوں کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ وہ حسن کا ایک لطیف اور نازک ہمہ گیر اور تہ دار تصوّر پیش کرتے ہیں۔ آہنگ اور آہنگ کی وحدت کا حسّی تصوّر لئے ہوئے لطف و انبساط عطا کرتے ہوئے تجسّس کو اکساتے ہیں۔ حسن کے تعلق سے منفی تصوّر سے گریز کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

مہمل ہیں یہ لفظیں "یہ برا ہے وہ بھلا ہے"
جو کچھ ہے وہ صرف ایک تبسم کی ضیا ہے!

'حسن' کی پُراسراریت پر نظر جاتی ہے تو فرماتے ہیں۔

آئینہ ہے اسرار کا ہر منظرِ قدرت
وہ چاند کی خنکی ہو کہ سورج کی حرارت

کربلا کے المیے پر اظہارِ خیال کرنے سے قبل قاری کے ذہن کو تیار کرنا چاہا تو جلال و جمال کے مثبت رویّے کے ساتھ کائنات و عناصرِ کائنات کے حسن کا احساس دلایا۔ ایسے تجربوں میں مشاہدات بھی ہیں اور ذہنی اور جذباتی ردِ عمل کی ہم آہنگی بھی ہے' غنائیت ایسی ہے کہ یہ تجربے نغموں کی صورتیں اختیار کئے بیٹھے ہیں۔ فرماتے ہیں:

اے دوست بتاتا ہوں تجھے روح کے اسرار
صدیوں سے اگر چور ہے تیرا دلِ بیمار
آنکھیں تو اُٹھا دیکھ ذرا حُسن کے انوار
یہ چاند یہ سورج یہ نباتات یہ کہسار

کیوں تیرے خیالات پریشاں ہیں برادر
اک غم ہے تو سو عیش کے ساماں ہیں برادر

غنچوں کی چٹک، گُل کی ہنسی' اوس کے گوہر
زرتارِ شفق' سرد ہوا' باغِ معطر
رنگین گھٹا' قوسِ قزح مہرِ منوّر
نغمے یہ پرندوں کے' پہاڑوں کے یہ منظر

ہے کون سی خوبی جو فسانوں میں نہیں ہے
کیا باغِ ارم منج کے پر توں میں نہیں ہے

یہ غم ہے' وہ راحت ہے' وہ مشکل ہے' یہ درد
ان تنگ خیالات کے حلقے سے نکل آ
ہر فکر سے منہ پھیر لے ہر رنج کو ٹھکرا!
اونچا ہو' بلندی پہ جھلک' روح کو چمکا
محفل میں تصوف کی تجھے بار ملے گا
ہر سانس میں اک معرکہ بازار ملے گا

زندگی اور کائنات کے رموزِ حسن کو اس طرح صاف صاف بیان کیا ہے کہ قاری کا تخیل بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ حسنِ کائنات، حسنِ زندگی اور حسنِ فرد کے تعلق سے جوش کے اسلوبِ فکر کی ندرت غیر معمولی حیثیت رکھتی ہے۔ ہر سانس میں معرکے ایک بازار کو پانے کے لئے زندگی اور اس کے تجربوں کو خانوں میں تقسیم نہ کر بلکہ انہیں ایک وحدت کی صورت محسوس کر' اگر راحت کا حسن ہے تو غم اور المیے کا حسن بھی موجود ہے۔ درد و کرب کو آسودگی حاصل ہو سکتی ہے تو صرف احساسِ حسن اور حسن کی وحدت کے شعور سے۔ جوش کے کلام میں تصورِ حسن کی ہمہ گیری کا اندازہ ان مصرعوں سے کیا جاسکتا ہے:

- دوزخ میں وہی شے ہے جو چمکی تھی سرِ طور!
- ذروں میں جو ہے' مہرِ درخشاں میں وہی ہے!
- جو کفر کے سینے میں ہے' ایماں میں وہی ہے!
- ہے کفر یہ کہنا' یہ ایاز اور وہ محمود!

حسن کی وحدت دراصل آہنگ اور آہنگ کی وحدت ہے' حسن اور اس کے آہنگ کے دائرے کی کوئی ابتدا ہے اور نہ اس کا کوئی اختتام۔ اگر کوئی اپنی ذات کو اس دائرے سے باہر نکالنا چاہتا ہے تو دراصل وہ خودی کے فریب میں مبتلا ہو جاتا ہے اور وحدتِ حسن کے سچے عرفان اور انبساط سے محروم ہو جاتا ہے۔ جوش کے موقف کے ایسے تجربوں میں جو اُبھرا کرتی ہے وہ بلاغت اور رمزیت کی دین ہے۔ شاعر جس زندگی کو اپنے تخیل اور تصور کی گرفت میں اس طرح لیتا ہے کہ قاری کا ذہن جمالیاتی آسودگی پانے لگتا ہے۔

جوش ملیح آبادی نے کربلا کے واقعات میں اعلیٰ اور افضل اقدار کے حسن پر بھی نظر رکھی ہے اور شخصیتوں کے جلال و جمال کو بھی موضوع بنایا ہے۔ حسین ابن علیؑ کی ذات اعلیٰ اقدار کے حسن کا مرکز ہے نیز اُن کا ہر عمل زندگی کے جمال کی نقاب کشائی کرتا ہے۔ اُن کی خدمت میں سلام بھیجتے ہوئے کہتے ہیں:

ضمیرِ اہلِ وحدت اور ذاتِ اہلِ وحشت کو
بہم پیچیدہ و دست و گریباں کر دیا تو نے

جو دھندلا ہو چلا تھا پہلا ورق منشورِ فطرت کا
تو اپنے خونِ دل کو زیبِ عنواں کر دیا تو نے

جراحت کو عطا کر کے شعارِ بخیہ و مرہم
خزاں کو ضامنِ رنگِ بہاراں کر دیا تو نے

بنا کر شمعِ طور اپنے لہو کے گرم قطروں کو
دیارِ ذہنِ عالم میں چراغاں کر دیا تو نے

بقائے آسماں پر اک ضیائے نو دمک اٹھی
زمیں پر چاک جب اپنا گریباں کر دیا تو نے

لہو سے جو چراغاں ہوتا ہے اس سے زندگی کی معنوی جہتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ نیز المیہ کا وہ حسن نمایاں ہوتا ہے کہ جس سے زندگی اور پرکشش اور دلفریب بن جاتی ہے۔ سلام کے ایسے اشعار میں جوش کا بنیادی احساس حسن کا ہے۔ منشورِ فطرت کا پہلا ورق دھندلا ہو چلا تھا تو تو نے اپنے خونِ دل کو زیبِ عنواں کر دیا یا چاکِ گریباں سے بقائے آسماں پر ایک ضیائے نو دمک اٹھی وغیرہ۔ ان سے حسین ابن علی کی شخصیت کا نور بھی دمکتا ہے۔ زندگی اور اس کی تاریخ میں اسی قصد یا اسی توانائی سے تحرک پیدا ہوتا ہے اور صورتوں کی نئی تشکیل ہوتی ہے۔

جس تشنگی کی آگ پہ تھی کربلا کی دھوپ
اس تشنگی کو چشمۂ کوثر بنا دیا

یوں ابھرنے سے رہا نقشِ حیاتِ جاوداں
زندگی پر خون کی لہریں لگانا چاہیئے

پھوٹ نکلا موت کے گرداب سے آبِ حیات
بن گئی بے رونقی دارا تزئینِ حسینؑ

حسین ابن علیؑ کی سیرت کے حسن اور اُن کے عمل کے جمال کا ذکر کرتے ہیں تو جوش کا احساسِ حسن حد درجہ متحرک ہو جاتا ہے۔ اشارے بڑے لطیف اور دل نشین بن جاتے ہیں۔ اختصار میں ایک ڈراما پیش ہو جاتا ہے۔ اکثر ایک مصرعہ ایک منظر بن جاتا ہے:

- مرتے ہیں کس طرح' اسے مر کے دکھا دیا!
- سوکھے ہوئے ہونٹوں پہ صداقت کا سبق تھا!
- ماتھے پہ شکن تھی نہ بدن غرقِ عرق تھا
  رُخ پر وہ صباحت تھی کہ سونے کا ورق تھا!

- اس حُسن سے کانپتا تھا کہ ہر بوند جل اٹھی !

- سانچے میں ڈھالنے کے لیے کائنات کو
  جو تولتا تھا نوکِ مژہ پر حیات کو!

- جس کا لہو تلاطمِ پنہاں لئے ہوئے
  ہر بوند میں تھا نوح کا طوفاں لئے ہوئے!

- غازہ ہے تیرا خون، رُخِ کائنات کا
  ہر قطرہ کو وہ قند ہے تاجِ حیات کا!

- موجوں پہ تشنگی تھی تسلط کئے ہوئے
  ہر قطرۂ فرات تھا آنسو پئے ہوئے!

خاک کے ذرّات کو تُو نے ثریا کر دیا
آگ کو پانی کیا پانی کو صہبا کر دیا
موت سی کالی بلا کو رشکِ سلمیٰ کر دیا
آخری ہچکی کو گلبانگِ مسیحا کر دیا
سر سے خوفِ نیستی کی یوں بلائیں ٹال دیں
آدمی نے موت کی گردن میں بانہیں ڈال دیں!

- کربلا کی دھوپ پر چھٹکی ہے اب تک چاندنی !

ایسے اشعار اور مصرعوں کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ یہاں ہر مصرعہ ایک فسانہ اور ہر شعر ایک کہانی ہے۔ ایک مقام پہ احساسِ حسن کے ساتھ جوش صاحب نے پہلے تو پُراسرار فضا آفرینی کی ہے اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا عمدہ اظہار کیا ہے۔ اس کے بعد کربلا کے رُخِ رنگیں اور اس کی فضا کے جمال کا ذکر کیا ہے۔ اردو مرثیوں میں جوش کی اس خوبصورت تخیل کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ فرماتے ہیں:

کربلا اب بھی سرِ وقت پہ لہراتی ہے
زلف کی طرح خیالات پہ بل کھاتی ہے
خامشی رات کو جس وقت کہ چھا جاتی ہے
دلِ زینب کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے
کبھی ظلمت میں جو کوندا سا لپک جاتا ہے
ایک قرآن بلندی پہ نظر آتا ہے

اب بھی اک سمت سے اٹھتا نظر آتا ہے دھواں
بیبیاں چند کھلے سر نظر آتی ہیں یہاں

ایک گوشے میں ہے گونجی ہوئی آوازِ اذاں
اک پھریرا ہے سیہ پوش فضا پر غلطاں
چند سائے نظر آتے ہیں خراماں اب بھی
ایک زنجیر کی جھنکار ہے لرزاں اب بھی

اب فضا تبدیل ہوتی ہے، لہجہ بھی بدل جاتا ہے۔ احساسِ حُسن کے یہ تجربے سامنے آتے ہیں۔

کربلا کے رُخِ رنگیں پہ دمک آج بھی ہے
اس کے دہکے ہوئے شیشوں میں کھنک آج بھی ہے
کل کی برسی ہوئی بدلی کی دھنک آج بھی ہے
ایک نوشاہ کے سہرے کی مہک آج بھی ہے
کچھ گریباں نظر آتے ہیں فضا پہ اب بھی
ایک جھولا متحرک ہے ہوا پہ اب بھی

کربلا کے اس منظرِ جمال کے بعد اس کے منظرِ جلال کو بھی دیکھئے:

کربلا سر سے کفن باندھ کے جب آتی ہے
وسعتِ ارض و سماوات پہ چھا جاتی ہے
گرم انفاس سے فولاد کو برماتی ہے
تبر و تیر کو خاطر میں نہیں لاتی ہے
چڑھ کے نیزے پہ دو عالم کو ہلا دیتی ہے
کربلا موت کو دیوانہ بنا دیتی ہے!

احساس، جلال و جمال اور حسنِ بیان دونوں کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ لطیف اور نرم و نازک خیالات بھی ہیں اور ایسے جذبات بھی جو بلند آہنگی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ کربلا کے موضوع میں جو تازگی، لچک اور معنی خیزی ہے، وہ حُسن کا احساس کی دین ہے۔ اس احساس نے نفاست اور موزونیت کا ایک عمدہ معیار قائم کر دیا ہے۔ ●●

رُباعی

محرومِ تجلیاتِ وافر ہو جائے
اپنے سے بنیلِ جہل نافر ہو جائے
زاہد نہ کرے سجدہ تو مومن نہ رہے
عارف جو کرے سجدہ تو کافر ہو جائے

ڈاکٹر خالد محمود

جوشؔ کا مرثیہ : حُسین اور انقلاب

(ایک تجزیاتی مطالعہ)

اُردو زبان میں مرثیے کی روایت نہایت مستحکم ہے۔ اس خاص موضوع کے تعلق سے دنیا میں کسی بھی زبان کی شاعری اردو زبان کا مقابلہ کرنے سے قاصر ہے۔ مرثیے نے اردو میں رزمیہ نگاری کی کمی کو بھی بڑی حد تک پورا کیا ہے۔ انیسؔ و دبیرؔ نے اپنے کمالِ فن کے ذریعے اس صنفِ شاعری کو مختلف کلاسیکی اصنافِ سخن کی خصوصیات سے مالا مال کر دیا ہے۔ غزل کا سوز و گداز، رمزیت، معنویت، مثنوی کا لطفِ بیان، جزئیات نگاری اور منظر کشی، قصیدے کی شوکتِ الفاظ، علوئے تخیل اور نزاکتِ خیال، ڈرامے کی جذبات نگاری، کردار نگاری اور مکالمہ سب کچھ سمیٹ کر مرثیے کے دامن میں ڈال دیا ہے۔

میر انیسؔ نے ایک اور اضافہ یہ بھی کیا کہ مرثیہ لکھنے کے ماسوا اس کی قرأت کو بھی ایک فن بنا دیا۔ اور لکھنے اور پڑھنے میں ایسے کمالات اور جوہر پیدا کئے کہ پڑھنے اور سننے والے حیرت زدہ رہ گئے۔ اردو میں مرثیہ نگاری اور خصوصاً انیسؔ و دبیرؔ کی مرثیہ نگاری پر ان گنت مضامین اور درجنوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ ناقدینِ فن نے اس فنِ شریف کو ہر زاویے سے پرکھنے کی کوششیں کرتے ہوئے تحقیق و تنقید کا حق ادا کر دیا ہے۔ اس ضمن میں صرف مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم ہی کی خدماتِ عالیہ کا جائزہ لیا جائے تو یہ دیکھ کر مسرت انگیز حیرت ہوتی ہے کہ اردو زبان نے ایسے افراد بھی پیدا کئے ہیں جن کے انفرادی کارنامے اداروں کے اجتماعی کاموں کو شرمندہ کر سکتے ہیں۔

مرثیے کے تعلق سے انیسؔ و دبیرؔ کے حوالوں کے بعد جوشؔ کی مرثیہ نگاری پر گفتگو کرنا بادی النظر میں بے سود سا معلوم ہوتا ہے، مگر ایسا ہے نہیں۔ جوشؔ کی مرثیہ نگاری خصوصاً ان کے مرثیے "حسین اور انقلاب" کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ یہ سچ ہے کہ مرثیے کے فنی لوازمات اور معرکۂ رزم و بزم میں جوشؔ اپنی ساری زبان دانی کے باوصف انیسؔ و دبیرؔ کے حریف نہیں ہو سکتے۔ جوشؔ الفاظ کے بادشاہ ہیں اور ایک ایک بات کو سو سو طرح کہنے کا فن جانتے ہیں۔ نت نئی تشبیہات کے استعمال سے نئی فضا بندی میں جوشؔ کا ثانی نہیں۔ لیکن انیسؔ و دبیرؔ پھر انیسؔ و دبیرؔ ہیں اور جب میدان بھی انہیں کا ہو تو اس فن میں ان کی سی بلندی تک پہنچنا امرِ محال ہے۔

جوشؔ کے مرثیے "حسین اور انقلاب" پر گفتگو سے پیشتر یہ بات واضح کر دینا مناسب ہوگا کہ یہاں ان کے مرثیے کا انیسؔ و دبیرؔ اور دوسرے مرثیہ گویوں سے مقابلہ یا موازنہ مقصد نہیں بلکہ معرکۂ کربلا، شہادتِ حسین اور غمِ حسین کے تعلق سے "حسین اور انقلاب" میں جوشؔ کے نقطۂ نظر کی تلاش مقصود ہے۔ اس زاویۂ خیال کے ساتھ فنِ مرثیہ گوئی سے قطع نظر کر کے اردو مرثیے کی ساری روایت کا عطر کشید کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس طویل روایت میں تمام مرثیہ گویوں کا مقصد امام حسین اور ان کے رفقاء، ان کی معصوم شخصیت اور ان پر کئے گئے ظلم کو یاد کر کے ان کی عظیم قربانیوں کو خراجِ عقیدت پیش کرنا ہے اور ایسے در بے بہا کی شہادت کو اسلام اور انسانیت کا سانحۂ عظیم سمجھ کر اس پر آنسو بہانا اور ماتم کرنا ہے۔ باقی تمام باتیں اسی جذبۂ ماتم کو ابھارنے اور اس کے نتیجے میں ثواب حاصل کرنے کی غرض سے لکھی گئی ہیں۔ جیسے ؎

ہاں مومنو ہپا ہوا محشر بکا کرو
تن سے جُدا ہوا سرِ سرور بکا کرو

حالانکہ ایسا بھی نہیں کہ تمام مرثیہ گویوں نے مقصدِ شہادت کو صرفِ نظر کر دیا ہو۔ مگر مرثیے کے لاکھوں اشعار کے نایاب ذخیرے میں شہادتِ عظمیٰ کے بنیادی جذبے اور اس میں مقصد پہ فریاد و ماتم اس درجہ حاوی نظر آتا ہے کہ امام حسین اور ان کے رفقاء کے ایثار و قربانی کے بنیادی مقصد کی حیثیت ثانوی ہو کر رہ جاتی ہے اور اس پر ایک غلاف سا پڑ جاتا ہے۔ جوشؔ نے اسی غلاف کو ہٹانے کی کوشش کی ہے۔ یہی کوشش جوشؔ کے مرثیے "حسین اور انقلاب" اور دوسرے روایتی انداز کے مرثیوں کے درمیان حدِ فاصل مقرر کرتی ہے۔ جوشؔ غمِ حسین میں شور و شین کرنے اور ماتم کناں ہونے کو غیر مستحسن تو نہیں سمجھتے مگر ان کی نظر میں امام حسین کے اس مقصدِ شہادت پر بھی رہتی ہیں جس کے نتیجے میں یہ حشر برپا ہوا تھا اور وہ عظیم ترین مقصد باطل کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے کی جرأتِ انکار سے عبارت تھا جس کے لازمی نتیجے کے طور پر کلمۂ حق کی بنیاد استوار ہوئی اور حضرت

شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

خواجہ معین الدین چشتی سجزی اجمیریؒ نے فرمایا:

شاہ است حسین بادشاہ است حسین
دیں است حسین دیں پناہ است حسین
سرداد نداد دست در دست یزید
حقا کہ بنائے لا الہ است حسین

جوشؔ کے مرثیے "حسین اور انقلاب" کی بنیاد اسی عقیدے، اسی خیال اور اسی نظریے پر قائم ہے، وہ کہیں بُکا کرنے کی تلقین نہیں کرتے۔ کیوں کہ ان کے خیال میں امام حسین کی شہادت نے اسلام اور ساری انسانیت کو جو سربلندی عطا کی ہے وہ سربلندی ہی اس شہادت کا حاصل ہے۔ کربلا کے تعلق سے اپنی ایک مشہور نظم "ذاکر سے خطاب" میں جوشؔ اس بات پر چراغ پا نظر آتے ہیں کہ پیشہ ور ذاکر شہادتِ حسین کے نام پہ رونے رُلانے کا کاروبار کرتا ہے۔ اس نظم میں جوشؔ کا لہجہ اس قدر تلخ ہو جاتا ہے کہ وہ ذاکر کو "مردِ منفعل" "ماتم پسند" اور "افسردہ فطرت" جیسے ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ اس نظم میں کربلا کے سلسلے میں وہ اپنا نقطۂ نظر ان الفاظ میں واضح کرتے ہیں:

کربلا سے واقفیت بھی ہے مردِ منفعل
کربلا در پردہ بشاش اور بظاہر مضمحل
جس کی رفعت سے بلندی آسمانوں کی خجل
جس کے ذروں پر دھڑکتے ہیں جوانمردوں کے دل
خندہ زن ہے جس کی رفعت گنبدِ افلاک پر
مہرِ تکمیلِ نبوت ثبت ہے جس خاک پر

اس نظم کے کچھ اور اشعار بھی ملاحظہ کیجیے۔ ان اشعار کے مطالعے سے جوشؔ کے ذہن کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے:

سوچ تو کچھ جی میں اے مشتاقِ راہِ مستقیم
مومنوں کے دل ہوں اور واماندۂ امید و بیم
حسرتِ آہ و بکا سے دل ہوں سینے میں دو نیم
کیوں یہی لے دے کے تھا کیا مقصدِ ذبحِ عظیم
خوف ہے قربانیٔ اعظم نظر سے گر نہ جائے
ابنِ حیدر کے لہو پر دیکھ پانی پھر نہ جائے

اس نظم میں جوشؔ امام حسین کو کس محبت اور کس فخر سے یاد کرتے ہیں کہ امام حسین کی غیرت و حمیت، شرافت و نجابت اور ایثار و قربانی کے ساتھ بے بدل شجاعت اور بے مثل صبر کی یاد تازہ ہو جاتی ہے:

جو دہکتی آگ کے شعلوں پہ سویا وہ حسین
جس نے اپنے خون سے عالم کو دھویا وہ حسین
جو جواں بیٹے کی میت پر نہ رویا وہ حسین
جس نے سب کچھ کھو کے پھر کچھ بھی نہ کھویا وہ حسین

مرتبہ اسلام کا جس نے دوبالا کر دیا
خون نے جس کے دو عالم میں اجالا کر دیا

ہنس کے جس نے پی لیا جامِ شہادت وہ حسین
مر گیا لیکن نہ کی فاسق کی بیعت وہ حسین
ہے رسالت کی سپر جس کی امامت وہ حسین
جس نے رکھ لی نوعِ انسانی کی عزت وہ حسین
وہ کہ سوزِ غم کو سانچے میں خوشی کے ڈھال کر
مسکرایا موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر

بظاہر یہ دونوں بند مرثیے کے معلوم ہوتے ہیں۔ حالانکہ "ذاکر سے خطاب" کا حصہ ہیں۔ جوشؔ نے جہاں بھی امام حسین کو یاد کیا ہے شہادت کے بنیادی مقصد کو سامنے رکھ کر اتباعِ حسین میں عمل کو تحریک دی ہے اور غیرتِ ایمانی کو للکارا ہے۔ ذاکر سے کہتے ہیں:

ہاتھ ہے ماتم میں تیرا سینۂ افگار پر
اور حسین ابنِ علی کا ہاتھ تھا تلوار پر

ذہن کو بیچارگی سے اُنس پیدا ہو گیا
اَشجعِ عالم کے پیرو یہ تجھے کیا ہو گیا

جوشؔ اسی فکر و نظر کے ساتھ "حسین اور انقلاب" میں نمودار ہوئے ہیں۔ مرثیے کا عنوان ہی جوشؔ کے نقطۂ نظر کا مکمل تعارف ہے۔ جوشؔ نے امام حسین کی ہستی موجود کو جو اگرچہ ہماری ظاہر بین نگاہوں سے روپوش ہے اور ان کے انقلاب آفریں پیغام کو اس کے بنیادی مقصد کے ساتھ پیش کیا ہے۔ امام حسین کی ذاتِ گرامی پوری انسانیت بالخصوص اہلِ ایمان کے لئے تا قیامت مشعلِ راہ بنی رہے گی۔ ان کی عظیم قربانی زندگی کی تمام تر تیرہ و تار راہوں میں مینارۂ نور کی مانند روشن و تابناک ہے۔ "حسین اور انقلاب" سے یہی تاثر ملتا ہے۔

اڑسٹھ بندوں پر مشتمل اس مسدس کا نقطۂ ارتکاز "اعلانِ امرِ حق" ہے۔ کربلا کے وسیلے سے یہی اعلانِ حق فکرِ جوشؔ کی تعمیر کا سنگِ بنیاد بن گیا ہے۔ "حسین اور انقلاب" میں جوشؔ اسی مرکزی نقطے کی تعبیر و تشریح کرتے ہیں۔ "اعلانِ حق" کے راستے کی دشواریاں، سفر کے آغاز و اختتام کے نتائج، منزل کی ظاہری اور باطنی کیفیات اور ان کیفیات کا بیان جوشؔ کے مطمحِ نظر کی وضاحت کرتا ہے۔

زیرِ بحث مرثیے کا آغاز، جوشؔ کے عام انداز میں، حیات کی ناپائیداری کے "فسانۂ آہ و فغاں" اور "تلخی حیات کی ہولناک داستان" کے بیان سے ہوتا ہے۔ دنیا کی بے ثباتی کا یہ نقشہ مثنوی زہرِ عشق کے وصیت نامے "جائے عبرت سرائے فانی ہے" کی یاد تازہ کرتا ہے مگر اس سے کم اثر انگیز ہے۔ آٹھویں بند تک یہی صورتِ حال ہے۔

نویں بند سے جوشؔ مرثیے کی تعمیر کا سنگِ بنیاد رکھتے ہیں اور اس موقع پر وہ صائبؔ کو بھی یاد کرتے ہیں جو ان کا ہم خیال ہے :

یوں تو غمِ معاش کا سوزِ نہاں ہے اور
تکلیفِ جاں گدازیِ عشقِ بُتاں ہے اور
لب تشنگیِ شیب و عذابِ خزاں ہے اور
اعلانِ امرِ حق کی مگر داستاں ہے اور

"گفتار صدق مایۂ آزار می شود
چوں حرفِ حق بلند شود دار می شود" (صائبؔ)

اس کے بعد مسلسل تین بندوں میں "اعلانِ امرِ حق" کی سختیوں کا اظہار ہے ۔ تیسرے بند کا آخری شعر اس خیال کو پوری طرح اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے :

ہر گام پر حیات کے چہرے کو فق کرے
مرنا جو چاہتا ہو وہ اعلانِ حق کرے

"اعلانِ امرِ حق" سے متعلق بندوں کے اختتام کے ساتھ شاعر انسانی نفسیات کی ان گتھیوں کی جانب توجہ مبذول کرتا ہے جو ماحول و وراثت کی طویل روایات اور عادات و اطوار کے وسیلے سے انسانی مزاج کا جزو لاینفک بن جاتی ہیں ۔

کیسے کوئی عزیز روایات چھوڑ دے
کچھ کھیل ہے کہ کہنہ حکایات چھوڑ دے
گھُٹی میں تھے جو حل وہ خیالات چھوڑ دے
ماں کا مزاج باپ کے عادات چھوڑ دے

کس جی سے کوئی رشتۂ اوہام چھوڑ دے
ورثے میں جو ملے ہیں وہ اصنام توڑ دے

اس کے باوجود کوئی جیالا یہ جرأت دکھائے اور اوہام و اصنام توڑنے کی جسارت کرے تو : ؎

اٹھتا ہے غلغلہ کہ یہ زندیق نامراد
کج فکر و کج نگاہ و کج اخلاق و کج نہاد
پھیلا رہا ہے عالمِ اخلاق میں فساد
اے صاحبانِ جذبۂ دیرینۂ جہاد

ہاں جلد اٹھو تباہیِ باطل کے واسطے
جنت ہے ایسے شخص کے قاتل کے واسطے

اور بالخصوص جب ہو حکومت کا سامنا
رعب و شکوہ و جاہ و جلالت کا سامنا
شاہانِ کج کلاہ کی ہیبت کا سامنا
قرنا و طبل و ناوک و رایت کا سامنا

لاکھوں میں ہے وہ ایک کروڑوں میں فرد ہے
اس وقت جو ثبات دکھائے وہ مرد ہے

اور بالخصوص بند ہو جب ہر درِ نجات
حق تشنہ لب ہو دشت میں باطل لبِ فرات
دستِ اجل میں ہو زن و فرزند تک کی ذات
حائل ہو مرگ و زیست میں لے دے کے ایک رات

یہ وہ گھڑی ہے کانپ اٹھے شیرِ نر کا دل
اس تہلکے کو چاہیے فوق البشر کا دل

کربلا کی رات کی مرقع کشی میں جوشؔ اپنے مخصوص فارم میں نظر آتے ہیں ۔ الفاظ جو ان کے دستِ قلم میں کٹھ پتلیوں کی طرح ہیں مناسب ترین تراکیب میں قاری کو مطلوبہ کیفیات سے دوچار کر دیتے ہیں ۔ "ڈراؤنی ظلمت" "مرگِ بے پناہ" "پُرہول خامشی" "موت کی چاپ" "بجھتے ہوئے چراغ" "ارض و سما کی رُکی ہوئی سانس" اور ؎

بکھرے ہوئے ہوا میں وہ گیسو رسول کے
تاروں کی روشنی میں وہ آنسو بتول کے

اس رات میں امام حسینؑ کے بے مثال کردار کا لاثانی واقعہ جوشؔ کی زبان سے سنئے :

وہ رات جب امام کی گونجی تھی یہ صدا
اے دوستانِ صادق و یارانِ باصفا
باقی نہیں رہا ہے کوئی اور مرحلہ
اب سامنا ہے موت کا اور صرف موت کا

آنے ہی پر بلائیں ہیں اب تحت و فوق سے
جانا جو چاہتا ہے چلا جائے شوق سے

"دوستانِ صادق و یارانِ باصفا" بھی آخر حضرت حسینؑ کے رفقا تھے ۔ جواباً عرض کرتے ہیں ؎

قرباں نہ ہو جو آپ کے والا صفات پر
لعنت اس امن و عیش پہ تف اس حیات پر

ڈھلے ہیں ہم حدید کے پیکر ہیں سنگ کے
انساں نہیں پہاڑ ہیں میدانِ جنگ کے

یہی وہ تاریخ ساز رات ہے جسے جوشؔ کے الفاظ میں :

شبیرؑ نے حیات کا عنواں بنا دیا
اس رات کو بھی مہرِ درخشاں بنا دیا

حضرت حسین کی مدح میں جوش نے جو اشعار کہے ہیں، ان میں اور معرکۂ دشت کرب و بلا میں جذبۂ شوق ایک قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وہ جذبہ ہے جس نے حضرت حسین کو اعلانِ حق کا حوصلہ بخشا اور دشت بلا و غم "کو دشت ثبات و عزم" بنا دیا۔ مرثیے کے مدحیہ بندوں میں جوش نے حضرت حسین کو صاحبِ مزاجِ نبوت، وارثِ ضمیرِ رسالت، خلوتی شاہدِ قدرت، فخرِ مشیت، آئینِ جدید کا بانی، کاروانِ عزم کا رہبر، منارۂ عظمت، دلیلِ شرافت اور روحِ انقلاب کا پروردگار جیسے القاب سے یاد کیا ہے۔ بعض اشعار کی والہانہ وارفتگی، جوش کے مخصوص لب و لہجے اور پرجوش اندازِ بیان کے ساتھ معنی خیز اشارے بھی کرتی ہے مثلاً:

ہاں وہ حسین جس کا ابد آشنا ثبات
کہتا ہے گاہ گاہ حکیموں سے بھی یہ بات

یعنی درونِ پردۂ صد رنگ کائنات
اک کارساز ذہن ہے اک کارساز ذات

سجدوں سے کھینچتا ہے جو مسجود کی طرف
تنہا جو اک اشارہ ہے معبود کی طرف

طاقت سی شے کو خاک میں جس نے ملا دیا
تختہ الٹ کے قصرِ حکومت کو ڈھا دیا

جس نے ہوا پہ رعبِ امارت اڑا دیا
ٹھوکر سے جس نے افسرِ شاہی گرا دیا

اس طرح جس سے ظلم سیہ فام ہو گیا
لفظِ یزید داخلِ دشنام ہو گیا

جس کی جبیں پہ کج ہے خود اپنے لہو کا تاج
جو مرگ و زندگی کا ہے اک طرفہ امتزاج

سر دے دیا مگر نہ دیا ظلم کو خراج
جس کے لہو نے رکھ لی تمام انبیا کی لاج

سنتا نہ کوئی دہر میں صدق و صفا کی بات
جس مردِ سرفروش نے رکھ لی خدا کی بات

یا مثلاً یہ اشعار ؎

مردانگی کے طور کا تنہا کلیم ہے | تو سینۂ حیات کا قلبِ سلیم ہے

غازہ ہے تیرا خون رُخِ کائنات کا
ہر قطرہ کو وہ لنذر ہے تاجِ حیات کا

رہتی ردائے شام کی ظلمت ہی دین پر
ہوتا نہ تو تو صبح نہ ہوتی زمین پر

تُو ہے وہ مُہر دفترِ عزم و ثبات پر | اب تک چمک رہی ہے جو پشتِ حیات پر

واحد جو اک نمونہ ہے ذبحِ عظیم کا
شاہد ہے جو خدا کے مذاقِ سلیم کا

حسین اور انقلاب میں جو عزمِ حسین اور روحِ انقلاب کارفرما ہے جوش نے اسی حسینی عزم اور انقلابی روح کو ایک بار پھر آواز دی ہے:

پھر حق ہے آفتابِ لبِ بام اے حسین
پھر بزمِ آب و گل میں ہے کہرام اے حسین

پھر زندگی ہے سست و سبک گام اے حسین
پھر حریت ہے موردِ الزام اے حسین

ذوقِ فساد و ولولۂ شر لیے ہوئے
پھر عصرِ نو کے شمر ہیں خنجر لیے ہوئے

مجروح پھر ہے عدل و مساوات کا شعار
اس بیسویں صدی میں ہے پھر طرفہ انتشار

پھر نائبِ یزید ہیں دنیا کے شہریار
پھر کربلائے نو سے ہے نوعِ بشر دوچار

اے زندگی جلالِ شہِ مشرقین دے
اس تازہ کربلا کو بھی عزمِ حسین دے

مرثیے کے اختتام کے ساتھ اوّل اوّل تو جوش دامنِ حسین تھامنے کی تلقین کرتے ہیں۔ لیکن آخری تین چار بندوں میں "مار و ساقی جانے نہ پائے" قسم کے اشعار پر اتر آتے ہیں۔ حسینی انقلاب یکایک ترقی پسندوں کے انقلاب میں بدل جاتا ہے۔ مثلاً: ؎

عفریتِ ظلم کانپ رہا ہے اماں نہ پائے
دیوِ فساد ہانپ رہا ہے اماں نہ پائے

تلوار شمرِ عصر کے سینے میں بھونک دو
ہاں جھونک دو یزید کو دوزخ میں جھونک دو

اُلٹے رہو کچھ اور یونہی آستین کو
اُلٹی ہے آج جیسی تو پلٹ دو زمین کو

آغاز و اختتام کے ان کمزور پہلوؤں کے باوجود جوش کا نقطۂ نظر صحیح اور حقیقی ہے اور ایک مثبت فکر کی ترجمانی کرتا ہے۔ مرثیے میں نہ روایتی انداز کا چہرہ ہے نہ سراپا نہ رخصت ہے نہ آمد نہ رجز ہے نہ جنگ، نہ شہادت نہ بین۔ اس کے باوجود سب کچھ ہے۔ اس کی اثر آفرینی انفعالیت آمیز نہیں، حوصلہ انگیز ہے اور یہی اس انقلابی مرثیہ کا بنیادی مقصد بھی ہے۔

مغربی بنگال اُردو اکاڈمی

۱۷، سندری موہن ایونیو، کلکتہ ۱۴

مغربی بنگال اُردو اکاڈمی کی ادبی مطبوعات :

نمبر	کتاب	مصنف / مرتب	قیمت
۱۔	صلیبیں مرے دریچے میں	فیض احمد فیض	16 روپے
۲۔	میزان	فیض احمد فیض	20 روپے
۳۔	نواب باقر تخلص مرشدآبادی	ڈاکٹر عبدالرؤف	18 روپے
۴۔	اردو ادب اور بنگالی کلچر	شانتی رنجن بھٹاچاریہ	12 روپے
۵۔	مضامینِ وحشت	مرتب : جمال احمد صدیقی	17 روپے
۶۔	سطحِ آئینہ	سہیل واسطی	12 روپے
۷۔	سبزۂ گل	رئیس احمد فریدی	16 روپے
۸۔	افسانے	مغربی بنگال اردو اکاڈمی	10 روپے
۹۔	سرگزشت آصف	پروفیسر ہارون رشید	12 روپے
۱۰۔	بھول آنگن کے	علقمہ شبلی	2 روپے
۱۱	سائنس آج اور کل	انور سعید خاں	2 روپے
۱۲۔	بنگالی شعراء	نصر غزالی	10 روپے
۱۳۔	روحِ ادب کے افسانے (جلد اوّل)	مغربی بنگال اردو اکاڈمی	6 روپے
۱۴۔	روحِ ادب کے افسانے (جلد دوم)	مغربی بنگال اردو اکاڈمی	4 روپے 50 پیسے
۱۵۔	روحِ ادب کے ڈرامے (جلد اوّل)	مغربی بنگال اردو اکاڈمی	6 روپے
۱۶۔	روحِ ادب کے ڈرامے (جلد دوم)	مغربی بنگال اردو اکاڈمی	6 روپے
۱۷۔	مغربی بنگال میں اردو تذکرہ نگاری	ڈاکٹر عبدالمنان	20 روپے
۱۸۔	بیمار بلبل	ڈاکٹر کلیم سہسرامی	18 روپے
۱۹۔	صدائے زنداں	(قاضی نذرالاسلام کی نظموں کا ترجمہ)	20 روپے
۲۰۔	ناسخ سے وحشت تک	سید لطیف الرحمٰن	25 روپے
۲۱۔	مختصر بنگلہ اردو ڈکشنری	محمد امین	15 روپے
۲۲۔	رابندر ناتھ ٹھاکر	شانتی رنجن بھٹاچاریہ	30 روپے
۲۳۔	فیض شناسی	مرتب پروفیسر اسدالزماں	35 روپے
۲۴۔	بنگال میں اردو ڈرامہ	پروفیسر مشتاق احمد	20 روپے
۲۵۔	بیوقوفوں کا بادشاہ	ڈاکٹر جاوید نہال	10 روپے
۲۶۔	دلچسپ مقابلہ	ڈاکٹر رشید الوحیدی	6 روپے
۲۷۔	شیطانی مشین	ایس۔ جی۔ حیدر	6 روپے
۲۸۔	مغربی بنگال اور بچوں کا اردو ادب	عاصم شہنواز شبلی	25 روپے

دیگر تفصیلات کیلئے : سکریٹری مغربی بنگال اردو اکاڈمی، ۱۷، سندری موہن ایونیو، کلکتہ ۱۴ سے رجوع کریں۔

فون : ـــــ 244 - 8450

ڈاکٹر یعقوب عامر

رباعیاتِ جوشؔ : ایک نظر میں

رباعی بحرِ ہزج میں چار مصرعوں کی وہ مختصر ترین صنفِ سخن ہے جس کو ایک پختہ کار شاعر اپنے نادر تجربات کا ذریعہ بناتا ہے۔ فکر و آگہی کے وہ نقوش جو اُردو کی جملہ اصنافِ سخن میں بار نہیں پاتے عموماً رباعی کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔ رباعی شاعری کی فکر و نظر کا بیش قیمت سرمایہ ہے۔ کیوں کہ اس صنف میں شاعری کی وہ فہم و بصیرت جو براہِ راست زندگی کے گرم و سرد کو چکھنے اور حوادث و تجربات سے گزرنے کے ...... بعد پیدا ہوتی ہے، منعکس ہو جاتی ہے۔ اسی لئے رباعی میں شاعر کا لہجہ عموماً خطابیہ ہوتا ہے اور بعض اوقات اس میں اس کا انتباہ بھی شامل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جب ہم اپنے کلاسیکی شعراء کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کی رباعیوں کے ذریعے ان کے ذہن و فکر اور تجربات و مشاہدے سے بھی مستفیض ہوتے ہیں۔ اردو میں باعتبارِ زمانہ رباعی کی دل کشی اور جاذبیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ قدماء کی طرح بعد کے شعراء بھی اس کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہوئے ہیں۔ چنانچہ جدید دور کے شاعروں میں جوشؔ اور فراقؔ نے رباعی کی طرف رجوع کیا اور اپنی شخصیت کے آئینے میں رباعیوں کے رنگ و روپ کو خوب نکھارا۔

فراقؔ نے ہندو اساطیر و جمالیات سے کام لے کر رباعی کے میدان میں ایک نیا رنگ و آہنگ پیدا کیا۔ اردو رباعی اب تک فارسی کی متعین ڈگر پر گامزن تھی۔ فراقؔ نے اس سے گریز کیا۔ بیرونِ خانہ محبوب کے حسن و جمال کے بیان سے ہٹ کر انہوں نے پہلی مرتبہ گھریلو عورت کے حسن کو عاشق کی نظر سے دیکھا۔ اُن کے یہاں ہندوستانی عورت بالعموم اور ہندو عورت بالخصوص موضوعِ فکر تھی — یہ عورت خواہ گائے کا دودھ دوہ رہی ہو یا پنگھٹ سے پانی بھر کر لائی ہو یا گھر کے صحن میں بیٹھی رامائن کا پاٹھ کر رہی ہو۔ ہر حال میں شاعر کے لئے مرکزِ دل و نگاہ بنی ہوئی ہے۔ ان موقعوں پر فراقؔ کا قلم مصور کی طرح ہندوستانی حسن کو بہار آفریں بنا دیتا ہے [1]۔ فراقؔ نے ہندی کے غیر مانوس الفاظ بے تکلف استعمال کئے ہیں۔ اور وہ اساطیری فضا اور ہندوستانی تمدنی اظہار میں بالکل کھپ بھی گئے ہیں۔ فراقؔ کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے رباعی کے اندر ہندی کے لفظوں کو جگہ دی جو ایک جرأت آزما کام تھا۔ ہندی کے مشکل الفاظ کی افراط سے ان کی پہچان بھی بنی اور یہ روایت انہیں پر ختم ہو گئی۔

جوشؔ رباعی کے ایسے شاعر تھے جو فراقؔ سے پہلے پورے طمطراق کے ساتھ اس میدان میں اترے۔ فراقؔ اس اکھاڑے میں بعد کو اترے تھے۔ یہ دونوں شاعر اپنی افتادِ طبع کے اعتبار سے رومانی اور عشقیہ شاعری کے دلدادہ تھے اور اتفاق سے دونوں نے ماورائی کیفیات کے بجائے ارضی حسن پرستی کی بنیاد ڈالی تھی۔ چنانچہ اکثر و بیشتر اُن کے یہاں مشترک مضامین و احساسات نظم ہوئے ہیں۔ جوشؔ میدانِ نظم کے شہسوار تھے اور فراقؔ میدانِ غزل کے۔ اسی لئے دونوں کے یہاں Treatment کا فرق ملتا ہے لیکن رباعی اُن کے یہاں ایک ایسا مشترک پلیٹ فارم بن گیا ہے جہاں دونوں کے رنگ اپنی خاص نہج و صحیح رکھتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے ہم کنار اور غیر واصل نظر آتے ہیں اور دیکھنے والا اس ملتی جلتی اور جداگانہ لذت سے لطف اندوز ہوتا ہے۔

جوشؔ کی رباعیوں میں بھی کہیں کہیں خانہ دار عورت کا چہرہ چمکتا ہے، لیکن وہ حسن کی جواں سال ساعتوں کے پرستار اور شہد و شیریں ارتعاشات

---

[1]
وہ گائے کو دوہنا سہانی صبحیں
گرتی ہیں بھرے تھن سے چمکتی دھاریں
گھٹنوں پہ کلس کا وہ کھنکنا کم کم
یا چٹکیوں سے چھوٹ رہی ہوں کرنیں

پنگھٹ میں گگریاں چھلکنے کا یہ رنگ
پانی ہچکولے لے کے بھرتا ہے ترنگ
کاندھوں پہ سروں پہ دونوں باہوں میں کلس
مدانکھڑیوں میں [illegible] بھرپور امنگ

آنگن میں سہاگنی نہا کے بیٹھی
رامائن زانو پہ رکھی ہے کھلی
جاڑے کی سہانی دھوپ کھلے گیسو کی
پرچھائیں چمکتے صفحہ پر [illegible] پڑتی ہوئی

۱۵۰، غالب اپارٹمنٹس، پرمانند روڈ، پیتم پورہ، دہلی ۱۱۰۰۳۴

کے شیدائی ہیں۔ حُسن کے متمدنی اظہار کی بھی ان کے یہاں بعض جھلکیاں مل جائیں گی: ؎

یہ چاند کا گھیرا ہے کہ تیرا مکھڑا
فردوس کا ڈیرا ہے کہ تیرا مکھڑا
جنگل کی یہ راتیں ہیں کہ تیری زلفیں
پربت کا سویرا ہے کہ تیرا مکھڑا

ماتھے پہ یہ اوڑھنی کا پلّو آڑا — گھٹنوں پہ یہ لٹکا ہوا ترچھا ناڑا
یہ صبح یہ شربتی دُلائی یہ لنک — مکھڑے پہ یہ بولتا گلابی جاڑا

زلفوں کو ہٹا کے کسمسایا کوئی — فرشِ مخمل پہ رسمسایا کوئی
جیسے کندن پہ موجِ عکسِ مہتاب — یوں جوبن کے صبح مسکرایا کوئی

لیکن جوش کے یہاں فراق جیسی جرأتِ نظارگی نہیں ہے۔ وصل کی نشاط انگیزیوں کے بیان میں اُن کے یہاں کچھ ایسی تصویریں ملتے کے اوراق بھی کُھل گئے ہیں جو اُن کی ہیجانی کیفیت اور جنسی زندگی کو ظاہر کرتے ہیں۔ اساتذۂ سلف نے رباعی کو پختہ عمر کے اعلیٰ تجربات کے اظہار کا وسیلہ بنایا تھا۔ جوش اس توازن کو قائم نہ رکھ سکے۔

یہ رات گئے تیری جماہی توبہ — بُلبل میں یہ آنکھوں کی سیاہی توبہ
اعضا کا یہ پیچ و تابِ اللہ غنی — یہ نیند کے جھپکیان الٰہی توبہ

دل کا ارمان گا رہا ہے دل میں — گھونگھٹ کا سرا اُٹھا رہا ہے دل میں
ہر لوچ میں بج رہے ہیں لاکھوں گھنگھرو — یوں بھاؤ کوئی بتا رہا ہے دل میں

فراق نے بھی وصل کے خاص موقعوں کا اپنی رباعیوں میں ذکر کیا ہے۔ لیکن ان کے یہاں ہیجان انگیزی کے بجائے ایک طرح کی سیرابی اور آسودگی کا اظہار ملتا ہے۔ دو رباعیاں اُن کی بھی دیکھ لیجئے: ؎

یہ راز و نیاز یہ سمے خلوت کا — یہ آنکھ میں آنکھ ڈال دینا تیرا
ہر شے ہے ڈری ڈری سی کچھ مانوس — یہ نرم جھجک سپردگی کی یہ ادا

جب تاروں نے جگمگاتے نیزے تولے
جب شبنم نے فلک سے موتی رولے
کچھ سوچ کے خلوت میں لجا کر اُس نے
نرم اُنگلیوں سے بندِ قبا کے کھولے

لیکن جوش کے یہاں بادلوں کی دھوپ چھاؤں کا جو عالم ہے وہ ایک ہیجانِ حُسن پیدا کر دیتا ہے اور اس سے اُن کی ہیجان انگیزی کی تلافی ہو جاتی ہے۔ جوش کی بے پایاں قوتِ احساس میں اُن کا کوئی شریک نہیں۔ وہ کیفیات سازی اور سماں بندی کے سب سے بڑے فن کار ہیں: ؎

جلتے دل کو ٹٹول دھیرے دھیرے — اکھی مندر کو کھول دھیرے دھیرے
برسہ میں برس رہی ہے پاپی برکھا — کلموئی کوئلیا بول دھیرے دھیرے

زلفِ عریاں سنوارتا ہے کوئی — نقشِ ہجراں اُبھارتا ہے کوئی
جنگل جب جھٹ پٹے میں ہوتا ہے اُداس — تھم تھم کے مجھے پکارتا ہے کوئی

فارسی زبان و ادب میں عمر خیام ایسا شاعر ہے کہ جس کا نام لیتے ہی رُباعی کا لفظ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اُس نے رُباعی کو اپنا پیراہن بنا لیا تھا اور اسی کے اوپر اس نے عالمگیر شہرت حاصل کی۔ اُردو میں تنہا جوش ایسا شاعر تھا جس نے رباعی میں اپنی کل شخصیت کو ڈبو دیا۔ جوش کی فکر، اس کی افتادِ طبیعت اور اس کی زندگی کا سوز و ساز سب کچھ رباعی میں ڈھل گیا۔ جوش کی رباعیوں کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے عمر خیام کے فلسفے اور اپنی افتادِ طبع میں مماثلت کی شان پیدا کی ہے۔ ہو سکتا ہے وہ خیام کے طرزِ فکر سے متاثر ہوئے ہوں۔ بہر حال اُن کے یہاں عمر خیام کے مسلک کی پرچھائیاں ضرور نظر آتی ہیں ؎

کیوں چاک کیا، اب بھی گریباں سی لے
کیوں بندۂ تشنگی ہے، پی لے پی لے
اک آن نہ کر آہ و فغاں میں برباد
بدبخت وہ موت آ رہی ہے جی لے

ہاں فرصتِ زندگی نہایت کم ہے
باوصف کمی ہر اک قدم پہ خم ہے
مل جائے اگر طرب کا کوئی لمحہ
اس لمحے کو کھینچ جتنا اس میں دم ہے

غنچے تری زندگی پہ دل ہلتا ہے
بس ایک تبسم کے لئے کھلتا ہے
غنچے نے کہا اس چمن میں بابا
یہ ایک تبسم بھی کسے ملتا ہے

اب تک ہم نے جوش کی اُن رباعیوں کا ذکر کیا جو اُن کی رندی و سرمستی اور شراب و شباب کا حصہ تھیں اور جو فراق و جوش کو ایک ہی راہ کا ہمسفر بنائے ہوئے تھیں۔ لیکن عشق و جمال کے کوچے سے ہو کر ایک منزل اور نکلتی تھی جس پر جوش شمشیر بکف چلے ہیں۔ وہ منزل تھی تحریکِ آزادی کی۔ جوش جد و جہدِ آزادی کے رجز خواں تھے۔ اسی نسبت سے اُنہیں باغی اور انقلابی شاعر کے نام سے پکارا گیا تھا۔ ان کی رباعیوں میں وطنی جذبے کی جھنکار صاف سُنائی دیتی ہے۔ آزادی کے جذبے کو جس سان کی ضرورت تھی وہ جوش کے یہاں موجود تھی۔ جوش کی شورش پسند طبیعت میں غیظ و غضب کی چنگاریاں بھری ہوئی تھیں۔ ان میں مقاومت ہی نہیں یلغار کا حوصلہ بھی۔ وہ باطل پرستوں پر ...... بجلی کی طرح کڑکتے ہیں اور

ظلم کے مقابلے پر سینہ تان کر کھڑے ہو گئے ہیں اور مظلوموں کے طرف دار اور داد خواہ بن گئے ہیں: ؎

قانون سے جب خموش ہوتی ہے زباں
تو ہونکنے لگتے ہیں دلوں میں طوفاں
جب پشتِ گدا کرب سے جھک جاتی ہے
سلطاں کے تاج پر کڑکتی ہے کماں

کیا خوب تمنائے شہادت نہ ملے
جنسِ عمل و متاعِ جرأت نہ ملے
آنکھوں کو رطوبت تو ملے آنسو کی
سینے کو حسین کی حرارت نہ ملے

جوشؔ نے آزادی کے بعد اہلِ ہند کے لئے خیر سگالی کے جذبے اور نفرت کو محبت سے بدلنے کی ضرورت کو بھی محسوس کیا۔ انفرادی اور ملی دونوں پہلوؤں سے آج کے دور میں تنگ ذہنی سے نکل کر انسانی نقطۂ نظر کو اپنانے کی تلقین کی ہے۔ یہاں جوشؔ نے اسی نکتے کو اجاگر کیا ہے۔ جوشؔ اس معنی میں ہمارے لئے قابلِ حرمت رہنما بھی ہیں۔

سینے میں محبت کا الاؤ جلا کرے
آفاق کا دل میں درد پیدا کر لے
اس لبستہ انا کو ذہن وسعت دے کر
اُٹھ عرصۂ گیتی کا احاطہ کر لے

اس دورِ مسافرت کو نرمی سے گزار
نفرت کو دبا نقشِ محبت کو ابھار
جانا ہے تو چھوڑ جا نہ اپنے پیچھے
اے مردِ خدا شکایتوں کے انبار

یہ ہے وہ بصیرت جو ہمیں جوشؔ کے کلام سے ملتی ہے۔ جوشؔ کی ان رباعیوں کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے ہر قسم کی رباعی کہنے کی کوشش کی ہے اور نفسِ مضمون کے اعتبار سے ان کا لہجہ بار بار کروٹیں لیتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس سے ان کی رباعیوں میں تازگی اور فکر میں دلکشی پیدا ہوئی ہے۔ رباعیوں میں ان کی اچھوتی، دلکش اور دلپذیر تشبیہیں اور انوکھے استعارے جاذبیت پیدا کرتے ہیں اور ان کے جمال و جلال کا رنگ عجب بہار دکھلاتا ہے۔ جوشؔ کے بعد کوئی اور شاعر اردو رباعی کو آگے نہیں لے جا سکا۔

●●

حقائق

دل رسم کے سانچے میں نہ ڈھالا ہم نے
ذرات کو چھوڑ کر حریفوں کے لئے

اسلوبِ سخن کا نیا نکالا ہم نے
خورشید پہ بڑھ کے ہاتھ ڈالا ہم نے

توصیفِ نظارۂ انوار بھی جہل
اک قادرِ مطلق کا جہاں تک ہے سوال

اُمیدِ شہود و شوقِ دیدار بھی جہل
"انکار" بھی جہل ہے اور "اقرار" بھی جہل

مرضی ہو تو سولی پہ چڑھانا یارب
معشوق کہیں "آپ ہمارے ہیں بزرگ"

سو بار جہنم میں جلانا یارب
ناچیز کو یہ دن نہ دکھانا یارب

اکثر انعام قہر بن جاتا ہے
وہ علم کہ اکسیر ہے انساں کے لئے

یہ جبر، کثیف نہر بن جاتا ہے
گر ہضم نہ ہو تو زہر بن جاتا ہے

ذہنی مُردوں سے دل لگاؤں کیونکر
مجرم ہو تو لاکھ بار کر لوں برداشت

چلتی لاشوں کے پاس جاؤں کیونکر
احمق کا مگر بار اُٹھاؤں کیونکر

اک فتنہ ناقصوں میں کامل ہو جانا
تاریخ کے اوراق جو اُلٹے تو کھلا

اک قہر ہے وابستۂ منزل ہونا
اک جرم ہے احمقوں میں غافل ہونا

ڈاکٹر منصور عمر

رباعیاتِ جوشؔ: دوسری نظر میں

(قطرہ و قلزم کے آئینے میں)

اگر کلیم الدین احمد نے غزل کو نیم وحشی صنفِ سخن قرار دیا تھا تو جوشؔ ملیح آبادی نے غزل کو اپنی شاعری میں در آنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ یہ اور بات ہے کہ کلیم الدین احمد اپنی انتہا پسندی کے باوجود غزل کی اہمیت سے انکار نہ کر سکے اور جوشؔ نے بھی کچھ غزلیں ضرور کہیں۔ مگر جوشؔ نے جس طرح غزلوں کو حقیر سمجھا۔ اسی طرح صنفِ غزل نے بھی ان کو اپنا حسین پیراہن پکڑنے کی اجازت نہیں دی اور بالآخر ان کو نظموں کی وادیوں میں پناہ لینی پڑی۔ البتہ انہوں نے نظموں کے ساتھ ساتھ جس صنفِ سخن کو مضبوطی سے پکڑا وہ رباعی ہے۔ چنانچہ جوشؔ کی فکر ان کی نظموں کی طرح رباعیوں میں بھی ہر جگہ جاری و ساری نظر آتی ہے۔

اصنافِ شاعری میں رباعی مشکل ترین صنف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت کم شاعروں نے اس کی طرف توجہ کی ہے اور جن شعراء نے اس دشوار گزار وادی میں قدم رکھنے کی جسارت کی۔ ان میں سے معدودے چند ہی کو رباعی گو ہونے کی وجہ سے شہرت و مقبولیت ملی۔ بیسویں صدی میں جوشؔ کے علاوہ یگانہ، فراق، امجد حیدر آبادی اور اختر انصاری نے کامیابی کے ساتھ یہ سفر طے کیا ہے اور اس سے عہدہ برآ ہو سکے ہیں۔ فراق کو ان کی رباعیوں کا مجموعہ "روپ" نے بڑا شاعر بنانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ اسی طرح اختر انصاری کو گرچہ اُن کے قطعات نے شہرت و مقبولیت عطا کی، لیکن ان کی رباعیاں بھی ان کی شہرت کا سبب بنی ہیں۔

جوشؔ ملیح آبادی صحیح معنوں میں نظم کے شاعر تھے۔ اگر انہوں نے "قطرہ و قلزم" کی رباعیاں نہ بھی کہی ہوتیں جب بھی وہ اسی بلندی پر ہوتے۔ جہاں وہ آج ہیں۔ کیونکہ یہ رباعیاں ۱۹۶۲ء میں شائع ہوئی ہیں اور اس وقت اُن کی عمر تقریباً ستر برس کی ہو چکی تھی اور یہ وہ عمر ہوتی ہے جب کوئی فن کار سب کچھ کہہ چکتا ہے اور اگر مزید زندہ رہتا ہے تو پھر وہ انہی باتوں کو الٹ پھیر کر کہتا رہتا ہے جو وہ پہلے کہہ چکا ہوتا ہے۔ الا ماشاء اللہ!

فنِ رباعی فن کار سے تقاضا کرتا ہے خونِ جگر کا۔ جو فن کار جتنا زیادہ خونِ جگر صرف کرے گا اُس کا فن اتنا ہی نکھرے گا۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی نیا شاعر اس میدان میں قدم رکھنے کی جرأت نہیں کرتا اور اگر وہ ایسا کرتا ہے تو منھ کے بل گرنا لازمی ہے۔ چنانچہ فنِ رباعی سے عہدہ برآ ہونے کے لیے لازمی ہے کہ شاعر نہ صرف فنِ شاعری سے پوری طرح آگاہ ہو بلکہ شعر گوئی پر بھی پوری قدرت رکھتا ہو

نیز یہ کہ اس کے تجربات و مشاہدات کافی وسیع ہوں۔ اور خیالات میں گہرائی اور پختگی بھی ہو۔ رباعی کے خالق کو ایک ایک قدم پھونک کر رکھنا پڑتا ہے۔ اس کی حیثیت پل صراط پر چلنے والے کی ہوتی ہے۔ ذرا سی لغزش ہوئی اور نیچے گہری کھائی میں جا گرے اس کے لئے کافی مشق اور تجربے کی ضرورت ہوتی ہے۔ رباعی لکھنا چاول پر قل ہو اللہ لکھنے کا عمل ہے۔ ہر چند کہ جدید قطعات بھی رباعی کی طرح صرف چار مصرعوں پر مشتمل ہوتے ہیں تاہم رباعی کے مقابلے میں اس لیے آسان ہیں کہ اس میں بحر کی کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ جب کہ رباعی کے لیے چند بحریں مخصوص ہیں۔ گویا جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ رباعی چاول پر قل ہو اللہ لکھنے کا عمل ہے۔ یہی کیا کم تھا۔ مگر اس پر طرہ یہ کہ اس چاول کی بھی تخصیص کر دی گئی کہ فلاں اور فلاں ہی ہونا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ رباعی گو شاعر کو علم العروض سے بھی واقف ہونا از حد ضروری ہے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کوئی شاعر طویل سفر طے نہ کر چکا ہو۔ نیز یہ کہ ذہنی اعتبار سے بھی اس کے اندر پختگی آ چکی ہو۔ جوشؔ خود فرماتے ہیں:

> "رباعی ایک بہت بڑی بلا اور جان لیوا صنفِ کلام ہے۔ یہ کمبخت چالیس برس سے پیشتر کسی بڑے سے بڑے شاعر کے بس میں آنے والی چیز نہیں ..... جب تک کسی شاعر کو بے پناہ مشاقی اور بے نہایت دیدہ وری کی بدولت دریا کو کوزے میں بھر لینے کا کام نہیں آتا۔ اس وقت تک رباعی اس کے قابو میں نہیں آتی۔
>
> قلیل الفاظ کی وساطت سے کثیر معانی کا احاطہ کر کے صرف چار مصرعوں میں اس ربع مسکوں کے تمام تجربات، مشاہدات، تاثرات، نظریات اور افکار کا سمیٹ لینا ایک ننھے سے قطرے میں قلزم کو مقید کر لینا ہر شاعر کے بس کا روگ نہیں۔" (قطرہ و قلزم، ص ۲۰۱)

گویا جوشؔ جیسے زود گو شاعر اور الفاظ کے جادوگر کو بھی اس بات کا پوری طرح احساس تھا کہ رباعی کہنا جوئے شیر لانے سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ میں "قطرہ و قلزم" کی روشنی میں جوشؔ کی رباعیوں کا تجزیہ کروں گا۔ میں نے اس مجموعے کو اس لیے چنا ہے کہ خود جوشؔ نے ان رباعیوں کو اپنی زندگی کا نچوڑ لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

سی۔ ایم۔ کالج، دربھنگہ ۸۴۶۰۰۴

"میری یہ غیر مطبوعہ تازہ رباعیاں جو اس پاک ایڈیشن میں شائع ہو رہی ہیں، میری زندگی کا تقریباً نچوڑ ہیں۔"
(قطرہ و قلزم ص ۳)

"قطرہ و قلزم" میں تقریباً تین سو رباعیاں ہیں۔ یہ تعداد اتنی ہے کہ کسی بھی فن کار کے فکر و فن کو سمجھنے کے لیے کافی ہے اور اس کے سلسلے میں کوئی رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ اقبال نے شاعری کے لیے خونِ جگر کی آمیزش کو ضروری قرار دیا ہے اور جوش بھی اس رائے سے متفق نظر آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ چونکہ شاعر فکر کو آواز کا روپ عطا کرتا ہے اور یہ کام اتنا مشکل ہے کہ شاعر کو اپنے خونِ جگر میں نہانا پڑتا ہے۔ لہٰذا یہ آفاق کے چشم و چراغ ہیں: ؎

یہ، تا بزبان سخن کے لانے والے — یہ، اپنے ہی خوں میں نہانے والے
واللہ کہ ہیں چشم و چراغ آفاق — یہ، فکر کو آواز بنانے والے

انسانی زندگی میں عقل اور عقیدے کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ عقل و خرد کا تعلق عموماً دنیاوی امور سے ہوتا ہے اور عقیدے کا مذہب سے۔ لیکن مذہب اور بالخصوص مذہبِ اسلام یہ نہیں کہتا کہ کسی بھی مذہب کو بلا سوچے سمجھے اپنا لیا جائے۔ اندھی عقیدت یا کورانہ تقلید انسان کو راہِ راست سے دُور ہٹا دیتی ہے۔ لہٰذا اللہ نے انسان کو عقل و شعور بخشا تاکہ وہ سارے معاملات کو اس کی کسوٹی پر جانچے پرکھے اور پھر اس پر عمل کرے۔ اس کے علاوہ اللہ نے اپنے بندوں کے لیے ایک سہولت یہ بھی پیدا کر دی کہ صحیح اور غلط کی نشاندہی بھی کر دی اور نفع اور نقصان سے بھی آگاہ کر دیا۔ اب یہ انسان کا کام ہے کہ وہ ان دو راستوں میں سے کسے اپناتا ہے اور کسے چھوڑتا ہے۔ میری ناچیز رائے میں نہ تو صرف عقیدے پر قائل رہنا چاہیے اور نہ صرف عقل و خرد کی باتوں میں اُلجھ کر عقائد سے گریز کرنا چاہیے۔ کیونکہ بعض چیزوں کا تعلق صرف عقیدوں سے ہوتا ہے اور بعض کا صرف عقل سے اور بعض کا عقیدے اور عقل دونوں سے۔ لہٰذا جو لوگ صرف عقائد سے روشنی حاصل کرتے ہیں اور عقل سے دور بھاگتے ہیں ان کے سلسلے میں جوش یوں خامہ فرسائی کرتے ہیں: ؎

جو لوگ عقائد سے غذا پاتے ہیں — یوں عقل کی آواز سے گھبراتے ہیں
جس طرح بہاروں کی ہوا چلتے ہی — بیمار لحافوں میں دبک جاتے ہیں

جوش کا یہ اعتراض صحیح اور درست، لیکن ٹھیک اس کے برعکس جوش بھی اپنے بنائے ہوئے فارمولے پر پورے نہیں اُترتے۔ اگر ایک طرف مذہب کے اندھے معتقد صرف عقائد سے غذا پاتے ہیں تو دوسری طرف جوش صرف عقل و خرد کی باتیں کرتے ہیں: ؎

ایمان کو خرد کے روبرو لایا ہے — اور بحث کی دل میں آرزو لایا ہے
کیا، اس میرے الاؤ پر آئے گی آنچ — یہ اوس کی اک بوند جو تو لایا ہے

اسی پر بس نہیں بلکہ جوش اپنی عقل و خرد کی روشنی میں اس طرح گم ہو جاتے

ہیں اور ان کی آنکھیں اتنی چکا چوند ہو جاتی ہیں کہ ان کو سامنے کی چیزیں بھی دکھائی نہیں دیتیں۔ اور اگر ان کی آنکھوں میں انگلی ڈال کر بھی دکھایا جاتا ہے کہ لو دیکھو۔ جب بھی وہ اس حقیقت سے انکار کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اُسے انتہا پسندی کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ؎

ہیں طرفہ کشاکش میں گھرا ہوں معبود — مکار حواس اور وہ بھی محدود
تو سامنے کھل کر بھی جو آ جائے کبھی — پھر بھی نہ یقیں آئے کہ تو ہے موجود

لیکن وہ کبھی کبھی اپنے طور پر بھی سوچتے ہیں اور تب خدا کے وجود کے سلسلے میں ان کے یہاں ایک طرح کے شک و شبہات جنم لینے لگتے ہیں اور پھر وہ اس بات کا بھی اقرار کرتے ہیں کہ جو خدا کے وجود کے قائل ہیں، وہی در اصل دانا ہیں۔ اور جو نادان ہیں، وہ خدا کے ہونے اور نہ ہونے کے چکر میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ؎

ہر فرد ہے خبر سے ملول و غم گیں — آزردہ و افسردہ و بیمار و حزیں
دانا کی زباں پر کہ خدا ہے موجود — ناداں اس فکر میں خدا ہے کہ نہیں

مذکورہ بالا رباعی سے اندازہ ہوتا ہے کہ خدا کے وجود اور عدم وجود کے سلسلے میں جوش کی فکر پختہ نہیں ہے اور اُن کا ذہن کسی ایک نقطے پر مرکوز نہ ہو کر مختلف نقطوں کے بیچ منڈلاتا ہے۔ کبھی وہ مذہبی خیالات کے حامل معلوم ہوتے ہیں تو کبھی الحاد کے قریب تر۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اُنہوں نے جس عہد میں آنکھیں کھولیں اور جس ماحول میں ان کی پرورش و پرداخت ہوئی وہ نہ تو خالص مذہبی تھا اور نہ ہی خالص لادینی۔ جوش نے اپنی سوانح عمری "یادوں کی برات" میں اپنے بچپن کے عہد و ماحول اور پھر گھر کا جو نقشہ کھینچا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں شک و شبہات نے اس زمانے میں جنم لیا اور وہ تشکیک کے شکار ہو گئے۔ پھر یہ کہ اُنہوں نے دو عظیم عالمی جنگوں کا زمانہ بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ان دونوں جنگوں سے ساری دنیا کے ساتھ ساتھ ہندوستان اور ہندوستانیوں پر جس طرح کے اثرات مرتب ہوئے اس سے اُنہوں نے براہِ راست اثر قبول کیا۔ یورپ و افریقہ میں جو صنعتی انقلابات آئے اُس نے ساری دنیا کی آنکھیں چکا چوند کر دیں۔ بہت سی نئی تحقیقات سامنے آئیں اور سائنس و ٹکنالوجی کی روشنی میں چند ایسی کتابیں لکھی گئیں جن کا تعلق روحانیت کے خلاف اور مادیت سے زیادہ سے زیادہ تھا اور اس وقت کے جو حالات تھے۔ اس لحاظ سے صحیح بھی تھا اور اس وقت جو نوجوان طالب علم تھے، ان کی ایک کثیر تعداد اس نظریے کی حامی تھی۔ ان نظریات نے اسلام اور دوسرے مذہبی نظریات کو باطل قرار دیا تھا اور مذہب کے علمبردار کو جاہلِ مطلق۔ نتیجے کے طور پر یونیورسٹی و کالج کے طلب بھی راہِ راست سے بھٹک گئے اور ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی مذہب و ملت پر چوٹیں کرنے لگے۔ ان کے اندر خدا بیزاری کی لہر دوڑ گئی اور وہ ان فرسودہ لیکن بظاہر تابناک اور روشن شاہراہوں پر چلنے میں فخر محسوس کرنے لگے اور اس "گمانِ بد" کو یقین سے بہتر قرار دینے لگے ؎

جودت کا گہر مبیں سے بہتر   حکمت کی حلاوت انگبیں سے بہتر
عالم کا زیاں ہو گمانِ بد بھی   جاہل کی عطا کردہ یقیں سے بہتر

میری نظروں میں ہے وہ فردا کا نظام   جن سے گر جائیں گے مذاہب کے اصنام
جو دین کر رہا ہے پیدا اے دوست   ہو گا وہ ماورائے کفر و اسلام

خود بیں و خود آگاہ کیا ہے کس نے   ایمان کا بد خواہ کیا ہے کس نے
انسان کو شیطان نے کیا ہے گمراہ   شیطان کو گمراہ کیا ہے کس نے

تعلیم کو آنکھوں پہ لیا خوب کیا   تحقیق کا ساگر نہ پیا خوب کیا
اوہام و اساطیر کے پا پہ رکھ کر   افکار کا سر موڑ دیا خوب کیا

مذہب پر اس قسم کے اعتراضات ان لوگوں کی طرف سے یقیناً صحیح ہو سکتے ہیں جو نہیں جانتے کہ فکر و فہم اور عقل و شعور کس چڑیا کا نام ہے۔ لیکن جوش اور ان کے پیر و مرید جو فکر و فہم اور عقل و شعور کی کسوٹی پر دنیا کی تمام چیزوں کو پرکھنے کے لیے آمادہ ہوئے لوگ اس قسم کی لایعنی باتیں کریں تو اسے سوائے جہالت کے اور کیا کہا جا سکتا ہے، علم سے وہ مالا مال، فکر ان کی بالیدہ، فہم ان کی بھرپور، عقل و شعور کے وہ پختہ، تحقیق و جستجو کے وہ خواہاں اور پھر اتنی غیر ذمہ دارانہ گفتگو! علم، تحقیق اور عقل و شعور کے متعلق چند رباعیاں ملاحظہ ہوں ؎

تحقیق کے شعلوں کو ہوا دیتا ہے   ہر موڑ نئی راہ دکھا دیتا ہے
اُف! علم ہے وہ غذائے حیرت انگیز   جو ذہن کی بھوک اور بڑھا دیتا ہے

ہر لرزشِ مے تپائے جاتی ہے مجھے   ہر موجِ نفس جلائے جاتی ہے مجھے
پی لینے سے بجھتی نہیں تحقیق کی پیاس   یہ علم کی بھوک کھائے جاتی ہے مجھے

تحقیق کی لو تپائے جاتی ہے مجھے   تفتیش کی دھن گھلائے جاتی ہے مجھے
پینے سے بھی بجھتی نہیں افکار کی پیاس   یہ علم کی بھوک کھائے جاتی ہے مجھے

(مذکورہ دونوں رباعیوں میں تکرارِ خیال ہے)

اتنا جینا اور نہ مرنا مشکل   جتنا کہ ہے فکر کا نکھرنا مشکل
اُف! علم وہ خوں خوار غذا ہے جس کا   کھانا آسان ہضم کرنا مشکل

اگر دیکھا جائے تو جوش خود اپنے متعین کردہ اصولوں پر بھی پورے نہیں اترتے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ جوش کی فکر ساری عمر نہ نکھر سکی۔ ؎

علت کا، نہ معلول و قصص کا منکر   حاشا، نہ خبر، نہ مبتدا کا منکر
اوہام نے جس بت کو بنایا ہے خدا   الحاد ہے صرف اس خدا کا منکر

مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ الحاد کی وکالت کرنے کی ضرورت ہی کیوں پیش آئی۔ وہ الحاد کی جگہ کوئی دوسرا لفظ بھی تو تلاش کر سکتے تھے۔ لیکن وہ اپنی اصلیت پر بہرحال قائم رہے۔ تشکیک کے شکار تو علامہ جمیل مظہری بھی تھے، بلکہ سچی بات تو یہ ہے علامہ جمیل مظہری کی شاعری کا بنیادی وصف تشکیک ہی ہے۔ لیکن جوش نے جس فکر کو بھونڈے انداز میں پیش کیا ہے، اسے جمیل نے صرف ایک شعر میں جس خوبصورت پیکر میں ڈھالا ہے وہ قابلِ داد ہے۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں ؎

جھگڑے مرے سارے ہیں جمیلؔ اپنے خدا سے
منکر میں ائمہ کا نہ منکر ہوں نبیؐ کا

خدا سے جھگڑا دراصل عابد و معبود اور عاشق و معشوق کا جھگڑا ہے۔ اس جھگڑے میں محبت بھی ہے اور یگانگت بھی اور قربت کا احساس بھی۔ یہاں الحاد و کفر کی باتیں نہیں ہیں۔ اس کے برعکس جوش کے یہاں جن اوہام سے نفرت اور بیزاری جھلکتی ہے انہی اوہام کے شکار وہ خود بھی نظر آتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگ صحیح راہ کا تعین نہیں کر سکتے۔ اسی لیے جوش کے خیالات مذبذب سے معلوم ہوتے ہیں۔ جو کبھی کچھ ہوتی ہے اور کبھی کچھ۔ مثال کے طور پر یہ چند رباعیاں پیشِ خدمت ہیں:

حبِ نوعِ بشر ہے میرا ایمان   ہر چیرے کا زشت و خوب میرا قرآن
اللہ کو آغوش میں پایا میں نے   جیسے ہی میرے قریب آیا انسان

ہر سانس میں گردوں سے پیام آتے ہیں   ہر آن چھلکتے ہوئے جام آتے ہیں
بندوں کو جو اک بار لگاتا ہوں گلے   اللہ کے سو بار سلام آتے ہیں

میں نے نہ کسی کا سر پہ احسان لیا   رازِ کونین خود بخود جان لیا
انسان کا عرفان ہوا جب حاصل   اللہ کو اک آن میں پہچان لیا

خود غور کر اے مجتہدِ گوشہ نشیں   تو ہے کہ یہ پند حاملِ مقصدِ دیں
تجھ میں عملِ خیر نہیں ایماں ہے   مجھ میں عمل ہے ایمان نہیں

جوش نے ان رباعیوں میں جن باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ اپنے اندر جزوی صداقتیں ضرور رکھتی ہیں۔ لیکن جزو بہرحال جزو ہوتا ہے کُل نہیں۔ اور جب کبھی انہیں اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ شاید ان کی فکر درست نہیں ہے اور عقل غریب ہے تو وہ اپنے قول پر نظرثانی کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ خیال مانع ہے کہ اپنے سابقہ قول کی تردید کریں تو کس منھ سے۔ مگر کھل کر نہیں کر سکتے تو کیا ہوا۔ ڈھکے چھپے انداز میں گول مول باتیں کرتے ہیں اور اپنے دل کی بھڑاس یوں نکالتے ہیں ؎

وابستۂ آسماں نہ پابندِ زمیں   انکار، نہ اقرار، نہ عرفان و یقیں
اے عقلِ غریب! یہ سیاحت تا چند   اب تیرا کہیں وطن بنے گا کہ نہیں

کھلتا نہیں بن ہوں کہ چمن ہوں اے جوشؔ
رہزن ہوں کہ طرفہ راہزن ہوں اے جوشؔ
کل تک جو مرا وطن تھا شہرِ ایماں
اس شہر سے میں جلا وطن ہوں اے جوشؔ

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ اپنے وطن "شہرِ ایماں" سے جلا وطن کیوں کیے گئے اور یہ اُن کو جلا وطن کرنے والا کون ہے؟ میری ناچیز رائے میں اس کی ذمّہ دار ان کی "عقلِ غریب" ہے جس نے ان کی فکر کو نہ صرف یہ کہ جلا وطن کر دیا بلکہ خانہ بدوشی پر بھی مجبور کر دیا۔ اور وہ انتشارِ خیال کے شکار ہو کر رہ گئے۔

جوشؔ کی شاعری سے مزدوروں، کسانوں اور آزادی کے متوالوں کو بڑی تقویت ملی اور جوشؔ شاعرِ انقلاب کہلائے۔ مگر جوشؔ صرف شاعرِ انقلاب ہی نہ تھے، بلکہ وہ بنیادی طور پر رومان پسند تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے یہاں جلال و جمال کا ایک خوبصورت اور حسین امتزاج ملتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ شاعرِ انقلاب ہی کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہوئے۔ جوشؔ نے جہاں بہت سی رومانی نظمیں کہی ہیں، وہیں بہت سی رومانی رباعیاں بھی اُن کے یہاں مل جاتی ہیں۔ مگر ان کے جمال میں وہ اثر آفرینی نہیں ہے جو دوسرے رومانی شعراء کے یہاں دیکھنے کو ملتی ہے۔ لیکن جوشؔ مجرد کو مجسّم اور آواز کو آنکھوں سے دکھا دینے کا فن خوب جانتے ہیں ؎

اشعار کو زرتار قبا دیتا ہوں
افکار کو آہنگ بنا دیتا ہوں
الفاظ کو بخشتا ہوں شکلِ اصنام
کردار کو آنکھوں سے دکھا دیتا ہوں

اور جب وہ محبوب کے سراپا کا جائزہ لیتے ہیں تو اس قسم کی رباعیاں کہتے ہیں ؎

نادیدہ بہاروں کا نکھرا مکھڑا
بیلے کی کلی، صبح کا تارا مکھڑا
جنت کے وجود پر ہے مہرِ تصدیق
حوروں کا ثبوت ہے تمہارا مکھڑا

کس درجہ اُجلی ہیں تمہاری آنکھیں
اُجلی اُجلی سی بھاری بھاری آنکھیں
بھٹکی بھٹکی سی ہیں نوکیلی نظریں
گونگی گونگی سی ہیں کنواری آنکھیں

الماس کی کان ہیں تمہاری آنکھیں
شعلوں کی زبان ہیں تمہاری آنکھیں
ارجن کی کمان ہیں تمہاری آنکھیں
برچھوں کی دکان ہیں تمہاری آنکھیں

آنکھیں کھلتی ابھی جو وہ جانِ بہار
ڈوری سے اُبل پڑی جانِ بہار
پوروں کے چٹخنے سے ترانے اُبھرے
انگڑائی کے ٹوٹنے سے نکلی جھنکار

ان مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ جوشؔ کو زبان و بیان پر کتنی قدرت حاصل تھی اور ان کا تخیل کتنا بلند پرواز تھا۔ نہ صرف یہ کہ بلند پرواز بلکہ خیال و آہنگ کو نئی تازگی و رعنائی بخشنے میں جوشؔ کا جواب نہیں تھا۔

وہ الفاظ کے جادوگر تھے اور الفاظ کی جادوگری ہی دراصل شاعری کی بنیاد ہے۔ انہوں نے تخیل و ادراک کو جس طرح رنگینی و ندرت اور پختگی و وسعت بخشی ہے اس کا ذکر بجا طور پر وہ اس رباعی میں کرتے ہیں۔ ؎

تخیل کو رنگینی و ندرت بخشی
ادراک کو پختگی و وسعت بخشی
جس کو بھی چھوا اپنے نفس نے اس کو
جدت، حرکت، حیات، ہمّت بخشی

بات سے بات پیدا کرنے کا فن بھی کوئی ان سے سیکھے۔ باتیں ایسی کہ کوئی بات نہ ہو پھر بھی رائی کو پہاڑ اور قطرہ کو قلزم بنانے کے ہنر سے بھی وہ خوب واقف تھے۔ ؎

اک برگ کو گلزار بنا لیتے ہیں
اک بول کو جھنکار بنا لیتے ہیں
مل جائے جو اک بوند بھی ہم کو تو اسے
اک قلزمِ زخّار بنا لیتے ہیں

الفاظ دراصل علامت ہوتے ہیں، جن کے ذریعے ہم اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرتے ہیں اور اس سے ترسیل و ابلاغ کا کام لیتے ہیں۔ لیکن یہ ترسیل و ابلاغ کی بہرحال مکمل شکل نہیں ہے۔ کیوں کہ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے لیے مناسب الفاظ نہیں ملتے۔ اور ہم انہیں ظاہر کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ ہم اسے عجزِ بیان کہہ سکتے ہیں۔ اور یہ عجزِ بیان کسی کے اندر کم اور کسی کے اندر زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن اس کے شکار بہرحال ہوتے سبھی ہیں۔ چنانچہ جوشؔ جیسا الفاظ کا جادوگر اور قادر الکلام شاعر بھی اس بات کو محسوس کرتا ہے کہ بہت سی فکر ایسی ہے جو الفاظ میں نہ ڈھل سکی۔ اور ظاہر ہے کہ جب کسی فکر کا اظہار ناممکن ہو تو وہ سینے میں کانٹے کی طرح چبھنے لگتی ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

کس حد کی اندھیری ہے یہاں رات نہ پوچھ
کیونکر یہ برس رہے ہیں آفات نہ پوچھ
الفاظ کی قلّت سے مرے سینے میں
کس پیچ کے چبھتے ہیں خیالات نہ پوچھ

پھولوں کی مہک خار بنی جاتی ہے
تتلی کی دھمک دھار بنی جاتی ہے
الفاظ میں ڈھل سکی نہ جو فکرِ جمیل
سینے میں وہ تلوار بنی جاتی ہے

عورت جس کے بغیر تخلیقِ کائنات نامکمل ہے۔ اسے لوگ اپنی کم عقلی، نادانی اور احساسِ برتری (جو احساسِ کمتری کی دوسری شکل ہے) کی وجہ سے حقیر و ذلیل اور کمتریں سمجھتے ہیں۔ رسولِ اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے عرب قبیلے کے لوگ اپنی لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ درگور کر دیا کرتے تھے۔ لیکن مذہبِ اسلام نے عورتوں کی حیثیت و اہمیت کو سب سے پہلے تسلیم کیا اور واضح کیا کہ عورت صرف بچے پیدا کرنے کی مشین نہیں ہے اور نہ ہی گھر کی نوکرانی ہے بلکہ اس کا مرتبہ مردوں کے مقابلے میں زیادہ بلند و برتر ہے۔ عورت ماں بھی ہے اور بہن بھی، بیوی بھی ہے اور بیٹی بھی اور تہذیب و اخلاق کی ضامن بھی۔ وہ اپنے بچوں کی صحیح پرورش و پرداخت کر کے اسے

اس کے حقوق و فرائض سے روشناس کراتی ہے۔ اس طرح اگر دیکھا جائے تو نظامِ عالم کی باگ ڈور دراصل عورتوں ہی کے ہاتھوں سے ہوتی ہے۔ جوش کو بھی عورت کی اس حیثیت کا احساس ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

عورت دین و مزاج و تغیر و قوام ‏ ‏ ‏ نطق و شعور و تہذیب و خرام
جس ہاتھ میں پالنے کی ڈوری ہے ندیم ‏ ‏ ‏ اس ہاتھ میں ہے نظامِ عالم کی لگام

انسان کے نزدیک وقت کی بڑی اہمیت ہے جو شخص وقت کی قدر نہیں کرتا ہے وہ دنیا میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اگر انسان کچھ کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے لازم ہے کہ وہ وقت کے دوش بدوش چلے۔ وقت کے ساتھ چلنے میں ہی کسی فرد یا قوم کی فلاح کا راز مضمر ہے اور انسان اگر وقت کا ساتھ نہیں دیتا ہے تو وقت اسے کبھی معاف نہیں کرتا۔ اس لیے کہ وقت کبھی کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ اس مضمون کو مختلف شعرا نے قلمبند کیا ہے۔ اس سلسلے میں اردو کا وہ مشہور مصرعہ زبان زدِ عام ہے۔ ؏

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

جوش نے بھی اسے اپنی ایک رباعی میں پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

اک آن کہیں وقت ٹھہرتا ہی نہیں ‏ ‏ ‏ خالی ہو کر دقیقہ بھرتا ہی نہیں
وہ لمحہ جو برباد کیا جاتا ہے ‏ ‏ ‏ انسان کو کبھی معاف کرتا ہی نہیں

مگر اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسان کے اندر جہاں وقت کے ساتھ چلنے کی صلاحیت ہونی چاہیے وہیں یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے اندر وقت کو اپنی مرضی کے مطابق موڑنے کی بھی صلاحیت ہو اور جوش اس صلاحیت سے محروم تھے۔ وہ "چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی" کے قائل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ساری عمر سراب کے پیچھے بھاگتے رہے۔ حقیقت کی بجائے خواب و خیال کی دنیا میں مگن رہے اور نتیجے کے طور پر صحیح سمت کا تعین نہ کر سکے۔ ان کی اسی بے سمتی نے ان کی شاعری کو نقصان پہنچایا ہے۔

اردو میں ایک مثل مشہور ہے کہ "رسی جل گئی لیکن بل نہ گیا" جوش نے ایک رباعی میں اس مثل کا استعمال کیا ہے اور اس کا ہدف اپنی ذات کو بنایا ہے۔ بظاہر یہ بات بہت معمولی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اگر بغور دیکھا جائے تو اس معمولی سی رباعی میں نہ جانے کتنے تیر و نشتر چھپے ہوئے ہیں۔ ؎

یہ حضرتِ دل ہیں کہ سنبھلتے ہی نہیں ‏ ‏ ‏ پیری ہے مگر روش بدلتے ہی نہیں
رسی تو تمام جل چکی ہے لیکن ‏ ‏ ‏ کمبخت کے بل ہیں کہ نکلتے ہی نہیں

اور جوش کے قارئین یہ جانتے ہیں کہ وہ اپنی روش پر آخیر وقت تک قائم رہے اور اپنے تمام کس بل کے ساتھ اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔

؏ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

جوش کی ان رباعیوں کے مطالعے سے ان کے عقائد و نظریات اور فکر و فلسفے پر بھرپور روشنی پڑتی ہے اور یہ واضح ہوتا ہے کہ جوش کی یہ رباعیاں اردو ادب کا عظیم سرمایہ ہیں۔ ●●

تسنیم فاروقی

یاد بنام جوش

سخن کی خدمت رسمی تو سب نے کی ہے مگر
غرض ہے رامش و آہنگ کے تعلق سے
نشاط لفظ سے فرہنگ کے تعلق سے
جو فکر و صوت کی وادی میں شاہکار رہا
ہمیشہ لشکرِ فن کا جو شہسوار رہا
جو تھا مصورِ نغمہ
وہ شاعرِ اعظم
شکوہِ فن تھا کہ شاہوں کو بھی نصیب نہ ہو
وہ رنگ زارِ نظامِ کلام کا سنگار
وہ شانِ رزم کہ چلتی ہوئی کوئی تلوار
وہ رکھ رکھاؤ وہ ٹھاٹ
فرازِ علم سے اک آبشار بہتا ہوا
وہ آبشار کہ ہر بوند جس کی گنگ و جمن تھی
بہت شراب نے بڑھ بڑھ کے سر اٹھایا مگر
اس ایک رند نے صہبا کو تربیت بخشی
صراحی و خم و مینا و جام و پیمانہ تمام عمر حضوری میں سجدہ ریز رہے
تھے ہاتھ باندھے کھڑے سب غلام کی مانند
تھی لفظ لفظ کو حسرت کہ زندگی مل جائے
جو اس صدی کا مورخ لکھے تو یوں لکھے
دھنی قلم کا اٹھا رختِ انقلاب اٹھا
زمین کی گود سے گویا کہ آفتاب اٹھا
قلم کی آنکھ کا آنسو تھا پی گیا کاغذ
بنام جوش ہے یہ میری جراتِ اظہار
عظیم لوگ بہت کم ہوئے ہیں دنیا میں
بہت عظیم تھا وہ

تلسی داس مارگ، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۳

ڈاکٹر ارتضیٰ کریم

جوش کی خاکہ نگاری

اردو میں جن اصناف سے عدم توجہی برتی گئی ہے، ان میں خاکہ نگاری بھی شامل ہے۔ کہنے کو اردو میں بہت سے خاکہ نگار مل جائیں گے پر حقیقت یہ ہے کہ معیاری خاکہ نگاروں کی تعداد ایک ہاتھ کی انگلیوں سے زیادہ ہرگز نہیں ہے۔ بعض تو ہم شوکت تھانوی کو بھی خاکہ نگار ہی تصور کرتے ہیں، جب کہ خاکہ نگاری ان کے بس کی بات نہیں ہے۔

خاکہ نگاری جس کی بے ضابطہ ابتدا محمد حسین آزاد کی "آبِ حیات" سے ہوتی ہے، بے ضابطہ اس لیے کہ وہ تذکرہ لکھ رہے تھے۔ خاکہ نگاری ان کا مقصد نہ تھا۔ اس کا گمان تو بعد کے پڑھنے والوں کو اس وقت ہوا جب وہ اس تذکرے کو پڑھتے ہوئے بعض شخصیتوں سے خود کو قریب محسوس کرنے لگے اور ان کی شکل و صورت کی دھندلی ہی سہی ایک تصویر سامنے آنے لگی تو انہیں لگا کہ آزاد میں خاکہ نگاری کی بھی صلاحیت تھی ـــــ ایسی صورت میں آزاد سے لے کر فرحت اللہ بیگ تک انشا، خواجہ حسن نظامی، مولوی عبدالحق، عبدالماجد دریا بادی، رشید احمد صدیقی، عبدالمجید سالک، مالک رام، اشرف صبوحی، شاہد احمد دہلوی، چراغ حسن حسرت، شوکت تھانوی، عصمت چغتائی، منٹو اور محمد طفیل تک۔ بعد ازاں مشتاق یوسفی سے چل کر مجتبیٰ حسین، یوسف ناظم، شفیقہ فرحت تک آ گئے۔ کیا ان میں سبھی کامیاب خاکہ نگار رہیں؟ علاوہ ازیں ان کی تمام تحریروں کو آپ کامل خاکہ نگاری کا نمونہ کہہ سکتے ہیں؟ مزاح یا ہجو یا مدح سے لحد تک کے ذکر کو خاکہ نگاری تو نہیں کہا جا سکتا۔

خاکہ نگاری جسے انگریزی میں Sketches کہا جاتا ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ اس میں شخصیت کو یوں سامنے لایا جائے کہ اس کے اوصاف و کمال کچھ اس طرح سامنے آئیں کہ پڑھنے والے پر وہ شخصیت پوری طرح روشن ہو سکے۔ یقیناً خاکہ نگار اس ضمن میں اپنی نکتہ سنجی، حسِ مزاح، تیز مشاہدہ اور دلچسپ پیرایۂ اظہار سے خاطر خواہ کام لے سکتا ہے۔ شخصیت کی بعض کمزوریوں کو بھی سامنے لا سکتا ہے۔ مگر کسی شخصیت کو مسخ کرنا یا اسے اس طرح پیش کرنا کہ اس کی برائیاں ہی زیادہ سامنے آئیں یا اس کے برعکس انسان کو فرشتے کی شکل میں پیش کرنا ـــــ خاکہ نگاری کی شریعت میں کسی بھی طرح جائز نہیں۔ بعض خاکہ نگار یہ بھی کرتے ہیں کہ خاکے میں اپنی شخصیت کو زیادہ نمایاں کرتے ہیں۔ یہ بھی خاکہ نگاری کا ایک بڑا عیب ہے۔ اردو کے بیشتر خاکوں کا یہی حال ہے۔

منٹو نے اپنے لکھے ہوئے خاکوں کے متعلق جو کچھ اظہارِ خیال کیا ہے اسے خاکہ نگاری کا معیار قرار دیا جا سکتا ہے:

> "میں ایسی دنیا پر، ایسے مہذب ملک پر، ایسے مہذب سماج پر ہزار لعنت بھیجتا ہوں، جہاں پر یہ اصول مروج ہو کہ مرنے کے بعد ہر شخص کا کردار اور تشخص لانڈری میں بھیج دیا جائے، جہاں سے وہ دھل دھلا کر آئے اور رحمۃ اللہ علیہ کی کھونٹی پر لٹکا دیا جائے۔
>
> میرے اصلاح خانے میں کوئی شانہ نہیں، کوئی شیمپو نہیں، کوئی گھونگھر پیدا کرنے والی مشین نہیں، میں بناؤ سنگھار کرنا نہیں جانتا۔ آغا حشر کی بھینگی آنکھ مجھ سے سیدھی نہیں ہو سکی ..... میرا جی کی ضلالت پر مجھ سے استری نہیں ہو سکی ....."

یعنی خاکہ نگار کا کام نہیں ہے کہ وہ شخصیت کو رحمۃ اللہ علیہ قسم کی چیز بنا کر پیش کرے بلکہ ایک شخصیت کو جس طرح آپ نے خلوت اور جلوت میں دیکھا ہے، جس طرح اسے پایا اور برتا ہے اس کی مرقع کشی اسی انداز میں ہونا چاہیے ورنہ خاکہ نگاری کا مقصد پورا نہیں ہوگا۔ اردو کے زیادہ تر خاکہ نگاروں نے یا تو اپنے خاکوں میں شخصیت کی تعریف کی ہے یا مزاح یا ہجو سے کام لیا ہے۔ اسی لیے خالص خاکے کی تعداد بھی تشفی بخش نہیں ہے۔

خاکہ نگاری کی ایسی غیر تشفی بخش اور موہوم سی روایت میں اگر جوش ملیح آبادی کو بھی شامل کر لیا جائے تو منظر نامے میں کوئی بہت بڑی تبدیلی نہیں آئے گی ـــ یوں بھی جوش ایک شاعر تھے، حضرت انیس سے آنکھیں چار کرنے والے شاعر۔ جوش کی بنیادی اور پہلی شناخت شاعری کی ہے۔ لیکن جوش نے نثر میں بھی کافی وقیع سرمایہ چھوڑا ہے، کم از کم "یادوں کی برات" بھی اپنی جسامت اور ضخامت کے ماسوا ادبی چاشنی اور اسلوب کی دلکشی کے باعث

شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

انہیں کامیاب نثر نگاروں کی صف میں کھڑا کرنے کے لیے کافی ہے۔ اپنی واردات حیات کو مرتب کرتے ہوئے انہوں نے بعض احباب اور بعض اشخاص کا بھی ذکر کیا ہے۔ خاطر نشان رہے کہ وہ یادوں کی برات مرتب کر رہے تھے۔ خاکہ نگاری یا مرقع نگاری ان کا مقصد ہرگز نہ تھا، جیسا کہ مولانا آزاد کا بھی نہ تھا، اس لئے جوش کی ان تحریروں سے خالص خاکہ نگاری کا تقاضہ کرنا سراسر زیادتی ہوگی۔ پھر ایک اور بات ذہن میں رہنی چاہیئے کہ جوش بار بار یہ یقین دلا رہے ہیں کہ ان کی یادداشت بے کار ہو چکی ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات وہ اپنا نام بھی بھول جاتے ہیں۔ لیکن جب ہم یادوں کی برات سے گزرتے ہیں تو یہ شعر بار بار دعائی صورت مچلتا ہے کہ ؎

یادِ ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

جوش کا حافظہ اتنا زبردست اور تیز ہے کہ اپنے ابتدائی دنوں کے اشعار ازبر ہیں اور تو اور شاہ دلگیر اکبر آبادی، مے میرزا شیر لکھنوی اور اپنے والد کے اشعار زبانی لکھتے جاتے ہیں۔ ایک ایسے حافظے کا شخص اگر یہ اقرار کرے کہ "میں کبھی قوی حافظے کا مالک نہیں رہا" تو مشکل سے ہی یقین کیا جا سکتا ہے۔ جوش کے حافظے کے سلسلے میں یہ تمہید اس لئے ضروری تھی کہ آئندہ سطور میں جوش کی خاکہ نگاری کو سمجھنے میں اس سے مدد ملے گی۔

یادوں کی برات ـــــ جہاں زبان و اسلوب کی لطافت اور شکوہ الفاظ کے باعث ہر خاص و عام کو پسند ہے وہیں اس کے مواد پر اور حقائق کی پیش کش پر زیادہ تر ارباب فکر و نظر معترض ہیں۔ لیکن یہ شکایت صرف جوش کی یادوں کی برات کے ساتھ مختص نہیں ہے بلکہ اردو کے زیادہ تر خود نوشت نگاروں نے حقیقت سے روگردانی کی ہے۔ غالباً انہیں بشری کمزوریوں کا احساس نہیں رہتا یا انہیں یہ یاد نہیں رہتا کہ اُن کے پاس ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو ان کے اعمال کا احتساب بھی رکھتے ہیں۔

شاعری میں مبالغے سے کام لیا جا سکتا ہے۔ اس کی شریعت میں یہ جائز ہے۔ ہر نثر میں خصوصاً غیر افسانوی نثر میں مبالغے کے بجائے حقیقت ہی اس کا طرۂ امتیاز ہو جاتی ہے۔ جوش کی شاعری میں یہاں سے وہاں تک حقیقت ہی حقیقت ہے۔ لیکن جب وہ نثر لکھتے ہیں تو مبالغہ آرائی اور لفظی بازیگری سے خوب کام لیتے ہیں۔ چنانچہ ان کی واقعہ نگاری مشکوک ہو جاتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے بہت سے قریبی دوستوں کا بہت ہی سرسری ذکر کیا ہے اور جہاں انہوں نے ضرورت محسوس کی ہے 'حکایت کو رنگین اور اپنے دل پسند بنایا ہے۔ معاصرین میں سے زیادہ تر کی شخصیت کو یا تو مسخ کیا ہے یا ان سے صرفِ نظر کر گئے ہیں۔ جہاں بڑی شخصیت کا ذکر ہے وہاں جوش کی شخصیت زیادہ Dominate کرتی نظر آتی ہے ـــــ مگر یہ سب کمزوریاں اوّل تو ان کی انشا پردازی کے باعث گوارا کرلی جاتی ہیں ـــــ دوم یہ کہ وہ خاکہ نہیں لکھ رہے تھے، خود نوشت رقم کر رہے تھے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ اس میں خاکہ نگاری کا لطف کم ہی ہی، مگر ملتا ہے۔

ہم اپنی آسانی کے لیے جوش کی شخصیت نگاری کو تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ جوش نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ پہلی شخصیتیں تو وہ ہیں جو ان کے خاندان سے متعلق ہیں مثلاً پردادا، دادا، باپ، ماں، بیٹی وغیرہ۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو ان کے نزدیک قابل ذکر احباب ہیں اور تیسری وہ ہستیاں ہیں جو ان کے زمانے میں موجود رہی ہیں اور جن کا ذکر جوش کے نزدیک ضروری تھا۔ جب ہم جوش کی ان تحریروں کا مطالعہ کرتے ہیں اور بالخصوص مرقع کشی کے حوالے سے ان کو پرکھتے ہیں تو بہت سی کمزوریاں نظر آتی ہیں۔ مثلاً انہوں نے اپنے خاکوں میں انصاف سے کام نہیں لیا ہے اور اکثر اشخاص کے ان پہلوؤں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے جنہیں "معائب" کہا جا سکتا ہے۔ ان کے زیادہ تر خاکوں میں آورد کی کیفیت ہے۔ "آمد" کا لطف نہیں ملتا۔ اظہارِ خیال میں تکلف اور تصنع سے زیادہ کام لیا گیا ہے اسی لئے رشید حسن خاں نے بھی کہا ہے کہ "بہت سی معلومات حاصل کرنے کے باوجود ہم جوش سے قریب نہیں ہو پاتے۔ پوری کتاب پڑھنے کے بعد محسوس یہی ہوتا ہے کہ شاعر ہم سے کچھ دور ایک بلند ٹیلے پر کھڑا ہے۔" علاوہ ازیں جوش کی شخصیت خود ہر خاکے میں بے جا نمایاں نظر آتی ہے۔ ہر خاکے کا پہلا اقتباس تقریباً یکسانیت رکھتا ہے۔ اس کے فوراً بعد جو عبارت شروع ہوتی ہے وہ اس تیور اور انداز کی ہرگز نہیں ہوتی۔ ایسا لگتا ہے کہ خاکے کے بیان پر ہی جوش کا زیادہ زور تھا۔ اس کے بعد محض عبارت آرائی کی گئی ہے۔

کمال یہ ہے کہ اپنے خاندان کے افراد پر انہوں نے بہت تفصیل سے لکھا ہے اور اس طرح بھی لکھا ہے کہ وہ شخصیتیں بڑی حد تک ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔ (اگرچہ ان میں بھی جوش کا اندازِ تحریر اس قدر دلچسپ نہیں خصوصاً خاکہ نگاری کے لئے جس لطافت، مزاح اور چاشنی کی ضرورت ہوتی ہے یا جو معروضیت درکار ہوتی ہے وہ مفقود ہے) مگر یہ وصف بتدریج قابلِ ذکر احباب" اور "چند عجیب ہستیاں" میں معدوم ہوتا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر خاکے حد درجہ مختصر ہیں اور ان میں شخصیت کا پوری طرح تعارف نہیں ہو پاتا۔ مثلاً کنور مہندر سنگھ بیدی سحر پر ان کی تحریر اس قدر مختصر اور تشنہ ہے کہ اسے خاکہ مشکل سے کہا جا سکتا ہے۔ اسی طرح سروجنی نائیڈو کے باب میں بھی اختصار سے کام لیا گیا ہے اور جتنا لکھا بھی ہے، اس میں خود جوش ہی جوش نظر آتے ہیں۔ سروجنی کا تو صرف سایہ ہے۔ اسی طرح فراق گورکھپوری، جواہر لال نہرو، مجاز یا فانی وغیرہ کے خاکوں میں بھی وہ مکمل رنگ نہ بھر سکے۔ البتہ ان خاکوں میں انہوں نے جس طرح اشخاص کا حلیہ بیان کیا ہے وہ ادب پارہ ہے۔ مثال کے طور پر جواہر لال نہرو کا حلیہ یوں پیش کرتے ہیں:-

"وہ اپنی موہنی صورت کی جاذبیت، اپنے رنگ کی طلاقت اپنی آنکھوں کی مروّت، اپنے لہجے کی مقدسیت، اپنے تکلم کی موسیقیت، اپنے تبسم کی حلاوت، اپنے خاندان کی وجاہت اپنے دل کی آفاق در آغوش وسعت، اپنے مزاج کی بے نظیر شرافت اور اپنے کردار کی بے مثال نجابت کے اعتبار سے ایک ایسے انسان تھے، جو اس کرۂ خاکی پر صدیوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔"

اسی طرح فراق کی شخصیت کو یوں نمایاں کرتے ہیں :

" مجموعۂ اضداد ، آمیزۂ بلور و فولاد ، گاہ نسیم بوستاں ، گاہ صرصر بیاباں ، گاہے شعر گاہ ، گاہے گم کردہ راہ ، گاہ شبنم برگ تاک ، گاہ شعلۂ جوالہ و بے باک ، گاہ یزداں بآغوش ، گاہ اہرمن بردوش ۔
رند قدح خوار ، گوہر شاہوار ، آسمان جوش بھیگی کے بدر ، انجمن آگہی کے صدر ، اولیائے ذہانت کے قافلہ سالار ، اقلیم ژرف نگاہی کے تاجدار ، جودت پناہ ، نقاد نگاہ ، مہبط جبریل ، شاعر بزرگ و جلیل ۔"

کسی نے کہا ہے کہ جوش کے آگے الفاظ و تراکیب ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں ۔ اوپر کی دو مثالوں سے یہ بات اور واضح ہو جاتی ہے ۔ دوسری بات یہ کہ اگرچہ ان خاکوں کا آغاز یکسانیت رکھتا ہے پر یہی جوش کا کمال فن بھی ہے کہ ایک اقتباس میں کم و بیش ساری بات کہہ ڈالتے ہیں ۔ کاش وہ اس تیور کو آغاز تا اختتام برقرار رکھتے تو شاید یہ خاکے بہت زیادہ کامیاب ہو جاتے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ جہاں انہوں نے اپنے خاندان کے افراد کی شخصیت نگاری کی ہے وہاں زیادہ کامیاب نظر آتے ہیں ۔ اپنے دادا کے باب میں لکھتے ہیں : -

" ان کا جسم بے حد گٹھا ہوا تھا ۔ کلائیاں دو دو آدمیوں کی کلائیوں سے زیادہ چوڑی تھیں اور آواز اس قدر بھاری تھی کہ سننے والے کے ذہنوں کے ٹانکے ٹوٹ جائیں ۔"

آخری جملے کا کوئی جواب نہیں ہے ۔ ایسی بھرپور تصویر کشی خال خال ملتی ہے ۔ ایک اور مقام پر جہاں عالمگیر قدر کے دادا جان کی بات ہو رہی ہے ان کے الفاظ دیکھئے :

" وہ صبح و شام ایک وقت معین پر کوٹھے کی بالائی منزل سے اتر کر ایسے وقار کے ساتھ حویلی میں جاتے تھے کہ مجھے اپنے دادا کی سلطان خرامی یاد آجاتی تھی ـــــ"

اس جملے میں " سلطان خرامی " سے جو لطف پیدا ہوتا ہے وہ جوش کا ہی حصہ ہے ۔

اوپر کہیں ذکر آچکا ہے کہ جوش نے بعض اصحاب اور احباب کا ذکر نہایت ہی سرسری طور پر کیا ہے اور اکثر کی پیش کش میں مبالغے سے کام لیا ہے ۔ اس ضمن میں ساغر نظامی کا نام لیا جا سکتا ہے ۔ حالانکہ جوش اور ساغر کا بہت دیر اور دور تک ساتھ رہا ہے ۔ ایک آدھ جگہ ذکر آیا بھی ہے تو ساغر کی غلط تصویر بنائی گئی ہے ۔ ایسی باتوں سے خود جوش کا بیان مشتبہ ہوتا ہے ۔ اسی لئے ڈاکٹر خلیق انجم نے ایک جگہ لکھا ہے کہ :-

" جوش صاحب نے ' یادوں کی برات ' میں ایک دو جگہ اور ساغر صاحب کا ذکر کرکے انہیں ذلیل کرنے کی کوشش کی ہے فراق اور مجاز کے حوالے دے کر ثابت کیا ہے ۔ ساغر صاحب بہت کم درجے کے شاعر تھے ..... دلی میں بسمل سعیدی مرحوم اور جوش صاحب کے بہت گہرے مراسم تھے ۔ بسمل صاحب غزل گو تھے ۔ زبان پر غیر معمولی قدرت تھی ۔ بسمل صاحب کے ایک شاگرد اور ہمارے زمانے کے ایک مشہور شاعر مخمور سعیدی صاحب کا بیان ہے کہ جوش صاحب جب تازہ کلام کہتے تو بسمل صاحب کو سنا لیتے اور اگر بسمل صاحب زبان و بیان کے سلسلے میں کوئی مشورہ دیتے تو جوش صاحب سنجیدگی سے غور کرتے ۔ انہی بسمل صاحب کا " یادوں کی برات " میں دو جگہ ذکر کیا ہے ۔ ایک جگہ ان کا ایک شعر نقل کیا ہے اور ایک جگہ صرف اتنا لکھا ہے : " کہاں ہے میرا بسمل سعیدی "

ایسی کمزوریوں نے جوش صاحب کی مرقع نگاری کو نقصان پہنچایا ہے ورنہ ان کے پاس زبان کا جیسا اور جتنا بڑا ذخیرہ تھا جس طرح وہ مطالب کے اظہار پر غیر معمولی قدرت رکھتے تھے جس قدر خوبصورت ، سلیس اور بامحاورہ نثر لکھنے میں ان کو ملکہ حاصل تھا ، اس سے بعید نہ تھا کہ وہ اچھے خاکہ نویس نہ ہوتے لیکن ان کی بے جا انانیت اور خواہ مخواہ اپنی شخصیت کے Projection نے بعض حقائق کو بھی فسانہ کا حصہ بنا دیا ہے ۔ نثار احمد فاروقی نے معیاری خاکہ نگاری کے متعلق لکھا ہے کہ : " اچھے اسکیچ کی تعریف یہی ہے کہ بعض گوشوں کی نقاب کشائی ایسی ماہرانہ نفاست کے ساتھ کی جائے کہ اس شخصیت کا خاص تاثر پڑھنے والے کے ذہن میں خود بخود پیدا ہو ۔ اچھا خاکہ وہی ہے جس میں کسی انسان کے کردار اور افکار دونوں کی جھلک ہو ۔ خاکہ پڑھنے کے بعد اس کی صورت ، اس کی سیرت ، اس کا مزاج ، اس کے ذہن کی افتاد اس کا زاویۂ فکر ، اس کی خوبیاں اور خامیاں سب کی نظروں کے سامنے آجائیں ..... خاکہ ایک ایسی صنف ہے جس میں رو رعایت ہو یا مبالغہ اور مدح سرائی ہو تو پھر وہ خاکہ نہیں رہتا ۔"

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جوش کی تحریروں کو " معیاری خاکہ " نہیں کہا جا سکتا ۔ اگر ان خاکوں کو فرحت اللہ بیگ یا رشید احمد صدیقی یا دوسرے خاکہ نگاروں کے خاکوں کے ساتھ پڑھئے تو چاندی اور سونے کا فرق صاف نظر آتا ہے ۔ مثلاً " نذیر احمد کی کہانی " کے مطالعے سے نذیر احمد کی پوری شخصیت ہمارے سامنے آجاتی ہے ۔ اس ضمن میں ان کا مختصر خاکہ جو وحیدالدین سلیم پر ہے وہ بھی کافی دلچسپ ہے ۔ اگرچہ وحیدالدین سلیم پر جوش نے بھی لکھا ہے مگر ایک آنچ کی کمی کا احساس ہوتا ہے ۔ اسی طرح آغا حیدر حسن دہلوی کے خاکے " پس پردہ " کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئے تھے ۔ اس میں جہاں اور بہت سی شخصیتوں کے خاکے ہیں ، وہیں سروجنی نائیڈو پر بھی ایک خاکہ ہے ۔ یہاں مقابلہ مقصود نہیں ہے صرف اچھے خاکے کی مثال پیش کرنی ہے ۔ اس لئے آغا حیدر حسن دہلوی اور جوش کے لکھے ہوئے خاکے جو سروجنی نائیڈو سے متعلق ہیں ۔ ان کا ایک ایک اقتباس پیش کرتا ہوں تاکہ میرے خیال کو تقویت ملے اور جوش کی خاکہ نگاری کا انداز بھی سامنے آسکے ۔ پہلے آغا حیدر حسن دہلوی کا لکھا ہوا خاکہ :

" اب جلسے کی جان ، روح رواں سروجنی کی بابت سنو ۔ ٹھگنا ٹھگنا بوٹا سا قد ، گول گول گدرایا ہوا ڈیل ، کھلتی ہوئی چمپئی رنگت ، کتابی چہرہ ، کھڑا کھڑا نقشہ ..... خوب خوب گہری

گہری کالی کالی جٹی بھنویں، جبٹ کے اوپر چھوٹا سا گزب گہرا سرخ کسوم کا ٹیکہ، بڑی بڑی نرگسی آنکھیں، کچھ جھکی جھکی سی، دیکھنے میں کمزور مگر چلنے اور حرکت کرنے میں ہوا سے باتیں کریں...... یہ دیکھو لوکہ شہر شہر، ملک ملک اکیلی پڑی پھرتی ہیں۔ ہزاروں لاکھوں مردوں میں اٹھتی بیٹھتی ہیں۔ چاہیے تھا کہ دیدے کا پانی ڈھل جاتا، مگر نہیں! آنکھوں میں وہ حیا ہے کہ بعض بے حیا مردوں کی طرف اٹھتے ہی ان کو بھی حیادار بنا دیتی ہے......!!

اس پوری عبارت سے سروجنی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور ان کی مقبولیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور وقار کا بھی۔ خاکہ نگاری بھی کہیں نظر نہیں آتا۔ اس کے برعکس جوش کی تحریر دیکھیے:۔

"بادۂ شاعری سے سرشار، گروہ شعرا کی غم گسار، آزادی کی شیدائی، محبت کی شہنائی، لہجے میں ارغنوں، باتوں میں افسوں، میدانِ جنگ میں جھانسی کی رانی، ایوانِ امن میں قرۃ العین ثانی، تقریر میں نغمۂ آبِ حیواں، آواز میں جمالِ ماہِ کنعاں...... ان کے گلے میں رگیں نہیں سارنگی کے کھنکتے ہوئے تار تھے۔ آج تک یاد ہے مجھ کو وہ رات، جب میں نے ان کو اپنی نظم "انگیٹھی" سنائی تھی اور وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگی تھیں۔

انہوں نے میری اس نظم اور اسی کے ساتھ میری اور بھی تیس چالیس نظموں کا انگریزی میں نہایت اچھا ترجمہ کیا تھا...... ان کی یوپی کی گورنری کے زمانے میں، ایک بار میں لکھنؤ گیا تھا......"

یہ "میں" اس طرح جوش کے لکھے خاکوں میں ہر جگہ سر اٹھائے پھرتا ہے کہ اصل شخصیت جس پر خاکہ لکھا جا رہا ہے، ابھر ہی نہیں پاتی اور یہ بہت بڑا عیب ہے۔

ان دونوں اقتباسات کی طوالت کا مجھے احساس ہے، مگر مثالوں کے بغیر اپنی بات واضح بھی نہیں ہو سکتی تھی نیز جوش کی شخصیت نگاری، مرقع نگاری یا خاکہ نگاری کو ٹھیک سے سمجھنا بھی مشکل تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جوش کی ان تحریروں کو ان معنوں میں خاکہ نگاری کا عنوان نہیں دیا جا سکتا۔ جن معنوں میں فرحت اللہ بیگ، آغا حیدر حسن دہلوی، عصمت چغتائی یا رشید احمد صدیقی کے خاکوں کو۔ خود جوش نے بھی کہیں ایسا دعویٰ نہیں کیا ہے۔ اسی لیے رشید حسن خاں کی اس رائے سے اتفاق کرنے کو جی چاہتا ہے کہ

"لکھنے والے کا یہ مقصود ہی نہیں کہ وہ پورا آدمی جیسا کہ بیان کرے یا یہ کہ مکمل تصویر بنائے اور مرقع بنائے؟ اس نے خاکوں پر کوئی کتاب نہیں لکھی۔ یہ دعویٰ بھی نہیں کیا کہ یہ قدِ آدم تصویریں ہیں...... اس نگار خانے میں جواہر لال نہرو، سروجنی نائیڈو اور کنور مہندر سنگھ بیدی جیسے لوگ بھی ہیں جن کی شرافت اور وضع داری کی دل کھول کر داد دی گئی ہے۔ اس میں اثر لکھنوی، فراق گورکھپوری، مانی جائسی اور فانی بدایونی جیسے شاعر بھی ہیں، جن کے وہی رُخ دکھائے گئے ہیں جو مضحک ہیں۔ یا جن کے مقابلے میں لکھنے والے کی بڑائی اور فضیلت نمایاں ہوتی ہے.............. اس میں انشا پردازی کا جو حسن ہے، شخصیتوں کے جو خاکے ہیں (وہ نا تمام سہی) ان خطوں میں جیسا رنگین بیان ہے...... اصل مطالعے کی چیزیں ہیں۔"

سچ یہی ہے کہ یہ خاکے خواہ کتنے ہی نامکمل کیوں نہ ہوں، لیکن ان کو جس شگفتہ انداز میں تحریر کیا گیا ہے وہی بڑا وصف ہے۔ اس لیے ہم جوش کے ان خاکوں کو "نیم خاکے" کا عنوان بلا تکلف دے سکتے ہیں اور یہی جوش کی کامیابی ہے۔

●●

پیرانِ ساکوس

(جوش)

ہم دیکھ کے مہوشوں کو کیا کہتے ہیں — اتنا ہی کہ بس "صلِّ علیٰ" کہتے ہیں
لیکن یہ غلامِ زر بہ ایں ریشِ دراز — موقع ہو تو ہر بُت کو "خدا" کہتے ہیں

ہر رنگ میں ابلیس سزا دیتا ہے — انساں کو بہر طور دغا دیتا ہے
کر سکتے نہیں گنہ جو احمق اُن کو — بے رُوح نمازوں میں لگا دیتا ہے

کیا شیخ کی خشک زندگانی گزری — بے چارے کی اک شب نہ سُہانی گزری
دوزخ کے تخیل میں بڑھاپا بیتا — جنّت کی دُعاؤں میں جوانی گزری

رضوان احمد

جوش اور صحافت

جوش ملیح آبادی بنیادی طور پر شاعر تھے اور بلاشبہ عہد آفریں شاعر تھے۔ نظم نگار تھے، شاعرِ انقلاب تھے۔ مگر نثر پر بھی زبردست قدرت تھی۔ زرخیز ذہن کی جولانیاں کسی ایک پیرائے کی اسیر نہیں رہتیں۔ انہوں نے بھی مختلف اصناف اور اسالیب اختیار کئے۔ وہ صاحبِ طرز صحافی بھی تھے۔ سیاسی، سماجی، ادبی، تعلیمی اور ثقافتی موضوعات پر متعدد مضامین لکھے اور سب سے آخر میں چونکا دینے والی ضخیم خودنوشت "یادوں کی برات" لکھی جس کی منفرد ادبی حیثیت اور شناخت ہے۔

جوش کا صحافت سے ترش و شیریں رشتہ تھا۔ انہوں نے اس بن باس، میں بارہ برس گزارے۔ جہاں عیش و انبساط سے بھی ہم کنار ہوئے اور مشکلات و مصائب سے بھی دوچار ہوئے۔ ۱۹۳۷ء میں دہلی سے ماہنامہ "کلیم" نکالا۔ یوں تو یہ ادبی رسالہ تھا مگر اس میں سیاسی اور سماجی موضوعات پر بھی مضامین ہوتے تھے۔ یہ رسالہ چار برس تک جاری رہ کر مالی مسائل کا شکار ہو کر بند ہو گیا۔ پھر سات برس تک وہ "آج کل" کی ادارت سے وابستہ رہے جس کی ادبی حیثیت اس زمانے میں بھی مسلم تھی۔

صحافت نہ تو ان کا پیشہ تھی اور نہ ہی مشغلہ صرف مجبوری تھی۔ "کلیم" انہوں نے ذوق کی تسکین کے لئے نکالا تھا جس کے لئے مسز سروجنی نائیڈو نے سرمایہ فراہم کیا تھا، مگر جوش تجارتی ذہن کے انسان نہیں تھے، اس لئے وہ رسالہ زیادہ دن چلا نہیں سکے۔ "آج کل" سرکاری رسالہ تھا جس کی ادارت کی ذمہ داری آنجہانی وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کے خصوصی احکامات کے تحت ان کو تفویض کی گئی تھی۔ سات برس تک وہ اس کے مدیر رہے پھر پاکستان منتقل ہو گئے۔ وہاں بھی وہ چند ادبی رسائل کے ساتھ اعزازی طور پر منسلک رہے مگر کسی کے لئے باقاعدہ کچھ لکھنے کا کام نہیں کیا۔ مضامین و مقالات بے قاعدگی سے اخبارات و رسائل میں لکھے۔

جوش کی صحافتی نثر بھی انقلابی شاعری کی طرح پُرجوش اور پُرشور ہے اس میں مولانا آزاد جیسا تقدس نہیں بلکہ آبشاروں کا سا بہاؤ ہے۔ اس کی گھن گرج پکار پکار کر کہتی ہے کہ یہ جوش کی نثر ہے۔

"کلیم" کے متعلق یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں:

"کلیم" کی روزافزوں ترقی نے میرے بہت سے دشمن بھی پیدا کر دئے تھے اور ایسا کیوں نہ ہوتا اس لئے کہ فرنگی حکومت کی تہدیم، سرمایہ داری کی تدفین، سوشلزم کی تبلیغ، اقوالِ علما کی تضحیک، فکر و تامل کی ترغیب، کانگریس کی تحکیم، مسلم لیگ کی تنقیص اس کی پالیسی میں داخل تھی اور اسی بنا پر شاہ (فرنگی) اور شاہ صاحب دونوں مجھ سے بگڑ گئے تھے جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا تھا کہ کانگریس کے غلامی پرست مخالفین، مسلم لیگ کے خطاب یافتہ مجاہدین، حکومت کے نعش بردار، حکام اور منبر و محراب پر بلبلانے والے سرکاری خطبہ خوار علمائے کرام لنگوٹ باندھ کر اکھاڑے میں اتر آئے تھے۔

ادھر پلٹنیں تھیں اور ادھر ایک فرد واحد تھا کہ آواز دے رہا تھا۔

من و گرز و میدان و افراسیاب

("یادوں کی برات" ص: ۲۴۶)

"کلیم" کے اوراق الٹنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کثیر الجہت رسالہ تھا۔ اس میں ادب پارے تو ہوا ہی کرتے تھے، ساتھ ساتھ سیاسی، سماجی اور ثقافتی نوعیت کے مضامین بھی ہوتے تھے۔ اس کا سب سے دلچسپ کالم اشارات ہوا کرتا تھا جسے اداریہ بھی کہا جا سکتا ہے اس کے تحت جوش ہنگامی موضوعات پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ اکثر مخالفین کے خطوط اور ان کے جواب بھی اسی کالم میں شائع ہوتے بلکہ کئی بار جواب الجواب کا سلسلہ چلنے لگتا تھا جوش پر بھی رکیک حملے ہوتے تھے اور جوش بھی مخالفین پر کراری چوٹیں کرتے تھے۔

دورِ کلیمی کے متعلق فرماتے ہیں:

"آئے دن میرے خلاف کفر کے فتوے نکلا کرتے تھے اور قتل کی دھمکیوں کے گمنام خطوط آیا کرتے تھے۔ خفیہ پولیس سائے کی مانند میرا تعاقب کرتی تھی۔"

("یادوں کی برات" ۲۴۸)

"کلیم" میں 'اشارات' کے تحت اظہارِ خیال زیادہ تر ہنگامی موضوعات پر ہے۔ مگر اس کی مسجع و مقفیٰ اور پُرشکوہ نثر نے ان کی مستقل حیثیت کا تعین کر دیا ہے۔ بعض ادارئے تو اس قدر ترو تازہ ہیں کہ مرورِ ماہ و سال کی گرد ان کو دھندلا نہیں سکی ہے۔ مشتے از نمونہ:

اسماعیل منزل (آئیڈیل میڈیا) سبزی باغ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴

"جب کبھی ملک میں انقلاب ہونے والا ہوتا ہے تو تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اس موقع پر وہاں انقلاب کی آخری ضرب سے پہلے ایک جماعت رونما ہوتی ہے جس کے اعمال و اقوال ایسے ہوتے ہیں کہ بجا طور پر اسے 'جماعت خوف' کا لقب دیا جا سکتا ہے اور جیسا کہ انقلاب فرانس کے موقع پر ہو چکا ہے۔ اس جماعت کا لے دے کے صرف یہی کام ہوتا ہے کہ وہ ..... لوگوں کو انقلاب کے نتائج سے ڈراتی ہے اور ایک گروہ کو دوسرے گروہ سے خوف دلا کر پھوٹ ڈال دیا کرتی ہے۔"

اشارات۔ جماعت ہائے خوف 'کلیم' دہلی
مارچ ۱۹۳۸ء

تعلیمی معیار کی پستی پر آج ہم ماتم کناں ہیں۔ مگر ۶۰ برس قبل جوش نے اساتذہ کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا۔ کیا وہ آج بھی بامعنی نہیں ہے؛

"زمانہ دراز سے یہ زور دیا جا رہا ہے کہ ہمارا نصاب تعلیم نہایت ہی خراب ہے۔ لیکن کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ —— ہماری تعلیمی مصیبت مکمل ہے۔ صرف ہمارا نصاب اور طریقۂ تعلیم ہی خراب نہیں ہمارے اساتذہ اور ہمارے پروفیسر بھی ناامیدی کی حد تک خراب واقع ہوئے ہیں۔"

"ہندوستانی پروفیسروں کو پروفیسر کہنا دراصل پروفیسری کی توہین ہے۔ اس ملک میں جہاں لاکھوں باتیں حیرت انگیز ہیں وہاں یہ بھی ایک حیرت ناک بات ہے کہ اس جہالت آباد میں کسی کو علم تک نہیں کہ پروفیسر کہتے کسے ہیں۔ اس کی علمی، اخلاقی اور ذہنی خصوصیات کیا ہونی چاہئیں اور اس بزرگ ترین پیشے کے واسطے کون کون سے شرائط ناگزیر ہیں۔"

'اشارات' ایک خطرناک شوشہ 'کلیم' ۱۹۳۷ء

جوش زبان کے بادشاہ تھے ہی ان کو بلا کی دسترس حاصل تھی۔ ان کے سامنے الفاظ صف بہ صف کھڑے ہوتے تھے اور وہ انہیں مناسب جگہ پر رکھ دیا کرتے تھے۔ یہی صورت ان کی صحافتی زبان میں بھی نظر آتی ہے۔ یہاں بھی وہ اپنے قلم کی جولانیاں دکھاتے ہیں۔ ان کے مذہبی افکار جو بھی ہوں مگر سورۂ رحمٰن سے انہیں بے حد عقیدت تھی۔ وہ اس کے اسلوب سے ہر درجہ متاثر تھے اور شعر و نثر دونوں میں اس کی نقل کرنے کی شعوری کوشش کرتے ہیں۔ جوش کا کیا ہوا سورۂ رحمٰن کا منظوم ترجمہ تو لاجواب فن پارہ ہے:

ہر نفس طوفان ہے ہر سانس ہے اک زلزلہ
موت کی جانب رواں ہے زندگی کا قافلہ
مضطرب ہر چیز ہے جنبش میں ہے ارض و سما
ان میں قائم ہے تو تیرے رب کے چہرے کی ضیا
کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا

وہی اسلوب 'قدرت کی فیاضیاں' لکھتے ہوئے اختیار کرتے ہیں:

"میں اس سبز روشنی کے حلقے میں اپنے خضر راہ کے ساتھ ایک مدت تک انتہائی اطمینان قلب کے ساتھ رہا، لیکن کچھ روز کے بعد میرے خضر راہ کے چہرے پر وحشت و کبیدگی کے آثار پیدا ہو چلے اور اس کے انفاس سے مجھے بے تعلقی کی بو آنے لگی ——
ان آثار کو وحشت کی نظروں سے دیکھا اور ابھی کوئی فیصلہ نہ کر سکا تھا کہ اس اثنا میں ایک صبح کیا دیکھتا ہوں کہ میرے خضر راہ کا حجرہ خالی پڑا ہوا ہے اور مجھے تنہا خالی چھوڑ کر بھاگ چکا ہے —— لیکن میں ابھی آنکھیں مل ہی رہا تھا کہ یکایک ایک جلوس کے باجوں کی آواز سے تمام فضا گونج اٹھی اور میں قافلہ سالار کے رفیقوں میں شامل ہو کر اس قیام تنگ و تار سے ایک گلستان رنگ و بو میں پہنچ گیا۔
قدرت نے مجھ سے کب بخل کیا ہے کہ میں اس کی شکایت کروں۔"

(قدرت کی فیاضیاں، "کلیم" دہلی، مئی ۱۹۳۶ء)

اس طرح ہم ایک نئے ذائقے اور نئے اسلوب سے آشنا ہوتے ہیں۔

صحافت کی پرخار وادی میں جوش پابہ جولاں چلے اور کبھی تو پاؤں کے آبلوں سے ان کا دل وادیٔ پرخار دیکھ کر خوش ہو گیا۔ پر کبھی دل کے سارے پھپھولے توڑ کر قلم کی سیاہی میں انڈیل دئے اور ساری شورش درد و کرب ان کی تحریر کا حصہ بن گیا۔ ان کی صحافت کے دریا یم بہ یم 'دریا بہ دریا' جو بہ جو نظر آتے ہیں اور ان کی تھاہ لگانا آسان نہیں۔

صحافت نے جہاں جوش کو نشاط انگیزیاں فراہم کیں، وہیں درد و کرب سے بھی ہم کنار کیا۔ ان کے کئی مضامین متنازعہ بنے۔ عدالتوں کے چکر لگانے پڑے۔ دشنام طرازی کا بھی سلسلہ چلتا رہا۔

جوش سات برس 'آج کل' کی ادارت سے وابستہ رہے۔ اس میں ادارتی کالم نہیں ہوتا تھا۔ مگر وہ کبھی کبھی الگ سے مضامین لکھ کر اظہار خیال کیا کرتے تھے۔ مگر ان مضامین کی تعداد بھی کم ہے۔ عام طور سے یہ مضامین مختصر ہیں۔ مہاتما گاندھی کی پہلی برسی پر لکھتے ہیں:

"جب وہ یہ دیکھتے تھے کہ فرط غضب سے افراد و اقوام کی آنکھوں میں خون اتر آیا ہے تو ان کے دل سے خون کی بوندیں ٹپکنے لگتی تھیں۔

وہ صرف ہندوستان کے ہی ہمدرد و سرپرست نہیں تھے۔ ان کا سینہ اتنا چوڑا تھا کہ یہ تمام کرۂ ارض ان کی محبت کے زیر سایہ گردش کرتا تھا۔ وہ اپنے ہم قبیلہ تمام عظیم ترین انسانوں کی طرح انسانوں سے محبت کرتے تھے۔ نسل، رنگ، قوم، مذہب اور زبان کا امتیاز ان سے اس قدر فاصلے پر تھا کہ ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

زباں پہ بارِ خدایا ..... 'آج کل' ۱۹۴۸ء

"آج کل" میں ان کا قلم بے حد محتاط نظر آتا ہے، مگر ان کا اسلوب صاف جھانکتا ہے:

جوش اخبارات کے لئے ہمیشہ ہی متنازعہ فیہ شخصیت رہے اور پاکستان کے اخبارات نے تو خوب خوب ان پر نشانہ لگایا۔ یہ دَور ان کے لئے بے حد کرب ناک تھا۔ ان کے افکار و خیالات کو توڑ مروڑ کر شائع کیا جاتا تھا اور تردید و وضاحت شائع نہیں کی جاتی تھی۔ ان کی تصویر حکومت کے سامنے مکروہ بنا کر پیش کی جاتی۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ جوش ادب کی قد آور ترین شخصیت تھے بقیہ ان کے سامنے بونے تھے۔ پست قد ان کی کردار کشی کر کے اپنا قد اونچا کرنے کی سعیٔ ناکام کرتے تھے۔ وہ خود کہتے ہیں۔

"میرے پاکستانی بنتے ہی یعنی جنگل کی چوتھی طرف بھاگتے ہی ایک قیامت کا غلغلہ برپا ہو گیا۔ پورے پاکستان میں اور شہر کراچی میں تو اس قدر بلبلا اٹھے گویا صورِ قیامت پھونک دیا گیا ہے۔ تمام چھوٹے بڑے اردو اور انگریزی اخباروں کے لشکر خم ٹھونک کر میدانِ جنگ میں آ گئے۔ تمام ادبا، و شعراء اور کارٹون سازوں نے اپنے اپنے قلم کی تلواریں نیام سے نکال کر میرے خلاف مضامین، قطعات اور کارٹونوں کی بھرمار کر دی۔"

("یادوں کی برات" ص: ۳۸۲)

صورتِ حال یہ پیدا ہو گئی کہ کسی رسالے نے جوش نمبر نکالا تو دوسرے رسالے کا "جوش نمبر" نکالنا بھی ضروری ہو گیا۔

کلائمکس اس وقت ہوا جب ۱۹۷۸ء میں جوش نے ایک اخبار نویس کو انٹرویو اس شرط پر دیا کہ یہ ان کے انتقال کے بعد شائع ہو گا۔ اس میں پاکستان، محمد علی جناح، علامہ اقبال، جنرل ضیاء الحق اور دوسرے رہنماؤں کے بارے میں کھل کر اظہارِ خیال کیا۔ مگر اخبار نویس نے عہد شکنی کی اور وہ انٹرویو ان کی حیات میں ہی شائع کروا دیا۔ نتیجتاً بے حد اودھم مچا۔ ہائے توبہ ہوئی، مگر جوش نے اپنے کسی خیال کی تردید نہیں کی۔ یہ غالباً ان کی زندگی کا آخری انٹرویو تھا اور بے حد متنازعہ بھی۔ آخر تو وہ اتنے بڑے انسان تھے، حالات کے ستائے ہوئے تھے۔ اپنوں کے بھی اور غیروں کے بھی، اس لئے خود ہی کہہ اُٹھے:

"آخر یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ اس قوم میں کسی صاحبِ قلم کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور ہر ادیب و شاعر کو چاہئے کہ وہ خودکشی فرمائے۔"

"یادوں کی برات" ص ۲۸۳

●●

عشق و حسن

افسوس یہ حسن، یہ بد حواسی تیری
دل ہی نہیں روح بھی ہے پیاسی تیری
ہنستی ہے تو منہ اترنے لگتا ہے تیرا
کس درجہ مکمل ہے اُداسی تیری

پابندِ ہراس کیوں ہے؟ تیرے قرباں
آشفتہ حواس کیوں ہے؟ تیرے قرباں
تجھ پر تو ہے انبساطِ عالم کا مدار
تو اتنی اُداس کیوں ہے؟ تیرے قرباں

ہے صبح اُفق سے جگمگانے والی
وعدے یہ ہے ان کے مسکرانے والی
جا پچھلے پہر کے چاند ان سے کہہ دے
اب رات ہے دو گھڑی میں جانے والی

ناگن بن کر مجھے نہ ڈسنا بادل!
باراں کی کسوٹی پہ نہ کسنا بادل!
وہ پہلے پہل جدا ہوئے ہیں مجھ سے
اس دیس میں اب کی نہ برسنا بادل

جانے والے قمر کو روکے کوئی
شب کے پیکِ سفر کو روکے کوئی
تھک کر مرے زانو پہ وہ سویا ہے ابھی
روکے، روکے، سحر کو روکے کوئی

کیا آج تعارف میں لجایا کوئی
کیا جانیے کیوں سنبھل نہ پایا کوئی
میں نے جو کہا "جوش مجھے کہتے ہیں"
آنکھوں کو جھکا کے مسکرایا کوئی

(جوش)

جوشؔ: چند معاصر ناقدین کی نظر میں

● جوشؔ تشبیہات کے خاص ماہر ہیں۔ علاوہ اس کے کہ ان کی تشبیہات میں مقامی اثر بھی ہوتا ہے۔ وہ زیادہ تر ان چیزوں کو تشبیہات کے لئے چنتے ہیں جو ہمارے مشاہدے میں روز مرہ آیا کرتی ہیں اور اپنی معنویت و برمحل استعمال کی وجہ سے شعر کی جان بن جاتی ہیں۔ بعض وقت جوشؔ تشبیہات ہی سے پوری فضا کو ایک مکمل تصویر بنا دیتے ہیں اور متعدد تشبیہات و استعارات سے مفہوم کو اتنا واضح اور دل کش کر دیتے ہیں کہ اردو ادب میں کوئی دوسرا شاعر ان کا اس معرکے میں حریف نہیں۔

ان کے کلام میں ایک اور خاص بات نظر آئے گی کہ جوش اور زور کا دریا ہر جگہ موجزن ہے۔ جس کی وجہ سے پڑھتے وقت ایک خاص امنگ دل میں پیدا ہو جاتی ہے۔

وہ اپنے کلام سے دنیا کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اقبال کی طرح حسنِ عمل کی طرف متوجہ کرتے ہیں اور دنیا کو غلامی سے نجات دلا کر اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی تعلیم دیتے ہیں۔ مگر بعض وقت لوگوں کی برائیوں پر روشنی ڈالنے میں اتنے جوش اور تیزی سے کام لیتے ہیں کہ نظروں میں خیرگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کی شیریں کلامی، تلخ نوائی سے بدل جاتی ہے۔ خواہ اسے ان کے شدید احساسات پر محمول کیجئے یا خوابِ گراں سے چونکنے کی تدبیر سمجھئے۔

ڈاکٹر اعجاز حسین

● جوشؔ کو فطری، رومانی اور سیاسی نظمیں لکھنے پر یکساں قدرت حاصل ہے۔ ہندوستان کی سیاسی زندگی میں شاید ہی کوئی ایسا واقعہ ہوا ہوگا جس پر انہوں نے نظم نہ لکھی ہو۔ وہ قوم پرستی، ہندو مسلم اتحاد، حب وطن، جمہوریت، امن اور آزادیٔ خیال کے پجاری ہیں۔ اور ان خیالات کو انہوں نے اپنی ہزاروں نظموں میں بڑے دلچسپ و دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کے الفاظ میں آگ کی گرمی اور خیالات میں جوالا مکھی کا زور ملتا ہے۔ اس لئے کبھی کبھی ان کی تخلیقات میں وہ توازن نہیں رہتا جو ایک مفکر شاعر کے یہاں رہنا چاہئے۔ فلسفہ کی نظر سے وہ انسان کو مجبور مانتے ہیں، مگر وجودِ خدا کے منکر ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ انسان کی آزادی اور ترقی کے گیت بھی گاتے ہیں۔ خیالات میں یہ ناہمواری محض اسی لئے ہے کہ وہ عوام الناس اور ان کی تمناؤں کے محب ہونے کے باوجود ان کے قریب یا ان سے پوری طرح آشنا نہیں ہیں۔ فکر و عمل کی یہ دوری کبھی ان کو دہشت پسند بناتی ہے، کبھی رومانی، کبھی رجعت پسند۔ کبھی بہت بڑا ترقی پسند۔

جوشؔ کو استعمال الفاظ پر غیر معمولی قدرت ہے۔ اردو میں کوئی شاعر ایسا نہیں ہے جو تشبیہات و صنایع کے نفیس استعمال میں ان کی برابری کر سکے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شاعری میں نئے رجحانات کے باوجود اردو کی تاریخ میں مستقبل کی دنیا ان کو بہت بلند مقام دے گی۔

احتشام حسین

● جوشؔ کی شاعری اندر سے بے انتہا بے مغز اور کھوکھلی ہے۔

مجنوں گورکھپوری

● کلام میں زور اور اثر بھی ہوتا ہے، لیکن ہنگامۂ انقلاب کی ترجمانی کے زعم میں وہ اکثر بدحواس ہو جاتے ہیں اور ایسے موقعوں پر غیظ و غضب کا دورہ ان پر پڑتا ہے تو پھر شعریت کافور ہو جاتی ہے اور جو کچھ باقی رہ جاتی ہے وہ چیخ اور پکار ہے۔ ان کے نادان قدر دان اس چیخ و پکار اور ظلم، قہر و غضب کو کمالِ شاعری سے تعبیر کرتے ہیں، ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور انہیں بلیوں اچھالتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو خود بھی اس کمزوری کا احساس نہیں۔

پنڈت کشن پرشاد کول

● جوشؔ کی شاعری میں:

رقیب کی جگہ	سرمایہ داری
معشوق کی جگہ	مزدور
وصل کی جگہ	انقلاب آگیا ہے۔

ڈاکٹر عبدالعلیم

● جوشؔ کی شاعری عصرِ حاضر کی فضا میں سانس لیتی ہے۔ وہ حسن و عشق

کی داستانِ پارینہ سے کنارہ کش ہوتے ہیں اور انقلابی شاعری کے جوہر چمکاتے ہیں۔

جوش کی انقلابی نظموں میں بھی وقتی اور سطحی باتیں ہیں۔ چیخ پکار ہے۔ زور ہے۔ شعریت نہیں .....

جوش کی توجہ کا مرکز نادر اور انوکھے تشبیہ اور استعارے، بے مثل ترکیبیں، الفاظ اور الفاظ کی ترتیب، مصرعوں کا ترنم اور روانی، اور تخیل کے چھلاوے ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے اور نہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان چیزوں کی اپنی کوئی اہمیت نہیں۔ یہ گڑیاں ہیں جن سے شاعر کام لیتا ہے .....

جوش ہمیشہ بات کا بتنگڑ بناتے ہیں۔ لفظوں کے کھوکھلے ڈھول کو زور شور سے بجاتے ہیں ..... اور جب ان کی چھوٹی چھوٹی نظموں میں ٹیکنیک کی خامیاں رہ جاتی ہیں تو پھر طویل نظم میں وہ کیسے کامیاب ہو سکتے ہیں۔

کلیم الدین احمد

● جوش کے کلام سے جو سب سے پہلا تاثر ہوتا ہے وہ یہ کہ جوش کی ایک شخصیت نہیں بلکہ دو شخصیتیں ہیں۔ ان دو شخصیتوں کے لئے جوش صاحب نے خود سیف اور سبو کے نشانات وضع کئے ہیں۔ جوش نے مزدور اور کسان کے تجربات اور مسائل کی ترجمانی نہیں کی۔ شکوہ یہ ہے کہ انہوں نے خود اپنے طبقے کی اُلجھنوں اور مسائل کو بھی بیشتر موضوعِ شعر نہیں بنایا۔ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ وہ انفرادیت پسند ہیں، اس لئے وہ جماعتی طور سے سوچتے ہی نہیں، انفرادی طور سے سوچتے ہیں اور جب کبھی وہ سیاسی یا جماعتی مسائل کا ذکر کرتے ہیں تو اپنی جماعت کے نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ اپنے ذاتی نقطۂ نظر سے۔

فیض احمد فیض

● علمی تہی مائگی، سیمابیت اور جاگیردارانہ عیش پرستی ان تینوں عناصر کا مرکب جوش کی شخصیت ہے۔ انہوں نے اپنی شخصیت کے ان تینوں اجزاء کو اپنی خود پسندی اور تنقیدی شعور کے فقدان کی وجہ سے ہمیشہ کچھ آگے ہی بڑھایا ہے۔ انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم اور گھر کے ماحول سے جو جاگیردارانہ ہونے کے ساتھ ساتھ، شاعرانہ بھی تھا۔ اتنا ضرور لیا کہ اردو اور فارسی شاعری کا مذاق پیدا کر لیا۔ لیکن قدیم یا جدید علوم کے گہرے مطالعے کا انہیں موقع نہیں ملا جوش نے ابتدا میں اقبال کے انداز بیان کا چربہ ہی چربہ اڑانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن بعد میں اس کی خطیبانہ شاعری کی مقبولیت اور شہرت نے انہیں اس مغالطے میں ڈال دیا کہ وہ اقبال کے حریف ہیں۔ کلیم الدین احمد نے جوش کی بعض مقبول ترین نظموں کو اقبال کی صدائے بازگشت کہا ہے۔ اقبال کی فارسی نظم "از خواب گراں، خواب گراں خیز" شائع ہوئی تو جوش نے "بیدار ہو، بیدار ہو، بیدار" "ہشیار ہو، ہشیار ہو، ہشیار" "ہوشیار اے مرد غافل ہوشیار" "ہاں پیر مغاں پیر مغاں پیر مغاں دیکھ" "برسات ہے برسات ہے برسات" جیسی بہت سی نظموں کی بھرمار کر دی۔ اسی طرح جوش کی نظم "بڑھے چلو بڑھے چلو رواں دواں بڑھے چلو" کا سرچشمہ بھی اقبال کی فارسی نظم نغمۂ ساربان (تیز ترک گامزن منزل ما دور نیست) ہے۔

خلیل الرحمٰن اعظمی

مشتے نمونہ از خروارے :

اے خدا

اے خدا! سینۂ مسلم کو عطا کر وہ گداز
تھا کبھی حمزہ و جنید کا جو سرمایۂ ناز
پھر فضا میں تری تکبیر کی گونجے آواز
پھر اس انجام کو دے گرمیِ روحِ آغاز
نقشِ اسلام اُبھر جائے، جلی ہو جائے
ہر مسلمان حسینؑ ابنِ علیؑ ہو جائے

دشتِ اسلام کے کانٹوں کو گلستاں کر دے
پھر ہمیں شیفتۂ جلوۂ ایماں کر دے
دل میں پیدا تپشِ سوزِ مسلماں کر دے
اپنے محبوبؐ کی "سوگند" مسلماں کر دے
روکشِ صبح شبِ تار کا سینہ ہو جائے
آبگینے کو وہ چمکا کہ نگینہ ہو جائے

دے ہمیں بارِ خدا جرأت و ہمت کے صفات
دل کو یوں چھیڑ کہ پھر جاگ اُٹھیں احساسات
پھر سے ہوں تازہ رسولِ عربیؐ کے غزوات
ذرۂ مومن کو یہ دے موت ہے تکمیلِ حیات
جادہ پیماؤں کو چھوٹا ہوا صحرا دے دے
قیس کو پھر خلشِ ناقۂ لیلیٰ دے دے

صبحِ اسلام پہ ہے تیرہ شبی کا پرتو
لبِ مسلم سے ہٹا تشنہ لبی کا پرتو
کانپ کر ماند ہو راحت طلبی کا پرتو
ڈال سینوں میں رسولِ عربیؐ کا پرتو
غل ہو وہ حوصلۂ شوق دوبارہ نکلا
وہ چمکتا ہوا اسلام کا تارہ نکلا

زندہ کس طور سے رہتے ہیں بتا دے ہم کو
عقل حیراں ہو وہ دیوانہ بنا دے ہم کو
سوئے میخانۂ توحید صلا دے ہم کو
عشق کا ساغرِ لب ریز پلا دے ہم کو
کج ہوں اس وقت سرِ حشر کلاہیں اپنی
جب ملیں ساقیٔ کوثر سے نگاہیں اپنی

آسودگی کی یاد

دوشِ صبا پر آئی ہے آسودگی کی یاد
بیتے دنوں کے خیمۂ رامش گری کی یاد
آئی ہے کانپتے ہوئے تاروں کی چھاؤں میں
ڈوبے ہوئے نجوم کی تابندگی کی یاد
رقصاں تھے جس کی تان میں نو خیز ولولے
اب ہچکیوں میں غرق ہے اس بانسری کی یاد
کم فرصتی میں آئی ہے فرصت لئے ہوئے
وہ فرصتِ شباب کی کم فرصتی کی یاد
زلفوں میں منہ چھپائے درِ دل پہ ہم نشیں
دستک سی دے رہی ہے کسی خلوتی کی یاد
خود اپنی سرد لاش لئے اپنے دوش پر
آئی ہے راہِ عشق میں آوارگی کی یاد
کس حد کی جاں گداز ہے کس درجہ ہولناک
جو وقت کے مزار میں ہو اُس خوشی کی یاد
آئی ہے تیرِ درد کو جوڑے کمان میں
اک گلستانِ رفتہ کے سروِ سہی کی یاد
آغوش میں کسی کے جو گزری تھی ایک بار
گریاں ہے سر جھکائے ہوئے اس گھڑی کی یاد
بجھتے ہوئے نجوم کے پٹ کھول کھول کر
رہ رہ کے دل کو چھیڑ رہی ہے کسی کی یاد
جس طرح سر پہ رات کو چمکے برہنہ تیغ
تاریکیوں میں آئی ہے یوں چاندنی کی یاد
ماضی کے تیرہ کنج میں جس کا مزار ہو
اے جوشؔ دل کی موت ہے اُس زندگی کی یاد

جانِ بہار

(نئی بحر)

اے بہ رُخ مصحفِ گلنار و چراغِ حرمِ غنچگی و آیۂ گلباری و قرآنِ بہار
اے بہ قد موجِ رواں، برقِ تپاں، سروِ سہی، شاخِ گُلِ تازہ و الہامِ خرامانِ بہار

پئے گلگشت ذرا اس قدِ بالائے فلک تاب و چمن ساز کو دے اذنِ خرام
کہ ترے ہجر میں بے کیف ہے، بے روح ہے، بیتاب ہے، بے خواب ہے میلائے گلستانِ بہار

آ بھی جنبش میں کہ ہیں گوش برآوازِ ادیبان و حریفان و گُل و لالہ و سرو
اے لبِ لعلِ فسوں بار و دل آویز و شکر ریز کہ ہے تجھ پہ فدا لرزشِ دامانِ بہار

بربط و عود و شراب و دف و افسانہ و افسون و شب و ماہ و رباب و ساغر
آ کہ مشتاق ہیں اے جانِ چمن، زہرہ جبیں، ہوش رُبا، ماہ لقا شمعِ شبستانِ بہار

آج ہے حافظِ شیرازی و خیام و نظیری و فغانی و ظہوری کا جواب
یہ ترا جوشؔ کہ ہے مست و خراباتی و سرحلقۂ رندانِ جہاں قبلۂ خاصانِ بہار

شامِ رخصت

تجھ سے رخصت کی وہ شام اشک افشاں ہائے ہائے
وہ مرے سینے میں سیلِ آب و آتش الاماں
وہ مرا عشقِ گُل افشاں، رقص برپا، حیف حیف
وہ تپِ غم سے مری آنکھوں میں سرخی، الغیاث
وہ مرے اطوار میں اندازِ سیلِ بے پناہ
وہ جدائی کی ہوا کے تند جھونکے، وائے غم
اس طرف اُمڈی ہوئی موجِ حیاتِ یک نفس
اس طرف تاریکیٔ شامِ مریضانِ کہن
یاں چمکنے ہی پہ برقِ نالۂ درد آفریں

وہ اداسی، وہ فضائے گریہ ساماں ہائے ہائے
وہ ترے چہرے پہ موجِ برق و باراں ہائے ہائے
وہ ترا حسنِ جواں، سر در گریباں ہائے ہائے
وہ پسینے سے ترے رُخ پر چراغاں، ہائے ہائے
وہ تری آواز میں آثارِ طوفاں ہائے ہائے
وہ جدائی کا چراغِ زیرِ داماں، ہائے ہائے
اُس طرف بکھرے ہوئے گیسوئے تاباں، ہائے ہائے
اُس طرف اندوہِ صبحِ سوگواراں، ہائے ہائے
واں برسنے ہی پہ ابرِ چشمِ حیراں، ہائے ہائے

تیرے لئے

دیکھ کیونکر جی رہا ہوں دل رُبا تیرے لئے
ہر نفس ہے اک حدیثِ کربلا تیرے لئے
ڈھونڈتا پھرتا ہوں میں اپنے کو تیری راہ میں
پوچھتا پھرتا ہوں میں اپنا پتا تیرے لئے
میں کہ آغوشِ سکوں میں پا چلا تھا آپ کو
پھر محیطِ کشمکش میں کھو گیا تیرے لئے
حسرتیں دل کی رواں ہیں کارواں در کارواں
ہر نفس ہے ہجر میں بانگِ درا تیرے لئے
آہ گو اک عمر سے ہوں میں رئیس ابنِ رئیس
بن کے نکلا ہوں گدائے بے نوا تیرے لئے
مانگتا ہوں بھیک درویشوں سے تیرے قرب کی
شاہ کے کوچے میں دیتا ہوں صدا تیرے لئے
شرع سے درخواست کرتا ہوں کشودِ کار کی
کھٹکھٹاتا ہوں درِ دارالقضا تیرے لئے
آہ اک فتوے کی خاطر کہنا پڑتا ہے مجھے
"شیخ" سے نااہل کو مردِ خدا تیرے لئے
جاہلانِ بے خرد کے ناسزا اقوال کو
ماننا پڑتا ہے بے چون و چرا تیرے لئے
چاک کر کے میں نے آبائی امارت کا لباس
زیبِ تن کی ہے غلامی کی قبا تیرے لئے
مشتری جس کا خدا تھا، چند سکوں کے عوض
بیچ دی میں نے وہ جنسِ بے بہا تیرے لئے
پھیر لیں آنکھیں مناظر سے ملیح آباد کے
لکھنؤ کی چھوڑ دی آب و ہوا تیرے لئے
کر چکا ہوں شدتِ حرماں سے تنگ آ کر معاف
ہر فرو مایہ کو اپنا خوں بہا تیرے لئے
پوجنا پڑتا ہے ہر کافر کو تیرے واسطے
ماننا پڑتا ہے ہر بُت کو خدا تیرے لئے
آہ جو فرشِ حرم پر بھی کبھی جھکتا نہ تھا
میں نے بُت خانے میں وہ سر رکھ دیا تیرے لئے
شرط پوری ہو چکی اللہ اب تو رحم کر
دیکھ کیا تھا جوشؔ اور کیا ہو گیا تیرے لئے

میرے بعد

نہ وہ الفاظ کے نغمے نہ وہ معنیٰ کا سرود
گنگ ہے مطربِ اندازِ بیاں میرے بعد

وہ قلق ہے کہ لچکتی نہیں لچکانے سے
لیلیِ شعر کے ابرو کی کماں میرے بعد

زرد ہے رُوئے الوہیتِ نوعِ انساں
پھر جبینوں پہ ہیں سجدوں کے نشاں میرے بعد

وائے برقسمتِ ہم رشتگیِ عقل و جنوں
اب نہیں ان میں کوئی ربطِ نہاں میرے بعد

اپنے لفظوں کے جنازوں کو سرِ دوش اٹھائے
محوِ فریاد ہے لیلائے زباں میرے بعد

زندہ افکار کا پرتو نہ رہا ذہنوں پر
مُردہ ہے انجمنِ دیدہ وراں میرے بعد

چشمِ انجم سے ٹپکتے ہیں لہو کے آنسو
یوں دھڑکتا ہے دلِ زہرہ وشاں میرے بعد

ایک تازہ سنِ رحلت کا ہوا ہے آغاز
اک نئے دَور میں ہے کون و مکاں میرے بعد

نہ رہا کوئی ادا سنجِ حسینانِ جہاں
سر بہ زانو ہیں حسینانِ جہاں میرے بعد

بجھ گئی آتشِ سیال کی شمعِ زریں
اٹھ رہا ہے دلِ ساقی سے دھواں میرے بعد

چاندنی تک ہے خرابات میں دھندلی دھندلی
یوں سیہ پوش ہیں زندانِ جہاں میرے بعد

نہ اضافات کی لپٹیں نہ خیالات کی لَو
تیرہ ہے محفلِ صاحب نظراں میرے بعد

بجھ گیا زمزمۂ ساحل و کشتی کا چراغ
اک اداسی ہے سرِ آبِ رواں میرے بعد

کس کو بخشے گا کلیم ہمتِ گردوں شکنی
چشمِ گیتی ہے بہر سُو نگراں میرے بعد

حیف یہ سیل، یہ طوفان، یہ بلبل، یہ خروش
کس کے آغوش میں پائے گا اماں میرے بعد

اے رُخ و کاکل و نہر و چمن و ابر و نسیم
کون ہوتا ہے ترا مرتبہ داں میرے بعد

جوشؔ صد حیف کہ اس خیمۂ زنگاری میں
کوئی باقی نہ رہا پیرِ جواں میرے بعد

اے دل

مہر ہے کچھ، نہ ماہ ہے اے دل
سب فریبِ نگاہ ہے اے دل

نہ ترنم ہے مستقل نہ سرود
مستقل ہے تو آہ ہے اے دل

ہر گہر اشکِ غم ہے دنیا میں
ہر گُل برگِ کاہ ہے اے دل

ہر گلستاں پہ ہے نگاہِ خزاں
ہر یقیں اشتباہ ہے اے دل

زندہ رہنا ہے ایک طرفہ عذاب
سانس لینا گناہ ہے اے دل

زندگیِ مسیح و عمرِ خضر
رمتِ یک نگاہ ہے اے دل

اب کھلا یہ کہ مغلقِ درماں
درد کی بارگاہ ہے اے دل

تیرگی ہی پہ کچھ نہیں موقوف
روشنی بھی سیاہ ہے اے دل

یومِ بہار

اے ہم نشیں! وہ جوشِ مئے ارغواں ہے آج
صہبا کی ایک بوند میں کون و مکاں ہے آج

ہر غنچہ کو رقص کناں ہے بہ طرحِ نَو
چشم و چراغِ سلسلۂ قدسیاں ہے آج

جس پر نثار موجۂ تسنیم و سلسبیل
بکھری ہوئی وہ کاکلِ عنبر فشاں ہے آج

اللہ رے سیلِ نغمہ و طوفانِ رنگ و بُو
موجِ ہوا میں جنبشِ نبضِ جواں ہے آج

شکرِ خدا کہ طرۂ طرفِ کلاہِ دوست
مشعل فروزِ مجلسِ روحانیاں ہے آج

پھر چہرۂ بشر پہ ہے رنگِ الوہیت
پھر فرشِ خاک بر سرِ کرّوبیاں ہے آج

اوجِ فلک پہ موجۂ ابرِ سبک خرام
صحنِ چمن میں جلوۂ سروِ رواں ہے آج

وہ دخترِ رز کہ تھی خمِ رنگیں میں معتکف
صد شکر صدرِ انجمنِ مے کشاں ہے آج

اف ری شمیم کاکلِ شب رنگ و بوئے عود
دوشِ صبا پہ دولتِ باغِ جناں ہے آج

رندوں کے ساتھ روحِ دو عالم ہے رقص میں
یومِ طوافِ کعبۂ رطلِ گراں ہے آج

ہر آرزو کے فرق پہ کج ہے کلاہِ ناز
"عین الیقیں" بہشت کا وہم و گماں ہے آج

زیرِ نگیں زمین ہے قبضے میں آسماں
آفاق پر حکومتِ پیرِ مغاں ہے آج

ہر خشک و تر میں گونج رہی ہیں حکایتیں
ہر ذرۂ حقیر کے منہ میں زباں ہے آج

رہ رہ کے اُڑ رہا ہے مسیح و خضر کا رنگ
کیا جانے کس لباس میں عمرِ رواں ہے آج

اے جوشؔ زلزلے میں ہے قصرِ تعیّنات
دل ماورائے قیدِ زمان و مکاں ہے آج

ورودِ جاناں

بحمد اللہ کہ وہ عشرت کا ساماں لے کے پھر آیا
بہاراں بن کے پھر پلٹا، گلستاں لے کے پھر آیا

مرے خلوت کدے کی وقت آزردہ خموشی میں
نشید و نغمہ و آہنگ و الحاں لے کے پھر آیا

رگِ ہستی میں تھا دوراں مے جس کے تبسم سے
ترنجِ گلگوں میں وہ صبحِ فروزاں لے کے پھر آیا

مری ہستی کو ساز و برگِ مستی دے کے پھر چہکا
مری تاریکیوں میں آبِ حیواں لے کے پھر آیا

. . . .

لبوں میں نسترن کی پھر سبک مہکیں لئے دہکا
جلو میں چودھویں کا ماہِ تاباں لے کے پھر آیا

مری بچھڑی ہوئی ساون کی تانیں دے کے پھر لہکا
مرا روٹھا ہوا ابرِ خراماں لے کے پھر آیا

. . . .

پشیماں تھا نہ جانے کب سے ذوقِ چاکِ دامانی
مرا دستِ جنوں میرا گریباں لے کے پھر آیا

مچلتا، کسمساتا کشتیوں کی طرح لہراتا
جواں انگڑائیوں کا دردِ پنہاں لے کے پھر آیا

شراب آنکھوں میں، سرخی لب پہ، رنگینی تبسم میں
مرے افسانۂ پیشیں کا عنواں لے کے پھر آیا

نقاب اُلٹے، قبا کے بند کھولے، بال بکھرائے
جنوں کا حکم سرشاری کا فرماں لے کے پھر آیا

جراحت بھی مجھے مطلوب تھی اے جوشؔ مرہم بھی
مبارک ہو وہ جنسِ درد و درماں لے کے پھر آیا

البیلی صبح

نظر جھکائے عروسِ فطرت جبیں سے زلفیں ہٹا رہی ہے
سحر کا تارا ہے زلزلے میں افق کی لو تھرتھرا رہی ہے

روش روش نغمۂ طرب ہے، چمن چمن جشنِ رنگ و بو ہے
طیور شاخوں پہ ہیں غزل خواں کلی کلی گنگنا رہی ہے

ستارۂ صبح کی رسیلی جھپکتی آنکھوں میں ہیں فسانے
نگارِ مہتاب کی نشیلی نگاہ جادو جگا رہی ہے

طیور بزمِ سحر کے مطرب، لچکتی شاخوں پہ گا رہے ہیں
نسیمِ فردوس کی سہیلی، گلوں کو جھولا جھلا رہی ہے

کلی پہ بیلے کی کس ادا سے پڑا ہے شبنم کا ایک موتی
نہیں، یہ ہیرے کی کیل پہنے کوئی پری مسکرا رہی ہے

سحر کو مدِ نظر ہیں کتنی رعایتیں چشمِ خوں فشاں کی
ہوا بیاباں سے آنے والی لہو میں سرخی بڑھا رہی ہے

شلوکا پہنے ہوئے گلابی ہر اک سبک پنکھڑی چمن میں
رنگی ہوئی سرخ اوڑھنی کا ہوا میں پلو سکھا رہی ہے

فلک پہ اس طرح چھپ رہے ہیں ہلال کے گرد و پیش تارے
کہ جیسے کوئی نئی نویلی جبیں سے افشاں چھڑا رہی ہے

کھٹک یہ کیوں دل میں ہو چلی پھر؟ چٹکتی کلیو! ذرا ٹھہرنا
ہوائے گلشن کی نرم رو میں یہ کس کی آواز آ رہی ہے

وداعِ جاناں

وقتِ رخصت کیا کہوں، کیا کیا وہ مہماں لے گیا
ایک عالم کو جلو میں پابہ جولاں لے گیا

چشمِ مست و لعلِ شیریں و رخِ گلگوں کے ساتھ
سازِ الواں لے گیا، سوزِ چراغاں لے گیا

موجِ ناز و موجِ ساز و موجِ مے کے ساتھ ساتھ
جوئے دُر افشاں و بوئے سنبلستاں لے گیا

سو گئی قندیل، ویراں ہو گئے پائے ستوں
حسنِ سقف و بام، نازِ طاق و ایواں لے گیا

سرخوشی کی موج سے دریائے تاباں چھین لے
زندگی کی روح سے ابرِ بہاراں لے گیا

حُسن سے محروم کر کے دیدۂ نمناک کو
عشق کی محراب سے شمعِ فروزاں لے گیا

عین پچھلی رات کو وہ کارفرمائے سحر
شامِ ظلمت دے گیا، صبحِ درخشاں لے گیا

. . . .

جیب میں بھر کر ستارے منہ پہ مل کر کہکشاں
باندھ کر جوڑے میں نورِ ماہِ تاباں لے گیا

جاتے جاتے اُف کچھ ایسی مدبھری انگڑائی لی
ایک طوفاں دے گیا اور ایک طوفاں لے گیا

سر پہ چادر، پاؤں میں لغزش، نفس میں احتیاط
خود کو مانندِ چراغِ زیرِ داماں لے گیا

جوشؔ کس سے جا کے یہ کہیے کہ اک سروِ رواں
لوٹ کر میرا گلستاں کا گلستاں لے گیا

شام کا رُومان

ہوائے شام جب بھرتی ہے ٹھنڈی سانس صحرا میں
مجھے ہر ایک پتّی نوحہ خواں معلوم ہوتی ہے

فضائے نرم پر جس وقت چھا جاتا ہے سنّاٹا
مجھے جنبش میں ذرّوں کی زباں معلوم ہوتی ہے

ٹھٹھکتی ہے مزے سے جب گھنے جنگل کے سائے میں
ہوائے سرد میری ہم زباں معلوم ہوتی ہے

بلند و پست و آب و رنگ جب کچھ بھی نہیں رہتا
یہ دنیا صرف اک وہم و گماں معلوم ہوتی ہے

ٹپک پڑتا ہے جب خورشید آنسو بن کے گردوں سے
لبِ جاں پر صدائے الاماں معلوم ہوتی ہے

دلِ وادی سے اُٹھتا ہے دھواں جس وقت ہلکا سا
پہاڑوں کی بلندی سرگراں معلوم ہوتی ہے

چھپا لیتی ہے خشک و تر کو جب شام اپنے دامن میں
بشر سے روحِ عالم بدگماں معلوم ہوتی ہے

جھلک اُٹھتا ہے جب پہلا ستارہ بامِ گردوں پر
کلیجے پر مجھے نوکِ سناں معلوم ہوتی ہے

فرازِ چرخ پر رہ رہ کے جب کوندا لپکتا ہے
اداسی کارواں در کارواں معلوم ہوتی ہے

شفق کو دیکھتے ہی وہ محبت جس کو جگ بیتا
مرے دُکھتے ہوئے دل میں جواں معلوم ہوتی ہے

اندھیرے میں لبِ ساحل جو پودے کھڑکھڑاتے ہیں
مجھے گریائی فصلِ خزاں معلوم ہوتی ہے

زمین و آسماں جب ظلمتوں میں ڈوب جاتے ہیں
حیاتِ نوعِ انساں رائگاں معلوم ہوتی ہے

شفق کے ہر نفس اُڑتے ہوئے اوراقِ زرّیں میں
مجھے بے ثباتیِ عمرِ رواں معلوم ہوتی ہے

ذرا کچھ فاصلے پر ٹمٹما اُٹھتا ہے جب بن میں
سیاہی روشنی کی راز داں معلوم ہوتی ہے

رسیلی ڈھال پر انگڑائی لیتا ہے اک افسانہ
ندی کے موڑ پر اک داستاں معلوم ہوتی ہے

گھٹا

اٹھی گھٹا وہ رنگ و بُو کا کارواں لئے ہوئے
جلو میں کائنات کی جوانیاں لئے ہوئے

لئے ہوئے پیامِ جاں ہر ایک رس کی بوند میں
ہر ایک رس کی بوند میں پیامِ جاں لئے ہوئے

لئے ہوئے ہوا کے نرم بازوؤں پہ بوستاں
ہوا کے نرم بازوؤں پہ بوستاں لئے ہوئے

دھواں دھواں لئے ہوئے بلندیوں پہ چرخ کی
بلندیوں پہ چرخ کی دھواں دھواں لئے ہوئے

زمینِ تشنہ کام کی جماہیوں کے سامنے
شرابِ لالہ رنگ کی گلابیاں لئے ہوئے

وفورِ سوز و ساز میں ہجومِ پیچ و تاب سے
رقیق و نرم دامنوں میں بجلیاں لئے ہوئے

ہر ایک سُو رواں دواں، کبھی یہاں کبھی وہاں!
کمانِ شوخ و شنگ کی سی شوخیاں لئے ہوئے

قطعہ

کیا جانئے چہرہ زرد ہوتا کیوں ہے
دل رنج و الم سے سرد ہوتا کیوں ہے
افسوس کہ اتنا بھی نہیں ہے معلوم
کانٹا چبھنے سے درد ہوتا کیوں ہے

سرشکِ تبسم

اٹھا ساغر کہ انساں کشتۂ آلام ہے ساقی
یہ بربط ہے، یہ مے، آگے خدا کا نام ہے ساقی

نہ جانے نوعِ انساں کیوں اجل سے خوف کھاتی ہے
اجل کہتے ہیں جس کو زحمتِ یک گام ہے ساقی

حقیقت کیا سمجھ میں آسکے اشیائے عالم کی
فقط اک شکل ہے ساقی فقط اک نام ہے ساقی

سناؤ سازِ حکمت کے ترانے کس توقع پر
کہ اب تک نوعِ انساں بندۂ اوہام ہے ساقی

صداقت آج بھی پوشیدہ ہے اولادِ آدم سے
دروغِ مصلحت آمیز اب بھی عام ہے ساقی

اِدھر یہ قول ہم نے شرح کر دی ہے حقائق کی
اُدھر اب تک وہی ابہام کا ابہام ہے ساقی

اِدھر تکمیلِ دیں کا ہو چکا ہے دعویٰ محکم
اُدھر ایماں تھا جیسا خام اب تک خام ہے ساقی

اِدھر شدّت کے ساتھ اعلان ہے "اتمامِ نعمت" کا
اُدھر اک سانس اب تک زہر کا اک جام ہے ساقی

کہا جاتا ہے مجھ سے زندگی انعامِ قدرت ہے
سزا کیا ہوگی اُس کی جس کا یہ انعام ہے ساقی

تبسم اک بڑی دولت ہے جس کا میں بھی قائل ہوں
مگر یہ آنسوؤں کا ایک شیریں نام ہے ساقی

لڑکپن میں صدا جب روتا تھا جوانی دل کو روتی ہے
نہ جب آرام تھا ساقی، نہ اب آرام ہے ساقی

تمنائیں جگاتی ہیں تو ناکامی سلاتی ہے
نہ اپنی صبح ہے ساقی نہ اپنی شام ہے ساقی

بڑی دریا دلی کے ساتھ ہر خوں ریز طاقت کو
مشیّت کی طرف سے اذنِ قتلِ عام ہے ساقی

یہ کس کی مہرِ ہیبت ثبت ہے گیتی کے سینے پر
کہ ہر ذرّہ ازل سے لرزہ بر اندام ہے ساقی

ادب کر اس خراباتی کا جس کو جوش کہتے ہیں
کہ یہ اپنی صدی کا حافظ و خیام ہے ساقی

اعترافِ عجز

لوگ کہتے ہیں کہ میں ہوں شاعرِ جادو بیاں
اور خود میرا بھی کل تک خیرسے تھا یہ خیال
لیکن اب آتی ہے جب اک گونہ مجھ میں پختگی
آسماں جاگا ہے سر میں اور سینے میں زمیں
جہل کی منزل میں تھا مجھ کو غرورِ آگہی
الاماں آفاق کا دل اور یہ طغیانِ سوز!
زلفِ ہستی اور اتنے بے نہایت پیچ و خم!
میرے شعروں میں فقط اک طائرانہ رنگ ہے
کچھ مناظر، کچھ مباحث، کچھ مسائل، کچھ خیال
میرے کاخِ شاعری کی نیو میں سنگِ فتور
چہچہے کچھ موسموں کے، زمزمے کچھ جام کے
چند زلفوں کی سیاہی، چند رخساروں کی آب
وہ بھی کچھ جاگیردارانہ بہ قولِ ناقدال
وصل کے دو چار نغمے، ہجر کی اک آدھ آہ
گاہ مرنے کے عزائم گاہ جینے کی امنگ
اتنی ادچھی رنگ سازی سے کھلا جاتا تھا میں
بے خبر تھا میں کہ دنیا رازِ اندر راز ہے
اس محلِ آب و گل میں یہ حیاتِ آدمی
ابتدا و انتہا کا علم نظروں سے نہاں
جہل کا اک قہقہہ ہر ادعائے آگہی
روشنی بن کر اکڑتا پھر رہا ہے برملا
انجمن میں تخلیے ہیں تخلیوں میں انجمن
عام معلوماتِ دنیا واقعاتِ صبح و شام
ہر گماں میں اک یقیں سا، ہر یقیں میں سو گماں
نازداں کیا، مدح خواں اور مدح خواں بھی کم سواد
خارج از وہم و گماں ہے شہر لیلائے زمیں
کیوں نہ پھر سمجھوں سبک اپنے سخن کے رنگ کو
لیلیٔ آفاق الٹتی ہی رہی مبہم نقاب
جس میں علمِ آسماں ہے اور نہ اسرارِ زمیں
نوعِ انسانی کو جب مل جائے گی رفتارِ نور
خاک سے پھوٹے گی جب عمرِ ابد کی روشنی
جب قوائے بحر و بر پر آدمی ہوگا سوار
جب بشر کی جوتیوں کی گرد ہوگی کہکشاں
صدرِ معنی، ماورا الفاظ، امیرِ شاعراں
شاعری کے فن میں ہوں منجملۂ اہلِ کمال
ذہن کے آئینے پر کانپا ہے عکسِ آگہی
اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں کچھ بھی نہیں
اتنی لامحدود دنیا اور میری شاعری!
اب کھلا مجھ پر کہ اک طفلِ گلستاں ہوں ہنوز
اڑ گیا رنگِ تعلّی، کھل گیا اپنا بھرم
کچھ سیاسی رنگ ہے، کچھ عاشقانہ رنگ ہے
اک اچٹتا سا جمال، اک سرسری زانو سا جلال
ایک طفلانہ بلوغ، اک کھوکھلا سنِّ شعور
دیر دل میں چند ٹکڑے مرمریں اصنام کے
گاہ حرفِ بے نوائی، گاہ شورِ انقلاب
بے سواد و بستۂ رسم و رہِ رومانیاں
قعرِ ناواقفیت، سطحِ دریا پر نگاہ
بس یہی سطحی سے باتیں، بس یہی اوچھے سے رنگ
اتنی عبرت ناک سطحیت پر اتراتا تھا میں
وہ بھی گہری خامشی ہے جس کا نام آواز ہے
گریہ کی صرف ایک پل بھر موت سے بازی گری
ٹمٹماتا سا دیا، دو ظلمتوں کے درمیاں
موت کا اک مسخرا پن ہے لقائے زندگی
تہ بہ تہ تاریکیوں کا خندۂ دنداں نما
ہر شکن میں اک کھچاوٹ، ہر کھچاوٹ میں شکن
فکرِ انسانی کے محبس، عقلِ انسانی کے دام
ناخنِ تدبیر بھی خود ایک گتھی بے اماں
ناابلہ، نادان، ناواقف، ندیدہ، نامراد
اور اک لمحے کی پیمائش پہ میں قادر نہیں
نطق نے الماس کے بدلے تراشا سنگ کو
اور یہاں عورت، مناظر، عشق، صہبا، انقلاب
ایک خس، اک دانہ، اک جز، ایک ذرہ بھی نہیں
شاعرِ اعظم کا تب ہوگا کہیں جاکر ظہور
جھاڑ دے گا موت کی دامن سے جب گردِ ذکا
جب بنے گا بندۂ مجبور الٰہِ روزگار
جب جنے گی نسلِ آدم شاعرِ جادو بیاں

فکر میں کامل نہ فنِ شعر میں یکتا ہوں میں
کچھ اگر ہوں تو نقیبِ شاعرِ فردا ہوں میں

گرمی اور دیہاتی بازار

دوپہر، بازار کا دن، گاؤں کی خلقت کا شور
خون کی پیاسی شعاعیں، روح فرسا لو کا زور
آگ کی رو، کاروبارِ زندگی کا پیچ و تاب
تُند شعلے، سُرخ ذرے، گرم جھونکے آفتاب
شور، ریل پیل، غلغلہ، ہیجان، لو، گرمی، بخار
بیل، گھوڑے، بکریاں، بھیڑیں، قطار اندر قطار
مکھیوں کی بھنبھناہٹ، گڑ کی بو، مرچوں کی دھانس
خربزے، الو، کھلی، گیہوں، کدو، تربوز، گھاس
دھوپ کی شدت، ہوائی بورشیں، گرمی کی رو
کملیوں پر سُرخ چاول، ٹاٹ کے ٹکڑوں پہ جو
گرم ذروں کے شدائد، جھگڑوں کی سختیاں
جھگڑوں میں کھانستے بوڑھوں کی حلقوں کا دھواں
ماؤں کے کاندھوں پہ بچّے گردنیں ڈالے ہوئے
بھوک کی آنکھوں کے تارے پیاس کے پالے ہوئے
بام و در لرزے ہوئے خورشید کے آفات سے
ہر نفس اک آنچ سی اٹھتی ہوئی ذرّات سے
مرد و زن گردش میں چیلوں کی صدا سنتے ہوئے
جلبلاتی دھوپ کی رو میں چنے بھنتے ہوئے
میان سے موسم کی تیغ بے اماں نکلی ہوئی
پیاس سے انسان و حیواں کی زباں نکلی ہوئی
لو کے مارے بام و در کی روح گھبرائی ہوئی
دوستوں کی شکل پر بیگانگی چھائی ہوئی
یوں شعاعیں سایۂ اشجار سے چھنتی ہوئی
بے مروت کی سپاٹ آنکھوں کی جیسے روشنی
آسماں پر ابر کے بھٹکے ہوئے ٹکڑوں کا رم
نفخ میں مسک کا جیسے وعدۂ جود و کرم
ہر روش پر چڑچڑاپن، ہر صدا میں بے رخی
ہر جگہ ٹھنٹنا ہوا، ہر کھوپڑی تپتی ہوئی
سر پہ کافر دھوپ جیسے روح پر عکسِ گناہ
تیز کرنیں جیسے بوڑھے سود خواروں کی نگاہ

آدمی نامہ

(۱)

گو رفعتوں میں چرخ سے بالا ہے آدمی
ہر شے سے کائنات کی اعلیٰ ہے آدمی
محرابِ زندگی کا اجالا ہے آدمی
لیکن ابھی تو طفلِ دو سالا ہے آدمی

اب تک تو خاک چھاننے والا ہے آدمی

(۲)

اس آدمی کا تجھ سے کہوں کیا میں کیف و کم
اک آن میں ہے سبز، تو اک آن میں بھسم
تریاق ہے جو صبح کو، تو شام کو ہے سم
منعم ہو تو ہے غیر کا بھی خویش محترم

مفلس ہے تو گدھے کا بھی سالا ہے آدمی

(۳)

قوت میں بے نظیر ہے صولت میں فرد ہے
عزت میں بے مثال ہے، طاقت میں فرد ہے
اعزاز و احترام و جلالت میں فرد ہے
پیسہ ہے جیب میں تو شرافت میں فرد ہے

پیسہ اگر نہیں تو نرالا ہے آدمی

(۴)

کس کو خبر کہ دیو تہمتن بنے گا کب
شاہینِ زندگی کا نشیمن بنے گا کب
طاقت کا اس زمین پہ مامن بنے گا کب
کیا جانئے کہ فاتحِ آہن بنے گا کب

اب تک تو صرف روٹی کا گالا ہے آدمی

(۵)

اب تک تو آستانِ حماقت ہے اور سر
اب تک تو خیر سست ہے اور تیز گام "شر"
اب تک تو پھر رہا ہے دل و ذہن اِدھر اُدھر
ہر دیوِ کامیاب کی خوراک ہے بشر

ہر دیوِ کامراں کا نوالا ہے آدمی

(۶)

انساں وہ گل ہے جو اب تک کھِلی نہیں
وہ شاخ ہے صبا سے جو اب تک ہلی نہیں
پوشاک ہے یہ وہ جو ابھی تک سِلی نہیں
کنجی ہنوز عقل کی اس کو ملی نہیں

جو آج تک ہے بند، وہ تالا ہے آدمی

(۷)

اب تک ہے بزمِ جہل میں ناداں ڈٹا ہوا
اب تک ہے علم و عقل و ہنر میں گھٹا ہوا
اب تک لباسِ ذہن و ذکا ہے پھٹا ہوا
اب تک ہے خاکِ تیرہ سے انساں اٹا ہوا

ہر چند خاکِ تیرہ سے بالا ہے آدمی

(۸)

پروا کسے جو آج ہے دن میں سیاہ رات
کیا غم اگر زمین پہ وا ہے درِ ممات
یعنی بحکمِ دہر و بفرمانِ کائنات
انساں کو آج روند رہے ہیں جو حادثات

کل ان کو جوش روندنے والا ہے آدمی

مرثیہ

حسین اور انقلاب

(چند بند)

ہمراز یہ فسانۂ آہ و فغاں نہ پوچھ
دو دن کی زندگی کا غمِ این و آں نہ پوچھ
کیا کیا حیاتِ اہلِ حق کی ہیں تلخیاں نہ پوچھ
کس درجہ ہولناک ہے یہ داستاں نہ پوچھ
تفصیل سے کہوں تو فلک کانپنے لگے
دوزخ بھی فرطِ شرم سے منہ ڈھانپنے لگے

دنیا کی ہر خوشی ہے غم و درد سے دوچار
ہر قہقہے کی گونج میں ہے چشمِ اشکبار
کیا خار و خس کہ وہ تو ہیں معتوبِ روزگار
نسرین و نسترن میں بھی پنہاں ہے نوکِ خار
نغمے ہیں جنبشِ دلِ مضطر لیے ہوئے
گل برگ تک ہے گردشِ خنجر لیے ہوئے

جس دائرے میں قصرِ قدامت کا ہو طواف
جدت کے جرم کو کوئی کرتا نہ ہو معاف
بگڑے ہوئے رسوم کا ذہنوں پہ ہو غلاف
آواز کون اٹھائے وہاں جہل کے خلاف
آواز اٹھائے موت کی جو آرزو کرے
ورنہ مجال ہے کہ یہاں گفتگو کرے

وہ اہلِ حق کی تشنہ دہاں مختصر سپاہ
باطل کا وہ ہجوم کہ اللہ کی پناہ
وہ ظلمتوں کے دام میں زہرا کے مہر و ماہ
تارے وہ فرطِ غم سے جھکائے ہوئے نگاہ
وہ دل بجھے ہوئے وہ ہوائیں تھمی ہوئی
وہ اک بہن کی بھائی پہ نظریں جمی ہوئی

وہ رات وہ فرات وہ موجوں کا خلفشار
عابد کی کروٹوں پہ وہ بیمارگی کا بار
وہ زلزلوں کی زد پہ خواتین کا وقار
اصغر کا پیچ و تاب وہ جھولے میں بار بار
اصغر میں پیچ و تاب نہ تھا اضطراب کا
وہ دل دھڑک رہا تھا رسالت مآب کا

جو صاحبِ مزاجِ نبوت تھا وہ حسین
جو وارثِ ضمیرِ رسالت تھا وہ حسین
جو خلوتیِ شاہدِ قدرت تھا وہ حسین
جس کا وجود فخرِ مشیت تھا وہ حسین
سانچے میں ڈھالنے کے لیے کائنات کو
جو تولتا تھا نوکِ مژہ پہ حیات کو

جو اک نشانِ تشنہ دہانی تھا وہ حسین
گیتی پہ عرش کی جو نشانی تھا وہ حسین
جو خلد کا امیرِ جوانی تھا وہ حسین
جو اک سخنِ جدید کا بانی تھا وہ حسین
جس کا لہو تلاطمِ پنہاں لیے ہوئے
ہر بوند میں تھا نوح کا طوفاں لیے ہوئے

ہر چند اہلِ جور نے چاہا یہ بارہا
ہو جائے محو یادِ شہیدانِ کربلا
باقی رہے نہ نام زمیں پر حسین کا
لیکن کسی کا زورِ عزیزو نہ چل سکا
عباس نامور کے لہو سے دھلا ہوا
اب بھی حسینیت کا علم ہے کھلا ہوا

تجھ سا شہید کون ہے عالم میں اے حسین
تو ہے ہر ایک دیدۂ پُرنم میں اے حسین
زُہاد ہی نہیں ہیں ترے غم میں اے حسین
ہم رند بھی ہیں حلقۂ ماتم میں اے حسین
آزاد جو خیال میں ہیں اور کلام میں
وہ بھی اسیر ہیں تری زلفوں کے دام میں

یوں تو درونِ سینۂ تاریخِ روزگار
دولت ہے بے حساب جواہر ہیں بے شمار
لیکن ترا وجود ہے اے مردِ حق شعار
عزمِ بشر کی واحد و بے مثل یادگار
تکتا ہے تجھ کو وقت جہاں سوز دور سے
تو ہے بلند ضربِ سنین و شہور سے

پھر حق ہے آفتابِ لبِ بام اے حسین
پھر بزمِ آب و گل میں ہے کہرام اے حسین
پھر زندگی ہے سست و سبک گام اے حسین
پھر حریت ہے موردِ الزام اے حسین
ذوقِ فساد و ولولۂ شر لیے ہوئے
پھر عصرِ نو کے شمر ہیں خنجر لیے ہوئے

مجروح پھر ہے عدل و مساوات کا شعار
اس بیسویں صدی میں ہے پھر طرفہ انتشار
پھر نائبِ یزید ہیں دنیا کے شہریار
پھر کربلائے نو سے ہے نوعِ بشر دوچار
اے زندگی جلالِ شہِ مشرقین دے
اس تازہ کربلا کو بھی عزمِ حسین دے

آئینِ کشمکش سے ہے دنیا کی زیب و زین
ہر گام ایک بدر ہو ہر سانس اک حنین
بڑھتے رہو یونہی پئے تسخیرِ مشرقین
سینوں میں بجلیاں ہوں زبانوں پہ یا حسین
تم حیدری ہو سینۂ اژدر کو پھاڑ دو
اس خیبرِ جدید کا در بھی اکھاڑ دو

اے حاملانِ آتشِ سوزاں بڑھے چلو
اے پیروانِ شاہِ شہیداں بڑھے چلو
اے خانمانِ صرصر و طوفاں بڑھے چلو
اے صاحبانِ ہمتِ یزداں بڑھے چلو
تلوار شمرِ عصر کے سینے میں بھونک دو
ہاں جھونک دو یزید کو دوزخ میں جھونک دو

اے جانشینِ حیدرِ کرار المدد
اے منچلوں کے قافلہ سالار المدد
اے امرِ حق کے گرمیِ بازار المدد
اے جنسِ زندگی کے خریدار المدد
دنیا تری نظیرِ شہادت لیے ہوئے
اب تک کھڑی ہے شمعِ ہدایت لیے ہوئے

آج کل نئی دہلی جوش نمبر

جوش کے چند مرکبات

موجِ کیف پرور۔ نابدفریب۔ گل رُخ۔ کافر دراز مژگاں۔ سیمیں بدن۔ پری رُخ۔ نوخیز۔ حشر ساماں۔ خوش چشم۔ خوش وضع۔ ماہ پیکر۔ نازک بدن۔ شکرلب۔ شیریں ادا۔ فسوں گر۔ گل پیرہن۔ سمن بُو۔ سرو چمن۔ سہی قد۔ رنگیں جمال۔ خوش رو۔ گیسو کمند۔ مہوش۔ کافور فام۔ نظارہ سوز۔ دل کش۔ سرمست۔ شمعِ محفل۔ ابرو ہلال۔ مےگوں۔ جاں بخش۔ روح پرور۔ نسریں تن۔ سیمیں عذار۔ آہو نگاہ۔ نورس۔ گلگوں۔ بہشت سیما۔ یاقوت لب۔ صدف گوں۔ غارت گرِ تحمل۔ دلسوز۔ دشمنِ جاں۔ پروردۂ مناظر۔ دوشیزۂ بیاباں۔ گلشن فروغ۔ ماہ پارہ۔ فتنۂ فریب مژگاں۔ یزداں شکار گیسو۔ جبینِ شمگری۔ درسِ آدمیت۔ شمعِ بزمِ عالم۔ صبح ہوئے خنداں۔ شامِ زلفِ برہم۔ نقشِ دل بری۔ چشمکِ درانع۔ خندۂ بے حجاب۔ نو بہ شکن گلابیاں۔ خلد فروش۔ لرزشِ بادہ۔ گنبدِ قصرِ عیش۔ قلعہ پیکر۔ ہوائے نازنہ۔ شمیمِ زلف۔ لبِ نگار۔ نسیمِ کاکلِ شبگوں۔ فروغِ نرگسِ شیریں۔ خدائے ناز۔

نگاہ شرمگیں۔ نم آلود عارضِ گلنار۔ عارضِ گلرنگ۔ شرمگیں انداز۔ نطقِ شرم آمیز۔

معمورۂ طرب۔ کوئے سرخوشی۔ ذہنِ خرابات مودہ۔ بزمِ رنگ و بُو۔ میکدۂ دوش۔ خمارِ شبانہ۔ طبعِ شبانہ۔

بسترِ حرماں۔ جلوہ گاہِ رنگ و بُو۔ موجِ ربط۔ موجِ گل۔ موجِ صبا۔ جامِ زریں۔ اندازِ نو۔ فیضِ ارتباطِ حسن و عشق۔ زیرِ سایہ۔ شمشیر بپاس۔ شعلہ پرور۔ دورِ ناز۔ صحبتِ ہمراز۔ مکتوبِ رنگیں۔ گوشۂ خلوت۔ تکمیلِ عشق۔ مےافسانہ خوانی۔ بارگاہِ دلبری۔ فرطِ رعب۔ جنبشِ مژگاں۔ زانوئے پُرشوق۔ جلوۂ صہبا۔ موجِ رعنا۔ خاکِ راہِ دوست۔ نقشِ پائے یار۔ پہلوئے جاناں۔ عمرِ فانی۔ حیاتِ جاوداں۔ لرزشِ صہبا۔ التفاتِ یار۔ دورِ طرب آہنگ۔ گوہر فشاں۔

جمودِ شامِ بلا۔ وحشت آفریں۔ خروشِ ہزاراں۔ شعلہ زن۔ عصرِ تغافل گزیدہ۔ مسندِ خیال۔ گرمِ رست خیز۔ منظرِ وہم و خیال۔ التفاتِ فراواں۔ گل بیز۔ گہرریز۔ گہربار۔ گہرتاب۔ نوخواستہ۔ نورس۔ نوطلعت۔ نوخیزِ کم آمیز۔ دل آویز۔ خوش اطوار۔ خوش آویز۔ خوش اندام۔ گل پیرہن۔ ایمان شکن۔ آئینۂ جبیں۔ صبحِ گل نوخواستہ۔ شامِ شگوفہ۔ نگاہِ طرب آمیز۔ بستۂ محویت۔ اندوہناک۔ ظلمتِ سنجیدگی و انہماک۔ عشوۂ ترکانہ۔ ناقدِ تبسم۔ اشکِ مدام۔ خمارِ سردِ نفس۔ کیفِ اشک آشام۔ اشک آمیز بادۂ گل۔ گرسنہ چشم۔ پامالِ شوقِ طفل مزاج۔ گزرگاہِ عشق۔ سیلِ خرام۔ نسیمِ گرہ کشا۔ رشکِ خواص و ننگِ عام۔ اُفقِ دیدہ ہائے گریاں۔ جلوہ گستر۔ پیکِ بزمیت۔ سایۂ کاکل۔ دیدۂ مے پرچم۔ عارضِ شکستہ۔ روئے عرق آلود۔ گیسوئے آشفتہ۔ زانوئے کومنی۔ تقاضائے حسنِ عربدہ جو۔ جراحتِ دلِ صد چاک۔ تیغِ سامعہ خو۔ نزاعِ سنگ و سبو۔ کاوشِ دمِ آہو۔ گرشتہ تسبیحِ قدسیاں۔ زمزمۂ لعلِ دلنشیں۔ موجِ سوز۔ طنبورِ خستگاں۔ گل بانگِ عاشقاں۔ سیلِ آب و آتش۔ موجِ برق و باراں۔ عشقِ گل افشاں۔

تاریکیٔ شامِ مریضانِ کہن۔ آلامِ صبحِ سوگواراں۔ نالۂ غم۔ جنبشِ آہِ تنگ جاں۔ طاقِ عبرت۔ لرزشِ اشکِ گریزاں۔ غرورِ عزم و ہمت۔ نگاہِ فتنہ ساماں۔ سازِ عشرت۔ بارِ حرماں۔ فغاں بر لبِ تبسم۔ آشوبِ دوراں۔ آرزوئے دیدۂ جاناں۔ صباحِ کوہساراں۔ صبرِ فراواں۔ ربِ رنگ و بُو۔ دماغِ فتنہ ساز۔ عقلِ حیلہ ساز۔ فرازِ قلب۔ دولتِ برق و شرر۔ وابستۂ خوابِ گراں۔ سرمنزلِ مہرِ منیر۔ مصحفِ گلزار۔ چراغِ حرمِ غنچگی۔ آئینۂ گلباری۔ موجِ رواں۔ برقِ تپاں۔ سروِ سہی۔ کاکلِ ژولیدہ۔ الہامِ خرامانِ بہار۔ گل گشت۔ فلک تاب۔ چمن ساز۔ لیلائے خیابانِ بہار۔ دل بستۂ وفاموش۔ شب رنگ۔ جہاں امید۔ گہر بیز۔ چشمۂ حیوانِ بہار۔ لعلِ فسوں بار۔ دل آویز۔ شکر ریز۔ لرزشِ دامانِ بہار۔ شمعِ شبستانِ بہار۔ سرحلقۂ رزانِ جہاں۔ قبلۂ خاصانِ بہار۔ شہ خوباں۔ بلائے زندگی۔ آشوبِ دیں۔ غارت گرِ ایماں۔ غذائے مطرباں۔ شہِ ملکِ جمال۔ بہشتِ مرمریں پیکر۔ رباب خیزِ مستاں۔ کلیسائے شمیمِ گل۔ حریمِ نغمۂ تلقل۔ کنشتِ لالہ و سنبل۔ شمعِ وادیٔ ایمن۔ خرمنِ نشتر زن۔ کلیسا کوب۔ کاشی سوز۔ یزداں گیر۔ آفاق کش۔ صدفِ رخسار۔ عرق ریز۔ فتنہ بیز۔ چمن خیز۔ سمن افشاں۔ سمن افسر۔ ناخدائے کشتیٔ صہبا۔ کتابِ دینِ فن کاراں۔ سرورِ عالمِ امکاں۔ طلوعِ طرفِ کہساراں۔ شرارۂ آتشِ جاں سوز۔ شبِ قدرِ قضا سنجاں۔ صبحِ عہدِ سرمستاں۔ نورِ بزمِ ایں و آں۔ انجمِ چرخِ امکاں۔ صدرِ بزمِ رنگ و بو۔ صبحِ دیر۔ شامِ جو۔ نورِ حرم۔ لعلِ بحرِ مدعا۔ دولتِ رنگ و صدا۔ جوہرِ گیتی بہا۔ گوہرِ گردوں۔ حماورد نگاہ۔ مہتابِ یار۔ خورشیدِ عنبر فروش۔ مےچکاں۔ گوہر جبیں۔ مقصدِ بازعا۔ حشمۂ رقص و رقصا۔ شاہدِ ابرو صبا۔ دلبرِ گنگ و جمن۔ شوخیٔ بادِ صبا۔ جنبشِ رنگِ حنا۔ جلوۂ یاسمین۔ آہوئے دشتِ خطا۔ دولتِ مشکِ ختن۔ شعلہ خو۔ یارِ عالم آشنا۔ تیغِ مرہم آشنا۔ مہرِ شبنم آشنا۔ بوئے گلہائے ارم۔ خوئے بادِ صبحدم۔ اوجِ عمرِ تازہ دم۔ موجِ صہبائے کہن۔ معدنِ لعل و گہر۔ مخزنِ شمس و قمر۔ معبدِ شام و سحر۔ کعبۂ سرو و چمن۔ آئینۂ انوار وغیرہ۔

خالقِ کائنات کے اسمائے گرامی اس واحد واحد کی صفاتِ عین الذات

چند خطابات : کے اعتبار سے متعین کیے گئے ہیں۔ مثلاً الخالق۔ القادر۔ الوہاب وغیرہ وغیرہ۔ شعرائے کرام نے اپنے معشوق کو قاتل، ظالم، سنگدل، وعدہ فراموش وحیلہ ساز وغیرہ کے الفاظ سے نوازا ہے۔ یہاں تک کہ جگر مراد آبادی کو کہنا پڑا: ؎

ان شاعرانِ دہر پہ اللہ کی ہو مار — اک پیکرِ جمیل کو قاتل بنا دیا

جوش نے اس پیکرِ جمیل کے جمال و حسن و نازکی کو جن پُرکیف اور حسین و دلکش الفاظ و مرکبات سے مخاطب کیا ہے یا اس کی طرف رہنمائی کی ہے یا اس کو حسن آئینہ حسن میں دیکھا ہے اس کی نظیر ہم عصر شعراء کے کلام میں کمیاب ہے۔ جوش کے کلام سے چند خطابات منتخب کرکے ہدیۂ قارئین ہیں:

سیمیں بدن۔ پری رُخ۔ حشر ساماں۔ کافر ادا۔ گل پیرہن۔ سمن بُو۔ سرو چمن۔ ماہ پیکر۔ نازک بدن۔ شکرلب۔ شیریں ادا۔ فسوں گر۔ رنگیں جمال۔ خوش رو۔ گیسو کمند۔ مہوش۔ کافور فام۔ نظارہ سوز۔ دلکش۔ سرمست۔ شمعِ محفل۔ آہو نگاہ۔ نورس۔ گلگوں۔ بہشت سیما۔ یاقوت لب۔ صدف گوں۔ غارت گرِ تحمل۔ دلسوز۔ دشمنِ جاں۔ پروردۂ مناظر۔ دوشیزۂ بیاباں۔ گلشن فروغ۔ ماہ پارہ۔ چشم و چراغِ صحرا۔ نورِ دشتِ مادری۔ رنگیں جمال دلبری۔ شاہدِ عشق نواز۔ دلدارِ شیریں۔ نگارِ شرمگیں۔ دخترِ ترنم۔ زہرہ جمال۔ جنتِ ابر و باد۔ نرگسِ مخمور۔ عیسیٔ دوراں۔

پیغمبر حرماں ۔ میکدہ ساماں ۔ ماہِ درخشاں ۔ دولتِ بیدار ۔ پردہ نشینِ حرمِ ناز و نعم۔ تابِ ماہ و انجم۔ شمعِ طاقِ دوراں ۔ بدرِ چراغِ ترکاں ۔ شاہ شکر فرشاں ۔ نورِ عقدِ پرویں ۔ بنتِ ماہِ تاباں ۔ دولتِ بہاراں ۔ دلدارِ غنچہ طبع ۔ یارِ صبا خصائل۔ ماہِ بتاں ۔ شاہِ خوباں ۔ آہوئے قدس ۔ متاعِ ایمانِ بہشت پیماں ۔ بتِ خوباں ۔ خدائے مطرباں ۔ نورِ بزمِ ابن و آں ۔ انجمِ چرخِ مکاں ۔ شمعِ محرابِ زماں ۔ مشعلِ طاقِ زمن ۔ دلبرِ آئینہ رو ۔ خسرو و شیریں سخن ۔ لعلِ بحرِ مدعا ۔ دولتِ رنگ و صدا ۔ جوہرِ گیتی بہا ۔ گوہرِ گردوں شکن ۔ مہتاب بار ۔ خورفشاں ۔ عنبر فروش ۔

مژگاں ۔ گوہر جبیں ۔ مقصدِ ناز و ادا ۔ چشمۂ رقص و نغمہ ۔ شاہدِ ابروہوا ۔ دلبرِ گنگ و جمن ۔ آہوئے دشتِ خطا ۔ دولتِ مشکِ ختن ۔ بوئے گلہائے ارم ۔ جوئے بادِ صبحدم ۔ موجِ صہبائے عجم ۔ معدنِ لعل و گہر ۔ مخزنِ شمس و قمر ۔ معبدِ شام و سحر ۔ کعبۂ سرو سمن وغیرہ

بشکریہ "آگہیۂ فنِ شعر" میں

جناب شبیر حسن خاں جوشؔ ملیح آبادی کی ایک جھلک

تالیف : سید حسن رضا حسن ،

کراچی (پاکستان)

اقوالِ جوشؔ

- محبت نوعِ انسانی کا وہ سب سے بڑا اور سب سے قوی جذبہ ہے جس کے سامنے تمام جذبات سربسجود نظر آتے ہیں ۔
- سوسائٹی بھی کتنی ثقاوت آمیز شرارت کا نام ہے ۔
- زمانہ سب سے زیادہ محبت کی داستانوں کو دہراتا ہے
- جب کسی قوم کے دن بُرے آتے ہیں تو وہ عقل کی باتوں پر عمل کرنا چھوڑ دیتی ہے ۔
- زمانہ کبھی اچھا یا بُرا نہیں ہوا کرتا بلکہ یہ افراد ہیں جو زمانے کو اچھا یا بُرا کہا کرتے ہیں۔
- اچھے وہ لوگ ہیں جنہیں اپنے عہد کی نبض دیکھنا اور اپنے عصر کے قلب کی ضربیں شمار کرنا آتا ہے اور بُرے وہ لوگ ہیں جنہیں زمانے کو گالیاں دینے کے علاوہ ان دونوں میں سے ایک بات بھی نہیں آتی۔
- ہمارے علمی رجحانات جس قدر وسیع ہیں ، اسی وسعت کے ساتھ کھوکھلے اور سطحی بھی ہیں۔
- علم جس وقت تک کہ صرف "معلوم" کی حد تک ہے ، اُسے کوئی درجہ نہیں دیا جا سکتا ۔ البتہ جب وہ "معلوم" کی منزل سے گزر کر "محسوس" کے دائرے میں آ جاتا ہے تو اُس وقت وہ دنیا کی سب سے بڑی عزت کا مستحق ہو جاتا ہے ۔
- جب ہم اس قابل ہو جاتے ہیں کہ جینا شروع کریں تو اسی وقت ہمیں موت آ جاتی ہے۔
- "ناقصِ ہزار فن" سے "کاملِ یک فن" کا مرتبہ زیادہ بلند اور زیادہ ارفع ہوتا ہے۔
- میری کتابِ حیات ایک کھلی ہوئی کتاب ہے ۔ جہاں سے چاہو ورق الٹ لو ۔ میری کتاب میں کوئی 'بابُ الاسرار' موجود نہیں ہے ۔
- ہوائیں بھی کبھی بند ہو جایا کرتی ہیں ۔ مگر دھڑکنے والے دل کو ایک لمحے کے سکون کا بھی علم نہیں۔
- زمانہ خوب جانتا ہے کہ حُسن جب وفا اور کرم سے کام لے تو اُس کا مارا ہوا پانی تک نہیں مانگ سکتا۔
- زبان ایک کنوار خادمہ ہے جو پیتل اور تانبے کے برتن کو راکھ سے مانجھ سکتی ہے ۔ مگر چینی اور شیشے کے ظروف توڑ ڈالتی ہے ۔
- غریب انسان ۔ مشیت کا سوتیلا بیٹا انسان
- ہر شاعر موزوں طبع ہوتا ہے ۔ لیکن ہر موزوں طبع شاعر نہیں ہوتا ۔
- جس کا تخیل وسیع ہوتا ہے ، اس کا دائرۂ علم تنگ ہوا کرتا ہے
- ذہانت و عسرت کا سنگم کتنا خطرناک ہوا کرتا ہے ۔
- وہ غصہ قابلِ قدر نہیں ہے جس کی بنیاد محبت پر قائم ہو
- ہر معمولی سا واقعہ بھی ایک زبردست سانحہ اور ہر چھوٹی سی بات بھی ایک عظیم حادثہ ہے ۔
- ہر وہ بات جو تمہارے مزاج کے خلاف ہو ، لازمی نہیں کہ ہمیشہ غلط ہی ہو۔
- اگر سچائی شہد کے سامنے پیش کر دی جائے تو اُس کا مزہ بھی کڑوا ہو جائے ۔
- شاعر کا مکان الفاظ کی عبادت گاہ ہے ، جہاں ادنیٰ و اعلیٰ اور شاہ و گدا ہر قسم کے الفاظ ایک ہی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔
- تمول و استبداد کا ازل سے یہ چلن رہا ہے کہ وہ اپنے سے بہتر افراد کو اپنے قریب پھٹکنے بھی نہیں دیتا ۔
- قانون سرمایہ داروں کا ایک کھلونا ہے اور کچھ نہیں ۔
- حقیقی لیڈری خود اپنے ہی خون میں نہانے کا نام ہے ۔
- دولت کی ناروا تقسیم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا کے تمام فتنوں کی جڑ ہے ۔
- تحقیقی کفر بہتر ہے ، تقلیدی ایمان سے اور امن پرور بے دینی کو تفوق حاصل ہے فساد انگیز دین داری پر۔
- قدرت نے انسانی فطرت کو شر کا مادہ خیر کے مقابلے میں مقدارِ کثیر ودیعت فرمایا ہے ۔
- نشہ ہر اُس کیفیت کو کہتے ہیں جو خون کی رفتار کو تیز کر کے جذبات میں ایک گرمی اور اُبھار پیدا کر دے ۔

مرسلہ :

ملک محمد اسماعیل خاں ، شاہجہاں پور

(زیرِ اشاعت کتاب : "جوش کے مقالات")

معاصر اہلِ قلم کے بچھڑنے پر

اختر شیرانی، مسز سروجنی نائیڈو، ناطق گلاؤٹھی، سیماب اکبر آبادی،
آرزو لکھنوی، حسرت موہانی، نہال سیوہاروی، ترنم اکبر آبادی اور
گاندھی جی کی شہادت کے بعد پہلی جینتی

ایں ماتم سخت است :

موت، انسانی غرورِ علم و عقل پر کس قدر کاری ضرب ہے۔ موت عالمِ انسانیت کی کتنی زبردست توہین ہے —— یہ ایک ایسی مکمل اور قطعی مایوسی ہے جس کو امید کبھی اور کسی عالم میں بھی چھو نہیں سکتی۔ موت انسانی بیچارگی کا کتنا ہولناک مظاہرہ ہے ——

یہ سچ ہے کہ اگر دو چار صدیوں میں نہیں تو کروڑوں سال کے بعد سہی، ہم ایک نہ ایک دن موت کو زیر کر کے اُسے موت کے گھاٹ اُتار کر دم لیں گے۔ لیکن جب تک یہ صورتِ حال پیدا نہیں ہوتی ہمیں چار و ناچار مرتے ہی رہنا پڑے گا۔

موت یوں تو کسی کی بھی ہو، قابلِ ماتم ہے۔ لیکن ہمارے محبوب شاعر اختر شیرانی کی موت ایک ایسا زبردست سانحہ ہے جس پر صبر اور جسے برداشت نہیں کیا جا سکتا۔

اس موت نے ہمارے قصرِ شاعری کے اُس بلوریں منارے کو گرا دیا ہے جس کے شمسۂ زریں پر ہلالِ عید جھلکتا اور ابرِ بہار مچلتا تھا۔

مرحوم اختر کی شاعری (اختر کے سے پیارے دوست اور گل چکاں شاعر کو "مرحوم" لکھتے وقت دل سے خون کی بوندیں ٹپک رہی ہیں) ایسی شاعری نہیں کہ اس پر چند سطروں میں خامہ فرسائی کی جا سکے۔ وہ کیا تھا اور کیا کچھ ہو سکتا تھا اسے ایک دفتر درکار ہے۔

اختر ایک ایسا بے نظیر مطرب اور ایک ایسا عدیم المثال رومانی شاعر تھا کہ صدیوں کے بعد ایسے شاعر پیدا ہوا کرتے ہیں۔

سال ہا باید کہ یک صاحب دلے پیدا شود!

یوں تو شاعر بہت ہیں، لیکن اختر اُن چند مستثنیٰ شاعروں میں سے تھا جس کا تمام وجود اور جس کی تمام شخصیت شاعری میں غرق اور اس قدر غرق تھی کہ اس کی پلکوں کی جنبش اور اس کے انفاس کی آمد و شد تک شعریت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔

کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو اختر کی لاابالی زندگی پر اعتراض کیا کرتے تھے۔ مگر وہ مردِ خدا اُن اعتراضات کا ذرہ برابر بھی اثر قبول نہیں کرتا تھا، اس لئے کہ اس پر یہ حقیقت عیاں تھی کہ وہ ایک دہکتا ہوا ہیرا ہے اور بے چارے معترضین اسے اپنی ترازو میں تولتے ہیں۔ اُس ترازو میں جو صرف کوئلوں کو تول سکتی ہے۔

اختر کی شاعری میں صبحِ کوہسار کا دھندلکا اور شامِ بہار کا جھٹ پٹ ایسی رومانہ صنعت کے ساتھ سمویا ہوا تھا کہ آدمی خوابوں کے جزیرے میں پہنچ جاتا تھا۔

اس رندِ خوش اوقات کی شاعری سراسر تبسم و شگفتگی تھی۔ وہ غزل گویوں کی طرح بسورتا نہیں تھا۔ اُس کی شاعری پھولوں کا ایسا شامیانہ تھی جس میں نشاط کے کنول جلتے تھے، شباب کا عود سلگتا تھا اور دوشیزگی کی بلبلیں چہکتی رہتی تھیں۔

ایک وہ بے پروا رند، ایک بدمست مجذوب اور ایک عاشق مزاج مغنی تھا۔ وہ سلمیٰ کی پازیب کی جھنکار پر رقص کرنے والا، شہر کی گلیوں میں رسوا ہونے والا، ننگ و نام کے تصورات کو ٹھکرانے والا، حریمِ خرابات میں گونج پیدا کرنے والا، بزمِ خوباں میں جھکنے بہکنے والا اور "اے عشق کہیں لے چل" کا نعرہ لگانے والا بے پروا خرام شاعرِ حسن و شباب تھا —— اور صد حیف کہ آخرکار "اے عشق کہیں لے چل" کا وردِ بے پایاں اُسے اپنے ساتھ کہیں ایسی نامعلوم جگہ اُڑا کر لے گیا جہاں ہم اُس وقت تک نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ سانس لے رہے ہیں۔

آہ بلبلِ ہند :

آسماں را حق بود، گر خوں ببارد بر زمیں

آج کا دن کس قدر منحوس ہے کہ میں مسز سروجنی نائیڈو کی موت پر خامہ فرسائی کر رہا ہوں —— ابھی ایک عشرے کی بات ہے کہ وہ دہلی آئی تھیں اور یہ وعدہ کر کے رخصت ہوئی تھیں کہ چھٹی مارچ کو واپس آئیں گی اور ساتویں آٹھویں مارچ کو ڈاکٹر تارا چند کے وہاں ایک مختصر سا ادبی اجتماع ہوگا، لیکن ظالم موت نے یہ وعدہ وفا ہونے نہیں دیا۔

میں مرحومہ کے انتقال کے دن لکھنؤ میں تھا۔ دوسری مارچ کی صبح کو جب کہ میں مرحومہ سے ملاقات کی خاطر گورنمنٹ ہاؤس کی طرف روانہ ہونے والا تھا، ایک میرے دوست پرنس میرزا عالمگیر قدر نے مجھے یہ خبر سنائی کہ مسز نائیڈو کا انتقال ہو گیا۔ یہ بدترین خبر سنتے ہی زمین میرے پاؤں کے نیچے سے نکل گئی۔ گھبرایا ہوا گورنمنٹ ہاؤس پہنچا اور دیکھا، آہوں اور آنسوؤں کے ساتھ دیکھا کہ جس کمرے میں ایک ماہ پیشتر اُن سے ملاقات ہوئی تھی اس میں وہ ابدی

نیند سو رہی ہیں۔ ان کی لاش کے سرہانے پنڈت جواہر لال، اُن کی صاحبزادی اندرا اور مرحومہ کی بیٹی پدمجا۔ یہ سب نقش بدیوار کھڑے تھے۔ میری آنکھیں ان سب سے دوچار ہوئیں اور جھک گئیں۔ مرحومہ کے چہرے کو میں نے غور سے دیکھا پھول چڑھائے اور رخصت ہو گیا۔

رخصت ہوتے ہوئے میں نے دل کو بہت سنبھالا۔ لیکن ہچکیوں اور آنسوؤں کا طوفان برپا ہو گیا

مرنے والی کی کس کس صفت پر آنسو بہاؤں۔ وہ نادرہ بھی تھیں، خطیبہ بھی تھیں اور شاعرہ بھی۔ اور ان سب سے زیادہ وہ حقیقی معنی میں ایک صاحبِ دل انسان بھی تھیں۔

اُن کی جرأت، اُن کا جذبۂ خیر و خدمت، اُن کی ثقافتی شیرینی، اُن کے لہجے کا زیر و بم، اُن کی ظرافت و بذلہ سنجی، اُن کا ذوقِ ایثار، اُن کی بے پایاں وضعداری، اُن کی ادب پرستی اور اُن کی شاعر نوازی۔ یہ اُن کے ایسے مخصوص اوصاف تھے کہ ہندوستان کی کوئی خاتون اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔

میری اور مرحومہ کی ملاقات پچیس تیس سال کی تھی۔ اس طویل دورِ ملاقات میں اُن کی زندگی کے ہر رُخ کو میں نے دیکھا تھا اور اُن کے متعلق مجھے اس قدر معلومات ہے کہ میں اُن کے باب میں ایک دفتر لکھ سکتا ہوں، لیکن اس وقت میرے دل و دماغ کی وہ کیفیت ہے کہ ان چند سطروں کا لکھنا بھی دشوار معلوم ہو رہا ہے اور میرا خیال ہے کہ یہ چند سطریں جو میں سپردِ قلم کر رہا ہوں 'بے ربط' ہو کر رہ گئی ہیں۔

مرحومہ اس پورے ہندوستان میں میری سب سے بڑی محسنہ تھیں۔ میں اُن کی موت پر اُس وقت تک روتا رہوں گا جب تک کہ موت میری پلکوں کو ہمیشہ کے لئے خشک نہیں کر دے گی۔

افسوس کہ ہندوستانی شاعروں کا اب کوئی قدردان باقی نہیں رہا۔ اس پورے برِ اعظم میں نہ کوئی مرد ہی نظر آتا ہے نہ کوئی عورت ہی دکھائی دیتی ہے جو مسز سروجنی نائیڈو کی طرح شاعروں کی قدر کرے اور اُن کے 'ناز' اُٹھائے۔

اک شمع رہ گئی تھی' سو وہ بھی خموش ہے

ایک اور چراغ گُل ہو گیا:

حیف صد حیف کہ حضرت ناطق کا بھی انتقال ہو گیا۔ کیسی عبرتناک صورتِ حال ہے کہ مولانا مسکی کی موت پر رونے والی آنکھیں ابھی خشک نہیں ہوئی تھیں کہ مزید اشکباری کے واسطے یہ سانحہ پیش آ گیا۔

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں

اس سیاسی گرداب اور اس عمرانی بحران میں کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ کون صاحبِ کمال دم توڑ رہا ہے اور کون صاحبِ کمال رخصت ہو گیا۔

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام

حضرت ناطق جس علمی اور فنی تبحر کے مالک تھے، اس کی نظیر اب کہیں نہیں مل سکتی۔ ایک زمانے میں جب کہ انتقاد کا یہ انداز نہیں تھا حضرت ناطق کی تنقیدیں حکیم ناطق کی طرح صاف جاتی تھیں اور اس سلسلے میں جو کچھ اُن کے قلم سے نکل جاتا تھا۔ اربابِ ادب اُسے ایک سند سمجھ کر سر آنکھوں پر رکھتے تھے۔

یہ کس قدر قلق کی بات ہے کہ ہمارے قدیم بساط کے مُہرے ایک ایک کر کے اُٹھتے چلے جا رہے ہیں اور نژادِ نو میں کوئی ایسا نظر نہیں آتا جو اُن کی خانہ پُری کر سکے۔

کس سے کہوں ان جانے والوں کو دیکھ دیکھ کر میرا دل کیا کہتا ہے۔

بوئے گل و رنگِ گل ہوتے ہیں ہوا دم میں
کیا قافلہ جاتا ہے، اگر تُو بھی چلا چاہا

سانحۂ عظیم:

کس کس کو روئیں، یہ آنکھیں شاید اب رونے ہی کے لئے وقف ہو کر رہ گئی ہیں۔ اکابرِ ادب اس قدر جلد جلد رخصت ہو رہے ہیں کہ ایک بساطِ ماتم اُٹھاتے ہی دوسری بساطِ ماتم بچھانا پڑتی ہے۔

حیف صد حیف کہ سیماب صاحب بھی ہم سے بچھڑ گئے۔ ہم سے روٹھ کر چلے گئے۔ سیماب صاحب کو میں ایک قابلِ قدر شاعر کی حیثیت سے مانتا اور ایک پرانے دوست کی حیثیت سے چاہتا تھا۔ اُن کی موت نے میرے دماغ پر بھی ضرب لگائی اور دل کو بھی زخمی کر دیا۔

صرف ایک درد دل ہو تو آ جائے صبر جوش
جب ہوں دماغ میں بھی خراشیں تو کیا کریں

ابھی زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا کہ میری اُن سے ملاقات ہوئی تھی۔ کس محبت سے ہم دونوں ملے اور کس دلچسپی سے ہم نے ماضی کی داستانیں چھیڑی تھیں۔ وہ آخری صبح اب تک میری آنکھوں کے نیچے پھر رہی ہے اور وہ باتیں اب تک میرے کانوں میں گونج رہی ہیں۔

محفل میں اب تین چار ہی پرانی صورتیں نظر آ رہی ہیں۔ سوچتا ہوں کہ طوالتِ عمر میرے ساتھ یہ خطرناک کھیل کھیلے گی کہ محفل کی محفل خالی ہو جائے اور میں باقی رہ جاؤں گا۔ اگر قضا و قدر نے خدانخواستہ میرے ساتھ یہ کھیل کھیلا تو میں زندہ درگور ہو کر رہ جاؤں گا۔ کروڑوں دوزخوں کا عذاب قبول ہے مجھے، لیکن یہ نہیں چاہتا کہ اب کسی دوست کی موت سے دوچار ہوں۔

اپنے کو فریبِ عیش دیتے دیتے
سر گھوم رہا ہے ناؤ کھیتے کھیتے
اُف جہدِ حیات تھک چکا ہوں معبود
دم ٹوٹ چکا ہے سانس لیتے لیتے

ایک اور صاحبِ کمال اُٹھ گیا:

انتہا ہو چکی خستہ حالیوں اور نارسائیوں کی — محفلِ ادب تیزی کے ساتھ خالی ہوتی چلی جا رہی ہے۔ تند ہواؤں کے جھونکے بار بار آ رہے ہیں اور شمعیں ایک ایک کر کے جلد بجھ رہی ہیں۔ ایک کی بساطِ ماتم ابھی مشکل سے اُٹھنے پائی

ہے کہ دوسرے کی بساطِ عزا فوراً بچھا دی جاتی ہے۔ ایک کی موت پر ابھی آنسو تھمنے بھی نہیں پاتے کہ دوسرے کی میت پر دوبارہ اُبلنے لگتے ہیں۔

ابھی سیماب صاحب کی جدائی کا زخم ہرا ہی تھا کہ آرزو صاحب کی مفارقت نے دل میں ایک تازہ گھاؤ ڈال دیا۔

آرزو صاحب کو میں بچپن سے جانتا تھا۔ وہ میرے والد مرحوم کے روز آنے جانے والے بے تکلف دوست حضرت جلال لکھنوی کے شاگرد رشید تھے۔

الفاظ کی تحقیق، لغات کی پرکھ، فنِ شعر کے نکات، زبان کا آتار چڑھاؤ، اصوات کا زیر و بم اور عروض کی دقیقہ سنجیوں میں وہ ایک زبردست مجتہد اور قدیم ادب سے وابستگی کے باوجود فن اور زبان کے مسائل میں وہ ترقی پسندانہ خیالات کے حامل تھے۔

زندگی کے اس دورِ آخر میں اُن کا خیال تھا کہ وہ اُردو کے قواعد و لغت کو ایک نئے اسلوب اور سائنٹیفک طرز سے مدوّن کر دیں۔ لیکن افسوس کہ زندگی نے وفا نہیں کی اور یہ عظیم الشان کارنامہ ؎

"اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"

بن کر رہ گیا۔

اب یہ آرزو شاید کبھی نہیں نکل سکے گی۔ اس لئے کہ ہماری نئی پود میں نہ وہ علم ہے نہ وہ بصیرت اور پرانی نسل میں اب ہے کون؟

آں سبو بشکست و آں ساقی نہ ماند

ابھی ایک ہفتہ ہوا کہ لکھنؤ میں یہ خوش خبری سنی تھی کہ آرزو صاحب کا کراچی ریڈیو میں تقرر ہو گیا ہے۔ کسے معلوم تھا کہ یہ خوش خبری ؎

"خوش درخشید ولے دولتِ مستعجل بود"

ہو کر رہ جائے گی اور اس خوش خبری کو حضرتِ آرزو کی خبرِ مرگ بہت جلد ماتمی لباس پہنا دے گی۔

کراچی کی خاک کو کیا معلوم کہ اس کے آغوش میں وہ گنجِ گراں مایہ دفن ہوا ہے، جسے حریمِ لکھنؤ کی آسماں بدوش زمین نے پیدا کیا اور فضائے ادب پر آسمان کی طرح دمکایا تھا۔

جہاں تک آرزو صاحب کی آخری دردناک زندگی کا تعلق ہے، موت اُن کے حق میں آیۂ رحمت ثابت ہوئی۔ اس لئے کہ

مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دُور

رکھ لی مرے خدا نے مری بے کسی کی شرم

لیکن اُن کے قدرداں اور مرتبہ شناس ہم عصروں کے ساتھ اُن کی موت نے کیا سلوک کیا۔ اس کی شرح ناممکن ہے کہ ان باتوں کو :-

آدمی محسوس کر سکتا ہے کہہ سکتا نہیں

بہر حال اس سیاسی بحران کے دورِ ناقدری میں صاحبِ کمال کا مر جانا ہی اس کی زندگی ہے، اور جو لوگ ابھی زندہ ہیں وہ ہر میت کو دیکھ کر کہہ رہے ہیں ؎

کیا قافلہ جاتا ہے جو تُو بھی چلا جاتا

اے خاکِ پاکِ لکھنؤ یہ تیری کتنی عبرت ناک بدبختی ہے کہ تیرے صاحبانِ کمال، معاش سے تنگ آ کر، زندگی میں بھی تجھ سے دُور، بہت دُور ہو جاتے ہیں اور مر کر تجھ میں دفن بھی نہیں ہونے پاتے۔

غنی روزِ سیاہِ پیرِ کنعاں را تماشا کن

کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را

واحسرتا:

MAULANA HASRAT DEAD

چودھویں مئی کے "اسٹیٹسمین" کی سُرخی پڑھتے ہی دل سے خون کی بوندیں ٹپک پڑیں۔ آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا۔ سر جھکانے لگا اور دل پر، اس نامراد دل پر جس میں اب جان باقی نہیں رہی ہے، کچھ ایسی ناقابلِ شرح قسم کی چوٹ لگی کہ اس منحوس خبر کی تفصیل پڑھے بغیر میں نے اخبار میز پر رکھ دیا اور دونوں ہاتھوں سے کلیجہ پکڑ کے بیٹھ گیا۔

اُردو بے یار و ناصر اردو کا ستارہ گردش میں آ چکا ہے —— موت نے اُسے اپنے شکار کی خاطر منتخب کر لیا ہے۔ نہیں، اب مشاہیرِ اُردو میں سے کوئی نہیں بچے گا —— اب کوئی نہیں بچے گا —— ایک متنفس بھی نہیں بچے گا ——

اچھا اگر قضا و قدر کا یہی منشا اور لیل و نہار کا یہی فرمان ہے تو کوئی پروا نہیں۔ سرِ تسلیم خم ہے۔ بہت اچھا، اُتار دیا جائے تمام بدنصیبوں کو موت کے گھاٹ، اس لئے کہ مر جانا کہیں بہتر ہے جینے سے۔

اس مرگِ طویل النزع کے ہولناک دور میں، جب کہ ہر شاعر و ادیب ادیب اپنا جنازہ خود اپنے دوش پر اُٹھائے پھر رہا ہے۔ موت اور صرف موت ہی وہ تنہا چیز ہے جس سے جمعیتِ خاطر اور قدر افزائی کی اُمید وابستہ کی جا سکتی ہے۔

بے شک ہماری تمام بہترین اُمیدیں اب موت ہی پر منحصر ہو کر رہ گئی ہیں اور یہ منزل "منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید" وہ اُمید کش منزل ہے، جہاں نغمۂ حیات کی بالیدگی کا تو کیا ذکر، نوحۂ ممات بھی پورا نہیں ہو سکتا۔ اور جی بھر کر ہنسنا تو درکنار، دل کھول کر رویا بھی نہیں جا سکتا ——

کیوں کہ اس منزل میں مرنے والے کی میت پر جب ماتم کیا جاتا ہے تو ابھی ماتم کی ابتدا ہی ہوتی ہے کہ یکا یک اس مرنے والے کی زندگی کی دردناکیاں ذہن میں اُجاگر ہو جاتی ہیں اور ان کے اُجاگر ہوتے ہی دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید ہمارا یہ ماتم سفا کانہ خود کامی کے سوا کچھ اور نہیں۔ کیوں کہ ہم مرنے والے کے طلائے زندگانی سے نجات پا جانے پر آنسو بہا رہے ہیں اور اس خیال کے ساتھ ہی ہمارے نالہ و شیون کی نبضیں ساقط ہو کر رہ جاتی ہیں۔

بار بار دل کہتا ہے میاں کون سے لڈو بٹ رہے ہیں اس نامراد زندگی میں کہ کسی کی موت پر ماتم کیا اور کسی کی درازیٔ عمر کی دعا کی جائے۔

کس قدر عبرت انگیز ہیں مر جانے والے بہ اقساط مرنے والے، کہ اپنی آخری قسط ادا کر کے روپوش ہو گئے ہیں اور کس حد کے بدبخت ہیں وہ لوگ جن کی قسطیں ابھی ادا نہیں ہوئی ہیں اور آج بھی رسوائی و بے چارگی کے راستوں پر بیٹھے نظر آ رہے ہیں۔

حسرت موہانی اپنی آخری قسط ادا کر کے شاہراہ "ناقدری و انگشت نمائی" سے اٹھ کر وہاں چلے گئے ہیں، جہاں خدا کے فضل و کرم سے ہم سب کو جانا ہے —

اگر مجھ پر عقل کی فرماں روائی ہوتی تو میں حسرت کی قیدِ حیات و بندِ غم سے رہائی پا جانے پر ایک جشن کا اہتمام کرتا اور شادیانے بجاتا۔ لیکن ایک مدتِ دراز کی مشقِ عقل کے باوجود میں ابھی تک جذبات کا غلام اور مردِ خام ہوں، اس لئے حسرت کے پابجولاں وجود کی وہ زنجیرِ گراں جو زمین پر اتری ہوئی پڑی ہے۔ میری رگ رگ میں شیون کی ایک گونج اور فریاد کی ایک جھنکار پیدا کئے ہوئے ہے۔

حسرت کی شخصیت و شاعری کے باب میں کیا لکھوں۔ کون نہیں جانتا کہ میرا یہ مرحوم پڑوسی اگر سیاست کے میدان میں ایک سرفروش مجاہد تھا تو ادبیات کے گلستاں کا بلبلِ ہزار داستاں تھا۔

حسرت صاحب دھن کے پکے، بات کے دھنی، وضع کے پابند، قناعت کے مرکز اور اصول پرستی کے پیغامبر تھے اور ان کی شاعری میں ماضی و حال اس طرح سمویا ہوا ہے کہ قدامت پرست اور جدت پسند دونوں ان کے مداح تھے۔

سیاست شریف آدمیوں کا پیشہ نہیں۔ لیکن یہ حسرت ہی تھے کہ اس کوئلے کی دلالی میں عمرِ عزیز گنوا دی اور مرتے دم تک بے داغ رہے اور تمام زندگی تمام طاغوتی دیوتاؤں کو للکار للکار کر کچلتے رہے۔

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو آئے، کرے شکار مجھے

شاید لوگ ابھی بھولے نہ ہوں گے انہوں نے کانگریس کے پلیٹ فارم سے سب سے پہلے "آزادیٔ کامل" کا آوازہ بلند کیا تھا —— اور یہ وہ وقت تھا کہ آزادیٔ کامل کے تصور سے بھی عوام تو عوام خواص تک کانپ اٹھتے تھے۔

قیدِ فرنگ کے مسلسل شدائد میں بھی انہوں نے "مشقِ سخن" کو جاری رکھا اور چکّی کی آواز سے تال کا کام لیا۔ اس لئے کہ وہ "ایک طرفہ طبیعت" کے آدمی تھے۔

انسان کی تمام زندگی اور اس کی زندگی کے ہر ایک دقیقے کو نگل کر ڈکار تک نہ لینے اور مزید وقت کا تقاضا کرتے رہنے والی سیاسی مصروفیتوں کے لانہایت اور کارواں در کارواں ہجوم میں جب کہ سر کھجانے کی فرصت بھی میسر نہیں ہوتی، حسرت کے ذوقِ سخن کا کام جاری رہنا کچھ ایسی بات معلوم ہوتی ہے جسے خرقِ عادت یا کرامت نہیں بلکہ معجزہ کہا جا سکتا ہے۔

برکفے جامِ شریعت برکفے سندانِ عشق
ہر ہوسناکے نہ داند جام و سنداں باختن

اور ان تمام غیر معمولی خصوصیات کے دوش بدوش سب سے بڑی بات یہ تھی کہ حسرت موہانی حقیقی معنی میں ایک انسان بھی تھے۔ وہ راست افکاری، راست گفتاری، راست کرداری، علم و بردباری، اصول پرستی، جوانمردی، قناعت دوستی، محبت نوازی، خودداری اور خلوص پروری کے ایک ایسے اوتار تھے کہ اگر فرشتوں کا وجود ہوتا اور ان میں وہ تمام اوصاف ہوتے جو ان سے منسوب کئے جاتے ہیں تو حسرت کی چوکھٹ پر سجدہ کرنے سے ان کی پیشانیاں شمس و قمر بن کر دمک اٹھتیں۔

کس قدر ترس آتا ہے مجھے اپنی بے چارگی پر کہ محفل دھیرے دھیرے خالی ہوتی چلی جارہی ہے اور قافلوں پر قافلے گزرتے چلے جارہے ہیں۔ لیکن میں فرشِ حیات پر پاؤں پھیلائے بیٹھا ہوا ہوں۔ حالانکہ خیمۂ احباب سونا ہو چکا ہے۔ بجھی ہوئی شمعوں کا دھواں فضا میں گونجا ہوا ہے۔ پروانوں کی خاک تک اڑ چکی ہے۔ مگر میں اب تک اطمینان کے ساتھ بیٹھا ہوا ہوں۔ یہ مجبوری ہے، بے حسی ہے یا بے کسی۔ کیا معلوم۔ میرے سر پر کتنے محبوب دوستوں کی خاکِ گور جمی ہوئی ہے اور میرے بالوں میں کتنے یارانِ رفتہ کے کفن کی سفیدی جھلک رہی ہے، لیکن میں اٹھنے کا نام نہیں لیتا۔

قدرت کی سفاکی شاید یہ چاہ رہی ہے کہ مجھے "اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو" کی اس منزل میں ہلاک کرے جب کہ میری برادری والوں میں سے ایک بھی مجھ پر رونے کے واسطے باقی نہ رہے۔

قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

ہائے نہال سیوہاروی:

نہال! تم بھی آخر کار روٹھ کر چلے گئے اور ہمیں رونے کے لئے چھوڑ گئے۔ تم سے یہ امید نہ تھی۔

لیک بد عہدی کہ بے ما می روی

اب تو دوست رویا بھی نہیں جاتا۔ کس کس کو روئیں اور کب تک اپنی جان کو کوسیں۔ قضا کا آہنی ہاتھ کس قدر سرعت کے ساتھ اردو کے شعراء کا گلا گھونٹ رہا ہے، لیکن وہ جو سب سے زیادہ مرنے کا تمنائی ہے، اسی کو مرنے کی تمنا کے لئے چھوڑ رکھا ہے۔

دنیا میں دو چیزیں ایسی ہیں کہ اگر ان پر روتے روتے آنکھیں پھوٹ جائیں تو وہ بھی کم ہے اور وہ ہیں وداعِ شباب و ماتمِ احباب۔ اور کس قدر بدبخت ہے وہ شخص جسے ان دونوں صعب ترین سانحوں سے بہ یک وقت دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔

کئی سال کی بات ہے نہال جب کراچی میں ہم ملے تھے۔ مجھ نامراد کو کب معلوم تھا کہ وہ تمہارا آخری دیدار ہے۔

زندگی کس قدر ناپائیدار ہے۔ لیکن یہ سیاہ رو میرے حق میں کس قدر پائیدار بنی ہوئی ہے۔

سلام قبول کرو اے مرے محبوب و باصورت دوست۔ وہ سلام جس میں تم سے جلد تر ملنے کی تمنا کروٹیں لے رہی ہے۔

آ ملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک

مرگِ بے ماتم:

اپنی نوجوانی کے آغاز میں حضرت بزمؔ اکبرآبادی کو میں نے رام پور میں دیکھا تھا۔ جب کہ وہ مرحوم نواب صاحب رام پور کے درباری شاعر تھے۔

بزم صاحب کی ذات بہت سی نادر خصوصیات کا قابلِ قدر مجموعہ تھی ـــــ وہ اگر ایک طرف ہماری قدیم شاعری کے رُکن ممتاز تھے تو دوسری طرف وہ ہماری قدیم وضعداری اور ہماری قدیم تہذیب کا بھی ایک اعلیٰ مرقع تھے۔ اُن کی ذات میں شعر و سخن اور انجمن آرائی کا وہ سلیقہ تھا کہ وہ جہاں بیٹھ جاتے، وہیں طرح بزم ڈال دیتے تھے۔ اُن کے مزاج میں علم و انکسار اور ادبیت و ظرافت کا ایسا اچھا امتزاج تھا کہ اُن کی شخصیت میں ایک بہت بڑی دلکشی و محبوبیت پیدا ہو گئی تھی۔

افسوس کہ موت نے گزشتہ ماہ اُنہیں ہماری محفل سے اُٹھا لیا۔ صرف اُنہیں کو نہیں اُٹھایا، ہماری ماضی کی صحبتوں، ہمارے بزرگوں کی وضعداری اور ہماری ماضی کی بہت سی داستانوں کو اس پردے میں ہم سے چھین لیا۔

موت کے وقت حضرت بزم کی عمر کچھ اوپر سو برس تھی۔ وہ ایک صدی کا نچوڑ تھے۔ کسے معلوم کہ اُن کے ساتھ ہماری پوری ایک صدی کا معاشرتی و ادبی ریکارڈ بھی دفن ہو گیا ہے۔

ایک مدت سے وہ حیدر آباد میں اپنے قابلِ ناز فرزند مکرم آفندی کے ساتھ جنہیں زمانے کی قدر دانی نے قبل از وقت گوشہ نشین بنا دیا ہے۔ زندگی کے آخری ایام گزار رہے تھے۔

جہاں تک شمالی ہندوستان کے اربابِ کمال کا تعلق ہے حیدر آباد کمال کا ایک بہت بڑا مقبرہ ہے۔ جو صاحبِ کمال وہاں جاتا ہے وہ پورے ہندوستان کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور گمنامی کی زندگی بسر کر کے ایک دن وہیں خاک کے سپرد ہو جاتا ہے ـــــ یہ اور بات ہے کہ صاحبانِ کمال میں جو قسمت کے دھنی ہوتے ہیں وہ معتوبِ روزگار ہو کر وہاں سے نکل جاتے ہیں اور جیتے جی مرنے سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ دیگر اربابِ کمال کی طرح یہی حشر بزم صاحب کا بھی ہوا وہ جس آسمان کے ستارے تھے، حیدر آباد کی ہوا، زمانے کے استبداد اور زمین کی گردش نے اس آسمان ہی کو ہماری نظروں سے اوجھل کر دیا تھا، اس لیے جدید نسل کو اس کا پتہ ہی نہیں تھا کہ "یادِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی" ایک شمعِ دکن کے ایک دور دراز گوشے میں ٹمٹما رہی ہے۔

لیکن جو لوگ اس شمع کی تابندگی سے واقف تھے اُن کے دل سے پوچھیے کہ "سو وہ بھی خموش ہے" کا زخم کس قدر گہرا ہوتا ہے۔

کسے معلوم کہ بزم صاحب کے ساتھ کیا کچھ زمین کے اندر پوشیدہ ہو گیا ہے۔

یہ ایک فرد کی نہیں، ایک ایسے پورے دور کی موت ہے جو اب کبھی واپس نہیں آئے گا اور تھوڑے ہی دن بعد جس کے یاد کرنے والے بھی باقی نہیں رہیں گے۔

یہ موت ایک ایسا زلزلہ تھی جس کے جھٹکے کو عوام نے نہیں، خواص نے محسوس اور بری طرح محسوس کیا ہے۔

کس قدر عبرت ناک ہوتی ہیں وہ موتیں جو اہمیت کے باوجود استبدادِ انقلاب زمانہ کے ہاتھوں اپنی اہمیت کھو دیتی ہیں اور ایک معمولی واردات کی طرح تخیلے میں ٹپکے ہوئے صرف دو چار آنسوؤں کے دھندلکے میں گم ہو کر رہ جاتی ہیں۔

زباں پہ بارِ خدایا...

ابوالہند مہاتما گاندھی (نامش پائندہ باد) کی شہادت کے بعد یہ پہلی گاندھی جینتی آج اُس قوم میں منائی جا رہی ہے، جس کے وہ لیڈر ہی نہیں، مسیح کے مانند نجات دہندہ بھی تھے ـــ نجات دہندہ ہی نہیں اُن کے باپ اور اوتار بھی تھے اور اسی کے ساتھ ساتھ ان کی ذات وہ سب کچھ بھی جو ایک ذات کسی قوم کے واسطے ہو سکتی ہے۔ اس دورِ حاضر کے تنہا اوتار اور اس عصرِ موجود کے سب سے بڑے شہید کے محامد و محاسن پر روشنی ڈالنا، آفتاب کو چراغ اور موتیوں کو خذف ریزے دکھانا ہے۔

اُن کے پہلو میں ایک ایسا گداختہ دل تھا جو صرف پیمبروں کے پہلو میں پایا جا سکتا ہے۔ وہ اس کرۂ ارض میں اہنسا اور اتحاد کے سب سے بڑے ہی نہیں بلکہ بلا شرکتِ غیرے واحد مُنادی و مبلغ تھے۔

جب وہ یہ دیکھتے تھے کہ فرطِ غضب سے افرادِ قوم کی آنکھوں میں خون اُتر آیا ہے تو اُن کے دل سے خون کی بوندیں ٹپکنے لگتی تھیں۔

وہ صرف ہندوستان ہی کے ہمدرد و سرپرست نہیں تھے، اُن کا سینہ اتنا چوڑا تھا کہ یہ تمام کرۂ ارض اُن کی محبت کے زیرِ سایہ گردش کرتا تھا۔

وہ اپنے ہم قبیلہ تمام عظیم انسانوں کی طرح انسانوں سے محبت کرتے تھے نسل، رنگ، قوم، مذہب اور زبان کا امتیاز ان سے اس قدر فاصلے پر تھا کہ ہم اُس فاصلے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

یہ نسل، رنگ، قوم، مذہب اور زبان عام لوگوں کے واسطے ہمالہ سے بھی اونچی دیواریں ہیں مگر ان کے روبرو بالکل سطح اور اس قدر غیر ضروری تھیں کہ انہیں ان کے وجود کا احساس تک نہیں ہوتا تھا۔

ہندو مسلم سکھ اتحاد اُن کی سب سے بڑی آرزو تھی اور ان کا سب سے بڑا مقصد تھا جب وہ یہ جہالت اور منافرت آمیز مسخرگی دیکھتے تھے کہ ہندوستان کے جس آدمی کے شانے پر ہاتھ مار کر پوچھا جاتا ہے کہ بھائی، تو کون ہے تو اُس کے مُنہ سے بے ساختہ یہ آواز نکلتی ہے "میں مسلمان ہوں، میں ہندو ہوں، میں سکھ ہوں" تو اُن کے دل میں بے ساختہ یہ آواز گونجتی ہے کہ یہ کمبخت اپنے کو ہندوستانی کیوں نہیں کہتے ـــــ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ہندوستان ہی دنیا کا وہ سب سے زیادہ بدبخت ملک ہے، جہاں کوئی ہندوستانی پایا نہیں جاتا۔

مہاتما گاندھی ہندوستان کے ماتھے سے اس کلنک کے ٹیکے کا چھڑانا اپنا اوّلین و آخرین فریضہ سمجھتے تھے۔ اُن کی زندگی نے اس سلسلے میں بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے اور ان کی شہادت نے تو اتحاد و یگانگی کا ایسا مضبوط سنگِ بنیاد رکھ دیا کہ مستقبل اُس پر ایک ایسی کوہ پیکر و فلک بوس عمارت تعمیر کرے گا جس پر فردوسی کے شعر: ~ پے افگندم از نظم کاخ بلند کہ از باد و باراں نیابد گزند۔ کا پورا اطلاق ہو گا۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ ہم سب کی متحدہ حیات جس مقصد کو حاصل نہیں کر سکی۔ اُس مردِ خدا کی موت نے اُسے حاصل کر لیا۔

اور اس قدر عظمت کے باوصف مہاتما گاندھی کا لب و لہجہ اور تکلم و تبسم اُن کی نشست و برخاست کا انداز، اُن کے خلوت و جلوت کے اطوار، اُن کی عمر، اُن کی چشم و ابرو کا اُتار چڑھاؤ اور ان کی بذلہ سنجیوں کی دلفریبی میں ایک معصوم بچے کی سی مٹھاس، ایک کھلنڈرے کی سی بے تکلفی اور ایک رِند کی سی خوش طبعی بتائی جاتی تھی۔ یعنی وہ سرا سر وہ چیز تھے جسے "آمد" کہا جاتا ہے اور "آورد" سے اُنہیں دُور کا بھی تعلق نہیں تھا۔

بڑے باپ کے بیٹے ہیں تو ہمارا اہم ترین فرض یہ ہے کہ ہم اُن کے اصولِ امن و اتحاد پر تادمِ مرگ قائم رہیں اور جو اُن اصولوں کو توڑے اُسے ملک کا دشمن اور اپنے باپ کا ناخلف و باغی بیٹا سمجھ کر اُس کے ساتھ وہ برتاؤ کریں کہ دنیا انگشت بدندان ہو کر رہ جائے۔ ●

"کلیم" کی فائل سے چند اوراق

بقلم مدیر : جوشؔ ملیح آبادی

قدرت کی فیاضیاں :

(۱)

قدرت نے آخر مجھ سے کب بُخل کیا ہے کہ میں اُس کی شکایت کروں
اُس کا سب سے پہلا احسان تو یہ ہے کہ اُس نے مجھے ایک ایسے نامور و متمدن خاندان میں پیدا کیا جو مرتبے میں بلند، علم و ادب میں ممتاز، دلیری و سیر چشمی یکتا، صورت شکل میں نمایاں، سیرت و کردار میں بے نظیر، وجاہت و اقتدار میں لاثانی اور بذل و سخا میں بے باک و جری تھا، جو ہر صاحبِ حاجت کو سلام کرنے میں سبقت کرتا، سوال سے بیشتر حاجت روائی کرتا اور احسان کرنے کے بعد شرما جاتا تھا۔
قدرت نے آخر مجھ سے کب بُخل کیا ہے کہ میں اس کی شکایت کروں۔

(۲)

بہتر ماؤں سے زیادہ شفقت کرنے والے بانکے میری طفلی کو اس معصوم بچّہ آہو کی طرح بنا دیا تھا جو جھومتی ہوئی گھٹاؤں کے لوٹتے ہوئے سائے میں چوکڑیاں بھرتا اور پھولوں سے لدی ہوئی وادیوں میں کلیلیں کرتا پھرتا ہے ـــــ جو محبت کے موقع پر مجھے سونے کا نوالہ کھلاتا اور تربیت کے وقت شیر کی آنکھ سے دیکھتا تھا۔
قدرت نے آخر مجھ سے کب بُخل کیا ہے کہ میں اس کی شکایت کروں۔

(۳)

جب میں جوان ہوا تو اس نے مجھے ایسی تند و تیز اور گرجتی ہوئی جوانی عطا فرمائی جس کے سامنے طوفانوں کی سانس اُکھڑ جاتی اور دہکتے ہوئے عناصر کی نبضیں چھوٹ جاتی تھیں۔
اُس نے میری جوانی کو مناظر کے سپرد کر کے اُن سایہ دار راستوں سے گزارا، جو باغوں، چشموں اور برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں کی طرف مڑتے ہیں۔ جہاں کوئلیں کوکتیں، مور ناچتے، ہوائیں گنگناتیں، کلیاں چٹکتیں، شاخیں جھومتیں، نالے شور کرتے ہیں اور جہاں دوشیزگانِ صحرا اپنے غیر محسوس حسنِ برشتہ کے نشے سے سرشار ہو کر برسات کی ہواؤں کے ساتھ جھومتی ہوئی چلتیں اور دُور دُور کی تلخ و شیریں بانسری کی لے پر اس طرح سر دُھنتی تھیں کہ اُن کی زُلفیں بار بار سینے پر یوں لہرانے لگتی تھیں جیسے حزن میں عنفوانِ شباب کی اُمنگیں یا کسی دوشیزہ کے سینے میں ع

کہ شتری چہ کس است و بہائے من چند است

کا مبہم سا سوال۔
اسی کے دوش بدوش اُس نے میرے شباب کو علم و بصیرت کے سانچے میں ڈھالنے کی خاطر اس نیلے آسمان اور اس خاکی زمین پر ایسی درسگاہیں کھول دی تھیں جہاں کتابوں کے عوض طلوع و غروب کے اوراق اور لالہ و گل کی تحریریں تھیں ـــــ
قدرت نے آخر مجھ سے کب بُخل کیا ہے کہ میں اس کی شکایت کروں۔

(۴)

وہ حسن کا جمال فرشتوں کی پیشانیاں اور حوروں کی آنکھیں جھکا دیتا تھا اور حسن کے متعلق جوان مرگ عرفی ع

آنہا کہ آہوانِ حرم را کنند صید"

کہہ چکا۔ جب بڑا شباب اُن کی جانب دیکھتا تو اُن کے تیوروں سے مجھے پتہ چل جاتا تھا کہ وہ سب "ز دار آرزو کے ناوکِ صید افگن من اند" کے مصداق ہیں۔ تو دنیا کے کسی جوان کا سر مجھے اپنے سے اونچا نظر نہ آتا تھا۔
قدرت نے آخر مجھ سے کب بُخل کیا ہے کہ میں اُس کی شکایت کروں۔

(۵)

لیکن کامران محبت کے ساتھ ساتھ اُس نے مجھے انسان بنانے کی خاطر میری حیاتِ معاشقہ میں انتہائی دیدہ وری کے ساتھ ایسے دل میں ترازو ہو جانے والے تیر بھی رکھے تھے جو سینے کو فگار اور آنکھوں کو اشکبار کر دیتے ہیں۔ اُن تیروں نے مجھے عشق کی بے چینیوں اور محبت کے آنسوؤں سے بہرہ مند کر دیا ـــــ یہ کوئی کم احسان تھا۔ اس لئے کہ دردِ دل اور اشکِ غم کے بغیر محبت ہی نہیں، بلکہ خود حیات بھی ایک جسمانی کھیل اور حیوانی جست و خیز کے سوا اور کوئی معنی نہیں رکھتی۔
قدرت نے آخر مجھ سے کب بُخل کیا ہے کہ میں اُس کی شکایت کروں۔

(۶)

اسی کے ساتھ اُس نے مجھے وہ رفیقۂ حیات بخشی جس میں زلیخا کی

شیفتگی اور جانبازی ہی کا عزم ہے — ہر چند وہ تُند خو اور شعلہ مزاج ہے، اور مجھے مقیّد رکھنے میں ایسے ہولناک مبالغے کے ساتھ مصر رہتی ہے کہ میری قوتِ برداشت کی بڈّیاں بولنے لگتی ہیں۔ لیکن اگر وہ ایسا زبردست و جانکاہ بریک نہ ہوتی تو خدا جانے میں اپنی زندگی کی مشین کو کسی چٹان سے ٹکرا کر کب کا پاش پاش کر چکا ہوتا۔

قدرت نے آخر مجھ سے کب بُخل کیا ہے کہ میں اُس کی شکایت کروں؟

(۷)

میرے شفیق باپ کا سایہ اُٹھتے ہی عین اُس آن جب کہ یہ ننھا سا مگر حد سے زیادہ شریر ستارہ جسے دنیا مجھتے ہیں، میری ناز و نعم میں پلی ہوئی نوجوانی پرواز کیا ہی چاہتا تھا کہ یکا یک مجھے ایک دور دراز مقام پر قصرِ شاہی میں پہنچا دیا گیا — ہنر شناس اور معارف پرور سلطان کے تاج کی کرنیں میری نوجوانی پر پڑیں اور چشم زدن میں میری تقدیر کا آسمان جگمگانے لگا۔ عصائے شاہی ہوا میں بلند ہوا، میرے ماحول کی چٹان پر ضرب لگائی — اور پتھروں سے میٹھے پانی کے متعدد چشمے پھوٹ نکلے۔

قدرت نے آخر مجھ سے کب بخل کیا ہے کہ میں اُس کی شکایت کروں؟

(۸)

میں ایک زمانۂ دراز تک قصرِ سلطانی میں رہا۔ جہاں اربابِ حاجت کی خدمت میرا محبوب ترین مشغلہ تھا — اور جب اُس نامعلوم قوت نے جو اس کارخانۂ عالم کو چلا رہی ہے، یہ دیکھا کہ قصرِ شاہی میں میرا مزید قیام مناسب نہیں رہا ہے تو مجھے دُور بہت دُور ایک قطعی مختلف اور سراسر تنگ و تار ماحول میں ہاتوں ہات پہنچا دیا۔ اوّل اوّل تو مجھے اس تبدیلی سے سخت وحشت ہوئی — میں گھبرا گیا۔ خوف زدہ ہو گیا۔ کیوں کہ میں اُس وقت ع

"چنداں کہ خدا غنی ست من محتاجم"

کا کامل مصداق تھا — حکیمانہ مزاج اور شاعرانہ بے نیازی اگر میرا بازو نہ تھام لیتی تو میں لڑکھڑا کر گر پڑتا اور گرتے ہی چُور چُور ہو جاتا — لیکن اس سے پیشتر کہ تباہی مجھ پر بھرپور وار کر سکے اور میں بھیڑیا سوسائٹی کا نوالہ بن جاؤں، ایک قطعی غیر متوقع سمت سے ایک "مردِ غیب" رام و لچھمن کے خاندان کا چشم و چراغ، عزیزِ مصر کی طرح نمودار ہوا اور مجھے غلام بنا کر نہیں بلکہ آقا و سردار بنا کر اپنے محل میں اٹھا کر لے گیا۔

مہربان بادشاہ کے دربار سے اخراج کے وقت (خدا بادشاہ کو سلامت رکھے) مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا منجنیق میں بٹھا کر مجھے دہکتی ہوئی آگ میں پھینکا جا رہا ہے۔ لیکن جیسے ہی میں اُس آگ میں گرا، کیا دیکھتا ہوں کہ دہکتی ہوئی آگ مہکتے ہوئے پھولوں اور اُبلتی ہوئی شراب میں تبدیل ہو کر رہ گئی ہے۔

قدرت نے آخر مجھ سے کب بُخل کیا ہے کہ میں اُس کی شکایت کروں۔

(۹)

ابھی مجھے اپنے "عزیزِ مصر" کے جوار میں ایک سال ہی گزرا تھا کہ میری حیات کے اُفق پر دُور سے ایک سبز روشنی نمودار ہوئی — اور میں اُس روشنی کی طرف روانہ ہو گیا — ابھی کچھ دُور ہی گیا ہوں گا کہ ایک موڑ پر وہ روشنی غائب ہو گئی اور ایک بھیانک غار سامنے آ گیا — ایسا ہولناک غار کہ الحفیظ والاماں — لیکن اس درماندگی کو زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا کہ ایک سانولے رنگ کا دوسرا "مردِ غیب" کرشن جی کی طرح مُرلی بجاتا ہوا سامنے آیا اور خضر کی سی محبت کے ساتھ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے وہاں لے آیا جہاں سبز روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

قدرت نے آخر مجھ سے کب بخل کیا ہے کہ میں اُس کی شکایت کروں؟

(۱۰)

میں اُس سبز روشنی کے حلقے میں اپنے خضرِ راہ کے ساتھ ایک مدّت تک انتہائی اطمینانِ قلب کے ساتھ رہا۔ لیکن کچھ روز کے بعد میرے خضرِ راہ کے چہرے پر وحشت و رمیدگی کے آثار پیدا ہو چلے اور اُس کے انفاس سے مجھے بے تعلقی کی بُو آنے لگی۔ میں نے ان آثار کو وحشت کی نظروں سے دیکھا۔ اور ابھی کوئی فیصلہ نہ کر سکا تھا کہ اس اثنا میں ایک صبح دیکھتا کیا ہوں کہ میرے خضرِ راہ کا حجرہ خالی پڑا ہوا ہے اور وہ مجھے تنہا چھوڑ کر بھاگ چکا ہے۔ لیکن ابھی میں آنکھیں مل ہی رہا تھا کہ یکایک ایک جلوس کے باجوں کی آواز سے تمام فضا گونج اُٹھی اور میں قافلہ سالار کے رفیقوں میں شامل ہو کر اس مقامِ تنگ و تار سے ایک گلستانِ رنگ و بُو میں پہنچ گیا۔

قدرت نے آخر مجھ سے کب بخل کیا ہے کہ میں اُس کی شکایت کروں؟

(۱۱)

خود ستائی ایک بُری چیز ہے۔ مگر بولنے کے موقع پر چُپ رہنا اُس سے بھی بُرا ہے اور بالخصوص اظہارِ شکر کے موقع پر بخشش کرنے والے کے ایک ایک احسان کو کھول کر نہ بیان کرنا صرف بُرا ہی نہیں بلکہ ناشکری، کم ظرفی اور تنگ دلی کی علامت ہے — اس لئے میں قدرت کے اُن احسانوں کو بھی بیان کروں گا جن کا تعلق میری سرشت اور میرے ضمیر سے ہے۔

میں اس کہنے میں نہ جھجکوں گا کہ میرے پہلو کو وہ تاروں کا سا دل ودیعت فرمایا گیا ہے — وہ دل جو ہر جان دار و بے جان کی محبت سے معمور اور جذبۂ نفرت سے قطعی بیگانہ ہے، وہ دل جو دشمنوں تک پر قربان ہو جانے میں وہ انوکھی مسرت محسوس کرتا ہے، جو انسان کو اس لمحۂ اوّل میں محسوس ہوتی ہے۔ جب کہ اُس کی کھوئی ہوئی بصارت یکایک عود کر آتی ہے — اسی کے ساتھ ساتھ میرا دل دلیر بھی ہے اور بے باک بھی — جس پر دولت کا طنطنہ، سوسائٹی کا اقتدار اور شاہوں کا دبدبہ ذرّہ برابر بھی اثر نہیں کرتا — وہ دل جو بنی نوعِ انسان کی الجھنوں پر ہر آن دھڑکتا رہتا اور وطن کی درماندگیوں پر خون کی بوندیں ٹپکاتا رہتا ہے۔

اس کے علاوہ مجھے وہ زندہ دلی اور وہ خاطر مجموع عطا فرمائی گئی ہے جو ہر تلخی کو شیریں بنا دیتی ہے، ہر مصیبت کے ساتھ مسخرگی کرتی ہے۔ اور ہر بلائے آسمانی کی کلائی موڑ کر رکھ دیتی ہے۔

قدرت نے آخر مجھ سے کب بُخل کیا ہے کہ میں اُس کی شکایت کروں؟

(۱۲)

آخر میں اپنے جوہرِ ذاتی کا ذکر کروں گا ـــــ جس کا سلسلۂ نسب نبوّت و رسالت سے جا کر مل جاتا ہے۔ وہ جوہر جس کا ہر جزو "ارض و سما پر بھاری ہے اور جو خاک میں الوہیت پیدا کر دیتا ہے۔

یہ وہ جوہر ہے جو انسان کو وہاں پہنچا دیتا ہے جہاں اسمار و اشکال کے چہروں کی نقابیں اُٹھی ہوئی ہوتی ہیں، جہاں خیر ہے نہ شر، پستی ہے نہ بلندی، موت ہے نہ حیات، روح ہے نہ مادہ، اہرمن ہے نہ یزداں اور جہاں بندہ ہے نہ خدا ـــــ

یہ کیسا الوہی استغنا ہے جو میرے سینے میں سانس لیتا رہتا ہے ـــــ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ارض و سما کے تمام خزانے میری ٹھوکروں کی زد پر ہیں اور یہ سارا نظامِ شمسی مرے پاؤں چوم رہا ہے۔

ہاں سچ ہے کہ وہ سونے چاندی اور تانبے کے سکے جن پر ان زمین کے کمزور بادشاہوں کی تصویریں کندہ ہوتی ہیں میرے پاس نہیں ہیں، لیکن کون یقین مانے گا کہ یہ مردِ مفلس اگر اپنی جیب کو جھاڑ دے تو روئے زمین پر زر و گوہر اور شمس و قمر کا مینہ برسنے لگے۔

قدرت نے آخر مجھ سے کب بخل کیا ہے کہ میں اُس کی شکایت کروں؟

ایک خطرناک مشورہ:

(طالب علموں کو سیاست سے دور رہنے کے ایک پروفیسر کے مشورے پر)

میں کتابی علم کا پورا پورا احترام کرتا ہوں اور "صحیح علم" تک پہنچنے کا اسے ایک ناگزیر ذریعہ سمجھتا ہوں۔ مگر یہ خیال کہ "علم" کتابوں کے اندر ہی محصور ہے ایک ایسا افسوسناک اور محدود خیال ہے جس کی تائید کرنا اپنے کو گمراہی میں مبتلا کر دینے کے برابر ہے۔

"کتابی علم" محض ایک علامت ہے جس کے ذریعے سے ہم "حقیقی علم" تک پہنچ سکتے ہیں۔

بے شک نقشے (اٹلس) کا مطالعہ نہایت ضروری ہے، لیکن نقشے کو صرف نقشے کی خاطر دیکھنا کوئی معنی نہیں رکھتا ـــــ نقشے کو دیکھ کر یہ تصور تو ضرور پیدا ہوتا ہے کہ فلاں فلاں مقامات، فلاں فلاں حصوں میں ہیں اور فلاں فلاں حصوں میں فلاں فلاں دریا بہتے ہیں۔

اگر کوئی نقشے کو بھانپ کر اُس پر بیٹھ جائے اور یہ دعویٰ کرنے لگے کہ دنیا اُس کے زیرِ نگیں ہے اور وہ سیّاحِ بحر و بر یا "فاتحِ عالم" ہے تو کب ایسے شخص کو مجنوں نہیں سمجھا جائے گا۔ یہی حال "کتابی علم" کا ہے۔ اگر کوئی شخص حیات اور اسرارِ حیات سے منہ موڑ کر صرف کتابوں ہی کا ہو کر رہ جائے تو کیا کوئی دانا اُسے "عالم" کا خطاب دے سکے گا۔

لیکن جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ جنّت نشان ہندوستان عجیب مُلک ہے۔ یہاں کے پروفیسر اپنے شاگردوں کو یہ تعلیم دیتے ہیں کہ وہ حیات اور اسرارِ حیات، ملک اور حالاتِ مُلک سے بیگانہ رہتے ہوئے صرف کتابوں کے کیڑے بنے رہیں ....

...... زمانہ دراز سے یہ رونا رویا جا رہا ہے کہ ہمارا نصابِ تعلیم نہایت ہی خراب ہے۔ لیکن کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی ـــــ ہماری تعلیمی مصیبت مکمل ہے۔ صرف ہمارا نصاب اور طرزِ تعلیم ہی خراب نہیں۔ ہمارے اساتذہ اور ہمارے پروفیسر بھی نا اُمیدی کی حد تک خراب واقع ہوئے ہیں۔

ہندوستانی پروفیسروں کو پروفیسر کہنا دراصل پروفیسری کی توہین ہے۔ اس ملک میں جہاں لاکھوں باتیں تعجب انگیز ہیں، وہیں یہ بھی ایک نہایت ہی حیرت ناک بات ہے کہ اس جہالت آباد میں کسی کو یہ علم تک نہیں کہ پروفیسر کہتے کسے ہیں۔ اس کے علمی، اخلاقی اور ذہنی خصوصیات کیا ہونا چاہئیں اور اس بزرگ ترین پیشے کے واسطے کون کون سے شرائط ناگزیر ہیں۔

پروفیسری ایک ایسا قابلِ احترام مرتبۂ بلند ہے جس کے سامنے حکومت کا جھکنا، پروفیسری کی نہیں، خود حکومت کی عزّت ہے۔

لیکن اس ملک میں ہر بی۔ اے اور ہر ایم۔ اے یونیورسٹی کے اربابِ اقتدار کی جوتیاں سیدھی کر کے غیر مشروط طور سے پروفیسری کی کرسی پر جلوہ افروز ہو جاتا ہے۔

یہاں یہ نہیں پوچھا جاتا کہ درخواست گزار اس منصبِ جلیل کا اہل ہے کہ نہیں، دیکھا صرف یہ جاتا ہے کہ آیا درخواست گزار اچھے توڑ جوڑ کر سکتا ہے کہ نہیں۔ خوشامد کی ایک کثیر مقدار حسبِ مطالبہ پیش کرنے پر آمادہ ہے کہ نہیں، طالب علموں کو وطن اور حبِّ وطن سے بیگانہ رکھنے میں کامیاب ثابت ہو سکتا ہے کہ نہیں، اور ہماری سازشوں میں ایک اچھے آلۂ کار کی طرح استعمال ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے کہ نہیں ـــــ اگر درخواست گزار اس کسوٹی پر پورا اُترتا ہے تو آنکھیں بند کر کے اس کی درخواست منظور کر لی جاتی ہے اور اُسے لائسنس دے دیا جاتا ہے کہ اپنی جہالت، دناءت اور وطن دشمنی کے تمام حربے استعمال کر کے نئی نسل کی مٹّی پلید کر دے۔

ہمارا پروفیسر کلاس میں اس جذبۂ شریف کے ساتھ لیکچر نہیں دیتا کہ اُسے اپنے نونہالوں کو جسمانی اور ذہنی لحاظ سے اُبھارنا اور اُنہیں صحیح انسان بنانا ہے۔ وہ تو صرف ڈبل روٹی اور مکھن کھانے اور بیرسٹر سوٹ سے منہ دھو سکنے کی خاطر کلاس میں بے تکان چلّاتا رہتا ہے۔

زمانے کی عیّاری:

میرے دل کو ایک ایسی محبّت ودیعت کی گئی ہے جو دُنیا کی تلخ و شیریں ہے۔ وہ ایک ایسی آگ ہے جو معشوقہ کے سوا خود مجھے اور تمام کائنات کو پھونکے دے رہی ہے۔

زمانے کی کیسی عدیم النظیر بے مہری اور ستم ظریفی ہے کہ میں پھر اُس ہو لناک

منصب پر فائز کیا گیا ہوں جسے میں ترک کر چکا تھا۔ ذرا دنیا کا انصاف دیکھو، سالہاسال کی شب بیداریوں کے بعد، ابھی ابھی میری آنکھ جھپکی تھی کہ اس کمبخت نے مجھے پھر جگا دیا۔ ابھی ایک قیامت نے دم نہیں لیا تھا کہ دوسری قیامت نے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

ہوائیں بھی کبھی بند ہو جایا کرتی ہیں، مگر میرے دھڑکنے والے دل کو ایک لمحے کے سکون کا بھی حکم نہیں۔

خدا کے لئے انصاف سے کہو، میں نے زمانے سے کب درخواست کی تھی کہ مجھے دوبارہ مزہ چکھایا جائے۔ میں عورت، خطرناک جنت، انگاروں کی بہشت، پھولوں کا جہنم یعنی عورت سے قطعی مایوس ہوں۔ یہ دلوں کو توڑ دیتی ہے مگر جوڑ نہیں سکتی۔ جوڑنے میں ایک ایسی کاریگری درکار ہے جو کمزور عورت کو حاصل ہو ہی نہیں سکتی۔ اُس کی محبت طوفانی سمندروں سے زیادہ پُرجوش ہوتی ہے اور کھرے سونے کی طرح خالص بھی۔ مگر افسوس صد ہزار افسوس! اُس میں پائداری کہاں۔ عورت نازک ہے اور اسی وجہ سے اُس کا پیمانِ محبت بھی نازک ہوتا ہے۔ آبگینے کا ہر جزو آبگینہ ہی ہوتا ہے۔ میں عورت کی محبت کی ناپائیداری کے باعث عورت کو برا نہیں سمجھتا۔ لیکن یہ ضرور چاہتا ہوں کہ وہ مجھ سے پیمانِ وفا نہ باندھے۔ کیوں کہ وہ ایک نہ ایک دن ٹوٹ کر میرے دل کو بھی توڑ دے گا۔ مگر ہمارے نہ چاہنے سے ہوتا کیا ہے۔ زمانہ ہماری مصلحتوں کو خوب سمجھتا ہے۔ وہ ہماری خاطر اپنے نظامِ عمل میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا ——

کیا میں اُس محبت کو جو زبردستی مجھے دی گئی ہے زمانے کے منہ پر مار دوں، سینہ چاک کر کے اُسے پھینک دوں، کاش میں اس پر قادر ہوتا ——

زمانہ جانتا تھا کہ میں محبت کا تلخ تجربہ کر چکا ہوں۔ آسانی سے اُسے دوبارہ قبول نہ کروں گا۔ یہ خیال کر کے اُس نے مجھ سے ایک نہایت شاطرانہ چال چلی۔ اُس گرگِ باراں دیدہ نے مجھ سے کہا: "لے میں تجھے ایک شام کے وقت کی ذرا رنگین سی تفریح دیتا ہوں۔ اس سے دل بہلا۔" میں نے شکریے کے ساتھ اُس شام کے وقت ذرا سی "تفریح" سے جی بہلانا شروع کیا اور اسے ایک ادبی مشغلہ سمجھنے لگا، لیکن رفتہ رفتہ یہ شام کے وقت کی رنگین سی تفریح اپنے چہرے سے آہستہ آہستہ نقاب اُلٹنے لگی، تفریح نہیں، محبت آہستہ آہستہ نقاب اُلٹنے لگی اور جب پورے طور سے نقاب اُٹھ گئی تو معلوم ہوا کہ وہ شام کے وقت ذرا رنگین سی تفریح، تفریح نہیں۔ محبت اور خطرناک محبت ہے جس پر زمانے کے چالاک ہات نے "تفریح" کی نقاب ڈال دی تھی ——

زمانہ خوب جانتا ہے کہ حُسن جب وفا و کرم سے کام لے تو اُس کا مارا ہوا پانی نہیں مانگ سکتا۔

بہرحال، اب تو میں گرفتار ہو چکا۔ میں رو رہا ہوں اور زمانہ قہقہے مار رہا ہے۔

کیا تو سننا چاہتا ہے کہ وہ کیسی ہے؟ تو سننا چاہے یا نہ چاہے، اس منزل میں جہاں میں ہوں ہوں۔ ذکرِ محبوب سے بہتر کوئی مشغلہ نہیں ہوا کرتا۔

وہ کیسی ہے؟ میرا سینہ رُندھا جا رہا ہے۔ مجھے الفاظ نہیں ملتے۔

حیوانِ ناطق کی یہ کیسی بدبختی ہے کہ جو باتیں کہے جانے کے قابل نہیں ہوتیں اُنہیں وہ کہہ سکتا ہے اور جو باتیں اس قابل ہوتی ہیں کہ کہی جائیں، اُنہیں کہہ نہیں سکتا۔ کیسی بدقسمتی اور محرومی ہے کہ معنی کے آفتاب کا سامنا ہوتے ہی الفاظ کی شبنم اُڑ جاتی ہے۔ آہ اے گونگے انسان تو زباندانی کا مدعی ہے۔

زبان ایک گنوار خادم ہے جو پیتل اور تانبے کے برتن تو رگڑ کر مانجھ سکتی ہے، مگر چینی اور شیشے کے ظروف توڑ ڈالتی ہے۔

ہاں تو وہ کیسی ہے؟ وہ انگوری شراب ہے جو کسی دیوی کی دُعا سے انسانی پیکر میں جلوہ فروش ہو گئی ہے۔ وہ خالقِ عالم کا تصورِ بہشت ہے جس نے جسم کی صورت اختیار کر لی ہے۔ وہ شاعری کی روح ہے جس نے گوشت پوست کا رنگین لباس پہن لیا ہے —— اُس کی جلد، خدا جانتا ہے اس میں مبالغہ نہیں۔ دودھ پیتے بچوں کی جلد سے زیادہ چکنی ہے ملائم ہے۔ میں نے اُس کی جلد کو مَس کر کے فوراً گلاب کی پنکھڑی کو مَس کیا (اگر مبالغہ کرتا ہوں تو میرا حشر ظالموں کے ساتھ ہو) اور میں نے یہ بیّن فرق محسوس کیا کہ میری محبوبہ کی جلد پنکھڑی سے بھی زیادہ ہموار، چکنی اور نرم ہے۔ میرے مَس نے اُس سے زیادہ نرم شے کا آج تک تجربہ نہیں کیا ہے۔ اُس کا چہرہ یونانی دیویوں سے ملتا ہے اور دنیا کے منتخب ترین مصوروں کا آئیڈیل بن سکتا ہے۔ اُس کی گردن ہنس کی سی ہے۔ ذرا سا خم لئے ہوئے جس میں تلوار کی سی لچک اور رقص کرتے ہوئے طاؤس کا سا بانکپن ہے۔ جب وہ بات کرتی ہے معلوم ہوتا ہے تاروں کی چھاؤں میں کسی دُور کے مندر کے اندر چاندی کی گھنٹی بج رہی ہے۔ اُس کا تبسّم دل کے ساتھ وہ کرتا ہے جو تھلا زدہ زمین کے ساتھ روم جھوم کر برسنے والی گھٹا کرتی ہے۔

ملبوس کے اندر سے اُس کے گورے پنڈے کا گلابی پن کس لطافت کے ساتھ چھنتا رہتا ہے۔ اُس کے پنکھڑی سے زیادہ کاریگری کے ساتھ ترشے ہوئے لبوں کی خوشبو ایسی ہے جس سے پھولوں کی دنیا ناواقف ہے۔ اس کی آنکھیں، کائنات در آغوش آنکھیں کتنی مخمور و مست، ساحر اور عمیق ہیں، اُن میں کتنے جادوؤں کا مسکن اور کتنے منتروں کا آشیانہ ہے۔ اُس کی دراز پلکوں میں شراب کی موجیں ہیں، اس کا خرام ہے اندر روح کی کروٹیں —— وہ ایک آہوئے صحرا ہے جس کی ملائم مگر سمندر سے زیادہ گہری آنکھوں کے سامنے شیر مقتول نظر آتے ہیں۔

میں نے ایک روز منہ اندھیرے، جب مرغ بانگ دے رہے تھے، اُسے دیکھا یہ پہلا موقع تھا کہ میری روح کو معلوم ہوا کہ آسودگی کسے کہتے ہیں۔ اگر میں راسخ العقیدہ مسلمان ہوتا تو صبح کے وقت اُس کی طرف دیکھنے کی جسارت نہ کرتا کیوں کہ میری محبوبہ صبحِ صادق کی حقیقی بہن ہے اور اسلام نے دو بہنوں کا جمع کرنا حرام فرمایا ہے۔

یہ ہے سرسری اور دھندلا سا خاکہ اُس نادرۂ روزگار کا جس کے حوالے زمانے نے مجھے کیا ہے —— اب خود سوچو، میں بھاگوں تو کیوں کر اور اب جب کہ اچھی طرح معاملات میں نے بیان کر دئے ہیں، زمانے کو داد دو کہ اُس نے کیسی کامیاب عیاری سے مجھے پھر ہاتھ پاؤں باندھ کر حُسن کے قدموں پر ڈال دیا ہے۔ ●

جوش پر ایک نئی کتاب :

سید حسن عباس

جوش ملیح آبادی کی نادر و غیر مطبوعہ تحریریں

(جلد اوّل)

تحقیق و تدوین : ڈاکٹر ہلال نقوی
شائع کردہ : حیات اکاڈمی (کراچی) صفحات : ۱۶۰
سالِ اشاعت : ۱۹۹۲ء

ڈاکٹر ہلال نقوی کو جوش کی شاگردی کا شرف حاصل ہے ۔ انہوں نے جوش جیسے استاد سے بہت کچھ سیکھا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ وہ شاگردی کا حق ادا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں لائق شاگرد کو ایسا کرنا بھی چاہئے ۔ وہ جوش صاحب کے ایسے شاگرد ہیں جن کے بارے میں استاد کا خیال یہ تھا ۔ وہ اپنی مخصوص نثر میں لکھتے ہیں :

"اس دھان پان نوجوان نے اپنی قوتِ تخلیق کے مضبوط ہاتھوں سے زمینِ ادب کے سینے پر صدیوں کی جمی ہوئی گرد کی تہوں کو اس طرح کھرچ دیا ہے کہ تہذیب و فن کے گمشدہ خزانے اپنی جھلکیاں دکھانے لگے ہیں۔

میاں ہلال نقوی سے میں پہلی بار اس وقت واقف ہوا تھا جب غالباً پندرہ برس قبل وہ مجتبیٰ (پروفیسر مجتبیٰ حسین صدر شعبۂ اردو جامعہ بلوچستان) کے ساتھ میرے گھر آئے تھے۔ اس وقت ان کی عمر پندرہ سولہ برس کی ہی ہوگی ۔ کم عمری ہی سے ان کے مزاج میں سخن فہمی، ادب دوستی، بے باکی اور جراَتِ حق کی جو روح دوڑ رہی تھی، اس سے میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ میرے کراچی کے زمانۂ قیام میں وہ تقریباً روز مجھ سے ملنے آتے اور میرے نواسے کو "بلا معاوضہ" اردو پڑھاتے ۔ اس زمانے میں ان کے دل و دماغ پر صحیفۂ شاعری نازل ہوا تھا وہ مجھ سے اصلاح لینے لگے ۔ میاں ہلال نقوی کی طبیعت میں زود گوئی کا ملکہ بہت ہے ۔ اسی وجہ سے طویل نظم کہنے میں انہیں بڑی دسترس ہے اور اس میدان میں وہ نئی نسل کے شعرا کے ہیرو کہلائے جانے کے مستحق ہیں ۔"[1]

شاگرد کے بارے میں استاد کی یہ رائے قابلِ غور ہے ۔ کیوں کہ جوش نے اپنے ہونہار شاگرد کی صلاحیتوں کا پہلی ہی نظر میں بھرپور اندازہ کر لیا تھا جسے ہلال نقوی ثابت کر چکے ہیں ۔ وہ جدید مرثیہ گو شاعر ہونے کے ساتھ مرثیے کے محقق و منتقد بھی ہیں ۔ ان کا تحقیقی مقالہ "بیسویں صدی میں جدید مرثیہ" اس صنفِ سخن کے سمجھنے اور سمجھانے میں ممد و معاون ہوگا۔

جوش صاحب پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے ، لیکن اب بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ابھی بہت کچھ لکھا جانا چاہئے ۔ وہ ایک عدیم المثال شاعر بے نظیر نثر نگار اور کئی جہتوں سے نادر روزگار انسان تھے ۔ انہوں نے شاعری اور نثر نگاری دونوں ہی میں اپنی قادر الکلامی اور مہارت کا ثبوت فراہم کیا ہے ۔ جوش کے لئے مشہور ہے کہ وہ لفظوں کے جادوگر تھے ۔ الفاظ کے استعمال پر اپنی قدرت کا انہوں نے جو مظاہرہ کیا ہے ، کم ہی دیکھنے میں آیا ہے ۔ اگر وہ شہنشاہِ جذبات تھے تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ انہیں الفاظ کے دروبست پر مہارت حاصل تھی۔ انہیں بخوبی احساس تھا کہ کس لفظ کے استعمال سے منظر نامے میں کون سا رنگ بھرا جا سکتا ہے ۔ یہاں جوش کی قادر الکلامی ثابت کرنے کے لئے تکراری باتوں سے اجتناب کرتے ہوئے ان کی ان غیر مطبوعہ تحریروں کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں ۔ جن کے مطالعے سے جوش کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

حیات اکاڈمی نے ڈاکٹر ہلال نقوی کی مرتب کردہ کتاب: "جوش کی نادر اور غیر مطبوعہ تحریریں" (جلد اوّل) جوش کی دسویں برسی کے موقع پر نہایت آب و تاب کے ساتھ شائع کی ۔ جیسا کہ اس کے نام سے ہی ظاہر ہے کہ یہ کتاب جوش کی نادر اور غیر مطبوعہ تحریروں کا مجموعہ ہے ۔ ڈاکٹر ہلال نقوی نے بڑی محنت اور جاں فشانی سے ان تحریروں کو جمع کیا ہے ۔ اس سلسلے میں انہیں مختلف لوگوں سے رابطہ قائم کرنا پڑا اور جہاں سے بھی جو تحریریں مل سکیں ۔ اس مجموعے میں پیش کر دی ہیں ۔ البتہ اُن حضرات کے نام مقدمہ میں درج کر دئے ہیں جن سے یہ تحریریں انہیں ملی ہیں۔

مذکورہ کتاب میں حیات اکیڈمی کے صدر جناب سید سفیر رضا نقوی کے قلم سے کتاب اور ہلال نقوی کا تعارف بھی شامل ہے ۔ خود ڈاکٹر ہلال نقوی نے "تحقیق و تدوین" کے حوالے سے مقدمہ تحریر کیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

"جوش صاحب کی نادر تحریریں خصوصاً ان کی غیر مطبوعہ تحریریں بہت بے دردی سے مختلف افراد کے پاس بکھری پڑی ہیں ۔ جو ان کی اہمیت سے آگاہ ہیں ، انہوں نے یقیناً بہت احتیاط سے انہیں رکھا ہوگا ۔ لیکن عموماً یہ تحریریں کہیں اُفتادگی اور کہیں بوسیدگی کا شکار رہیں ۔ اسی سلسلۂ تحقیق کے ذیل میں جوش کی نادر اور غیر مطبوعہ تحریروں کی جلد دوم انہی منتشر تحریروں کا مجموعہ ہوگی ۔" (ص ۱۶)

مجموعی طور پر اس کتاب میں جوش کی ستائیس نادر اور غیر مطبوعہ تحریریں شامل ہیں ۔ ان کے علاوہ نو افراد کے نام جوش کے خطوط ہیں ، جن میں سے اکثر پہلی بار شائع ہوئے ہیں ۔ تیسرا حصہ جوش کے غیر مطبوعہ کلام پر مشتمل

[1] ماہنامہ افکار کراچی ۔ جوش نمبر جولائی ۱۹۸۲ء و بحوالہ طبعِ دوم کتاب "جوش کی نادر اور غیر مطبوعہ تحریریں" جلد اوّل از: ہلال نقوی

ہے۔ اس مجموعے میں جو نثر پارے پہلی بار شائع ہوئے ہیں ان کی تعداد پندرہ ہے۔ جن کے عناوین یہ ہیں :

۱۔ پبلک ہائی اسکول (کینٹ کراچی) میں بچوں سے خطاب ۱۹۷۴ء
۲۔ الفاظ اور شاعر (حصہ دوم) ۱۹۵۹ء
۳۔ مکالمہ مابین شبیر حسن خاں اور جوش ملیح آبادی ۱۹۷۵ء
۴۔ غیر مرتب (محاورے و معانی) ۱۹۶۴ء
۵۔ ابو العالمین ۱۹۶۹ء
۶۔ چند سطریں ۱۹۶۴ء
۷۔ پریم چند ۱۹۷۹ء
۸۔ حضرت اقبال ۱۹۷۷ء
۹۔ کچھ اپنے بارے میں ۱۹۷۰ء
۱۰۔ میرزا محمد ہادی صاحب رسوا لکھنوی
۱۱۔ نواسی صبوحی خاتون کی ہوگی پر ۱۹۷۷ء
۱۲ یادوں کی برات کا ایک گمشدہ ورق (راغب مرادآبادی کے متعلق) ۱۹۶۹ء
۱۳۔ امجد و عناصر ۱۹۶۲ء
۱۴ بلبلِ پاکستان ڈاکٹر عالیہ امام ۱۹۷۳ء
۱۵۔ سید محمود عسکری ۱۹۶۵ء

غیر مطبوعہ مکتوبات کے ضمن میں درج ذیل اشخاص کے نام جوش کے خطوط شامل ہوئے ہیں جن کی مجموعی تعداد تیرہ ہے۔

۱۔ بنام ڈاکٹر رالف رسل ۱۹۷۹ء
۲۔ بنام بابا ذہین شاہ تاجی ۱۹۷۲ء
۳۔ بنام راغب مرادآبادی ۱۹۵۵ء
۴۔ بنام میاں ممتاز دولتانہ ۱۹۷۹ء
۵۔ بنام خورشید علی خاں (چھ خطوط)
۶۔ بیٹی سعیدہ خاتون کے نام (دو خطوط) ۱۹۷۳ء
۷۔ نواسے سراج الحق کے نام ۱۹۷۲ء

غیر مطبوعہ کلام :

۱۔ صبح دیر سے بیدار ہونے پر
۲۔ ارتقا کا اعلان (طویل ترین غیر مطبوعہ نظم 'حرفِ آخر' سے ایک اقتباس)
۳۔ سہانی سزائیں
۴۔ دو سلام اور چند رباعیات

نادر فن پاروں کے عنوان سے جو نثر پارے شامل کتاب ہیں، وہ یہ ہیں:

۱۔ اگر مسلمانوں نے خودکشی کا عزم نہیں فرمالیا ہے۔ ۱۹۶۰ء
۲۔ اسلام ایک اصلاحی و انقلابی تحریک ۱۹۶۳ء
۳۔ خودکار پرورش گاہ 'فکر و قلم پاکستان' (اسرار ترقی) ۱۹۶۰ء
۴۔ جلال لکھنوی (یادِ رفتگاں)
۵۔ میر بارق لکھنوی (یادِ رفتگاں) ۱۹۵۷ء
۶۔ تنگنائے غزل ۱۹۵۸
۷۔ رباعی کے متعلق ۱۹۶۳ء
۸۔ انتقاد و انتخاب ۱۹۴۷ء
۹۔ علامہ رشید ترابی کی وفات پر تعزیت نامہ ۱۹۷۳ء
۱۰۔ یادوں کی برات (نسخۂ اوّل) کا ایک نادر و نایاب ورق (منور عباس کے متعلق)
۱۱۔ آخری زمانے کی ایک تحریر ۱۹۸۱ء

نادر مکتوبات :

جلال نقوی کے نام (پانچ خطوط)

دو تحریریں ایسی ہیں جن کا شمار نہ تو غیر مطبوعہ میں کیا گیا ہے اور نہ ہی نادر میں ——— البتہ افادیت کے پیشِ نظر انہیں شامل کر لیا گیا ہے۔ وہ یہ ہیں :

۱۔ الفاظ اور شاعر (حصہ اوّل)
۲۔ خط بنام جمیل مظہری (یہ خط 'کائنات' مرزاپور کے جمیل مظہری نمبر سے ماخوذ ہے)

کتاب کے صفحہ ۱۵۸ - ۱۵۹ پر مرتب نے افراد و اشخاص کے دو اشاریے دیے ہیں اور صفحہ ۱۶۰ پر 'اشاریۂ خاندانِ جوش' کے عنوان سے جوش صاحب کے اہلِ خاندان کے نام اس عرفیت کے ساتھ درج کیے گئے ہیں جو جوش اپنے کسی عزیز کے لئے استعمال کرتے تھے مثلاً :
گنجے ——— (اصل نام) حیدر مسعود خان ——— یہ جوش کے نواسے ہیں۔

یقیناً اس کتاب کا مطالعہ جوش پر تحقیقی کام کرنے والوں، خاص کر ان کی نثر سے متعلق کام کرنے والوں کے لئے ناگزیر ہے۔

● اردو سروس، ریڈیو تہران، پوسٹ بکس نمبر ——— ۳۳۳۳، تہران، ایران

محمد رضی الدین معظّم

جوشؔ : ایک نظر میں

خاندانی نام: شبیر احمد خاں

تبدیلِ نام: ۱۹۰۷ء میں نام تبدیل کرکے شبیر حسن خاں رکھا گیا۔

تخلص: جوشؔ

تاریخِ پیدائش: ۵۔ دسمبر ۱۸۹۸ء یوم دوشنبہ م ۳۰ رجب المرجب ۱۳۱۶ھ م ۲ بہمن ۱۳۰۸ ف

مقامِ پیدائش: ضلع ملیح آباد، قصبہ کنول ہار لکھنؤ

آباواجداد: آفریدی کلّی خیل کے خاندان سے تھے۔ والدِ محترم نواب بشیر احمد خاں بشیرؔ بن نواب محمد احمد خاں احمد بن نواب فقیر محمد خاں گویا المخاطب حسام الدولہ تہور جنگ بہادر بن محمد بلند خاں

برادران و ہمشیرگان: شفیع احمد خاں وفیؔ، رئیس احمد خاں رئیسؔ افسر جہاں بیگم، انیس جہاں بیگم، حشمت آرا بیگم، شوکت آرا بیگم۔

ابتدائی تعلیم: مرزا محمد ہادی رسواؔ سے عربی اور حضرت مولانا قدرت اللہ بیگ صاحب ملیح آبادی سے اردو و فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ شری گومتی پرشاد سے انگریزی تعلیم حاصل کی۔

اعلیٰ تعلیم: سیتا پور اسکول، حسین آباد ہائی اسکول، جوبلی ہائی اسکول، شبلی ہائی اسکول (لکھنؤ) میں اسکولی تعلیم کے بعد ۱۹۱۳ء میں علی گڑھ کے ایم۔ اے۔ او کالج میں داخلہ لیا۔ ۱۹۱۴ء میں آگرہ گئے اور سینٹ پیٹرس کالج میں سینیئر کیمبرج تک تعلیم حاصل کی۔ شانتی نکیتن میں بھی تقریباً چھ ماہ رہے۔

وراثتِ شعر و ادب: نواب بشیر احمد خاں بشیرؔ، مجموعۂ کلام "کلامِ بشیرؔ"، نواب محمد احمد خاں احمدؔ، مجموعۂ کلام "مخزنِ عالم"، نواب فقیر محمد خاں گویاؔ مجموعۂ کلام "دیوانِ گویا"، بیگم نواب محمد احمد خاں احمدؔ، جوشؔ صاحب کی دادی محترمہ مرزا غالبؔ کے خاندان سے تھیں اور شعر و ادب سے خصوصی شغف رکھتی تھیں۔ جوشؔ کی شعر فہمی میں آپ کو ممتاز و عظیم مقام حاصل ہے۔

عقدِ مسعود اقبال: ۱۹۰۷ء میں اشرف جہاں بیگم کے ساتھ عقد اقبال مسعود عمل میں آیا، لیکن ۱۹۱۶ء میں رخصتی سے ممتاز و مشرف ہوئے۔

زوجۂ محترمہ و اولاد: محترمہ اشرف جہاں بیگم صاحبہ کے بطن سے ایک صاحبزادی سعیدہ خاتون صاحبہ اور ایک فرزند ارجمند سجاد حیدر صاحب تولد ہوئے۔ "شریکِ زندگی سے خطاب" اور "رفیقۂ حیات سے" کے زیرِ عنوان نظمیں مقبولِ عام ہوئیں۔

ملازمت: ۱۹۲۵ء میں حیدرآباد میں دارالترجمہ میں ملازم رہے اور ۱۹۳۴ء میں ناظرِ ادب کے عہدے پر سبکدوش ہوئے۔ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۵ء تک اردو آ کے ممتاز ماہ نامے "آج کل" کے مدیر رہنے کا اشرف سلیم اعزاز پایا۔ مشیرِ ادبی، مدیرِ لغت، مدیرِ رسالہ اردو نامہ، ترقی اردو بورڈ کراچی میں ۱۹۵۵ء

ادارت: ماہ نامہ "کلیم" دہلی (۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۹ء) کے مدیر رہے اور ماہنامہ "نیا ادب" اور "کلیم" لکھنؤ کے مدیرِ اعلیٰ (۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۱ء) رہے۔

اعزاز: حکومتِ ہند نے پدم وبھوشن سے اشرف سلیم مشرف تاباں و شاداں اعزاز بخشا۔

تلمذِ سخن: ۲۰ سال تک عزیز لکھنوی سے اصلاحِ سخن لیتے رہے۔

فلمی دنیا: ۱۹۴۳ تا ۱۹۴۸ء فلمی دنیا سے وابستہ رہے۔

تاریخِ وفات: ۲۲ فروری ۱۹۸۲ء م ۲۷ ربیع الآخر ۱۴۰۲ھ یوم شنبہ

مطبوعہ تصانیف: شعری مجموعے۔ روحِ ادب (۱۹۲۱ء دہلی) شاعر کی راتیں (۱۹۳۳) نقش و نگار (۱۹۳۶ دہلی) شعلہ و شبنم (۱۹۳۶ دہلی) فکر و نشاط (۱۹۳۷ء دہلی) جنون و حکمت (۱۹۳۷ء دہلی) حرف و حکایت (۱۹۳۸ء دہلی) آیات و نغمات (۱۹۴۱ لاہور) عرش و فرش (۱۹۴۴ء بمبئی) رامش و رنگ (۱۹۴۵ء بمبئی) سنبل و سلاسل (۱۹۴۷ء بمبئی) سیف و سبو (۱۹۴۷ء لاہور بمبئی) سرود و خروش (۱۹۵۳ دہلی) سموم و صبا (دہلی) طلوعِ فکر (۱۹۵۷ء کراچی) الہام و افکار (۱۹۶۶ء کراچی)، موجد و مفکر (لکھنؤ) نجوم و جواہر (۱۹۶۷ء کراچی) نثری مجموعے: مقالاتِ زریں (۱۹۲۱ء لکھنؤ) اوراقِ سحر (۱۹۲۱ء لکھنؤ) ارشادات (۱۹۴۳ء دہلی) یادوں کی برات (۱۹۷۲ء کراچی)

پہلی نظم:
گیارہ سال تک کی عمر میں غزل کہتے رہے۔ ۱۹۱۴ء کے لگ بھگ پروفیسر وحید الدین سلیم پانی پتی کے مشورے و رہنمائی اعانت پر غزل کے ساتھ ساتھ نظم گوئی کا آغاز فرمایا۔

جوشؔ کی پہلی نظم کا نام "ہلالِ محرم" ہے۔

پہلا شعر:
۱۹۰۷ء میں صرف نو سال کی عمر میں پہلا شعر کہا ؎

شاعری کیوں نہ راس آئے مجھے
یہ مرا فنِ خاندانی ہے

(جوشؔ)

●

محافظ النساء شعیبین ۸۷۹-۳-۲۰، رحیم منزل، شاہ گنج، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

کہتی ہے خلقِ خدا...

● اس نمبر میں بلونت سنگھ کی افسانہ نگاری کے بارے میں ہمیں یہ یک وقت اُپیندر ناتھ اشک، شمس الرحمٰن فاروقی، وارث علوی، انور خاں اور حسین الحق کے مضامین مل جاتے ہیں۔ اشک صاحب نے اپنی ضعیف العمری کے باوجود بلونت سنگھ کی زندگی اور افسانہ نگاری دونوں کے بارے میں کافی تفصیل سے لکھا ہے۔ انہوں نے نہ صرف پنجاب کے اس دیہی ماحول کا تجزیہ کیا ہے جو بلونت سنگھ کے افسانوں کی نمایاں خصوصیت ہے بلکہ کرشن چندر اور بیدی کے ساتھ ان کا موازنہ کرکے یہ بھی بتایا ہے کہ بلونت سنگھ کا ادبی قد و قامت کیا ہے۔ اس مضمون میں بعض افسانوں میں پائی جانے والی تکنیکی خامیوں کی طرف بھی ناقدانہ اشارے ملتے ہیں۔ ان خامیوں کی طرف اشک صاحب جیسے پرانے اور منجھے ہوئے افسانہ نگار کی دور بین نگاہ ہی جا سکتی تھی۔ عام قارئین کو ان خامیوں کا اندازہ بھی نہیں ہو سکتا۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے بلونت سنگھ کے بعض افسانوں کا راجندر سنگھ بیدی کے بعض افسانوں سے موازنہ کرتے ہوئے جہاں یہ بتایا ہے کہ اول الذکر کے یہاں بیدی کے اثرات ملتے ہیں وہیں یہ بھی بتایا ہے کہ بلونت سنگھ نے کس طرح اپنے بعد آنے والے افسانہ نگاروں مثلاً غیاث احمد گدی کو متاثر کیا ہے۔ فاروقی کے مضمون میں زیادہ زور افسانوں کی تکنیک پر ہے۔ وارث علوی نے 'پودے' اور 'پہلا پتھر' کی روشنی میں بلونت سنگھ کی کہانیوں کا جائزہ پیش کیا ہے۔

ویسے تو "آج کل" کا زیر تبصرہ شمارہ بلونت سنگھ نمبر ہے، لیکن آخری چند صفحات میں کچھ تبصرے اور چند خطوط بھی شامل ہیں۔ کم از کم دو خطوط کا ذکر کئے بغیر ہماری تشفی نہیں ہوگی۔ پہلا خط پٹھان کوٹ کے پروین کمار اشک کا ہے اور دوسرا آرہ (بہار) کے تاج پیامی کا ہے۔ ہر دو حضرات اردو کے شاعر ہیں۔ اور اس قابل ہیں کہ انہیں کسی چڑیا گھر میں محفوظ کر لیا جائے تاکہ بیرونی سیاح بھی ان سے محظوظ ہو سکیں۔ پروین کمار اشک نے اس شکایت کے بعد کہ ان کی ایک غزل تو "آج کل" میں شائع ہوئی، لیکن اس کے ساتھ نہ تو ان کی تصویر شائع ہوئی اور نہ ہی اور دو غزلوں کو اشاعت کے لئے منظور کیا گیا۔ اطلاع دی ہے کہ:

"میں نئی نسل کا ممتاز شاعر ہوں۔ دستاویزی شواہد موجود ہیں۔ تین مجموعے شائع ہو کر پوری ادبی دنیا میں مقبول ہو چکے ہیں۔" آگے چل کر موصوف مدیر 'آج کل' کو مخاطب کر کے لکھتے ہیں کہ:

"مجھ سے کہیں جونیئر لوگوں کی آپ دو غزلیں "آج کل" میں سال میں دو بار شائع کر رہے ہیں۔ آخر میں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے۔ کیا میں ایک ہندو ہوں" اسلئے؟" بعد ازیں شاعر صاحب نے یہ دھمکی دی ہے کہ "آپ نے اگر میرے سچے حقوق سے اب بھی محروم رکھا اور سال میں دو غزلیں مع تصویر اہتمام کے ساتھ شائع نہ کیں تو میں با دلِ ناخواستہ قانونی چارہ جوئی پر مجبور ہو جاؤں گا اور اپنے حلقے کے ایم پی سے بات کر کے معاملہ پارلیمنٹ میں لے جاؤں گا۔"

اس سلسلے میں ہم سب سے پہلے تو مدیر آج کل کو اطمینان دلانا چاہتے ہیں کہ وہ "ہندو" ہونگی سے بالکل ہراساں نہ ہوں۔ ملک کا جاہل ترین ہندو یا مسلمان عقل سے اس حد تک پیدل نہیں ہوتا ہے۔ اس طرح کی حماقتیں صرف اردو شاعروں سے مختص ہیں۔ پروین کمار اشک صاحب اردو کے ٹھیٹ شاعر ہیں اور دوسرے بہت سے شاعروں کی طرح انہیں بھی اپنے کلام معمولی نظام سے آگے کچھ نظر نہیں آتا۔ اس کے بعد ہم اشک صاحب کو یہ یقین دلانا چاہتے ہیں کہ وہ اپنے کو جس نئی نسل کا ممتاز شاعر کہتے ہیں وہ نئی نسل ابھی پیدا ہی نہیں ہوئی۔ جہاں تک ان کی شاعری کے بارے میں ادبا و شعراء کی ان آراء کا تعلق ہے جنہوں نے انہیں اپنے بارے میں ذہنی خلفشار میں مبتلا کر دیا ہے تو اس تعلق سے عرضِ خدمت یہ ہے کہ اردو میں: ؎

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

والی روایت بے حد پرانی اور اتنی ہی مستحکم ہے۔ جن لوگوں نے ان کی شاعری پر تعریف کے ڈونگرے برسائے ہیں وہ دوسرے نو سکھیوں کے ساتھ بھی اسی طرح کا حسنِ سلوک کرتے اور آئے دن کسی نہ کسی شاعر کو دیوانہ بناتے رہتے ہیں۔

اب تاج پیامی صاحب کے خط سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو لکھتے ہیں:
"آپ نے میری عمدہ غزلوں کو واپس کر دیا۔ مجھے حیرت بھی ہوئی اور صدمہ بھی۔ حیرت آپ کی تنقیدی شعور کی کمی پر ہوئی اور صدمہ اس لئے ہوا کہ آپ نے میری تخلیقات لوٹا کر ان کی تذلیل کر دی۔"

"محبوب صاحب! 'آج کل' آپ کا ذاتی رسالہ نہیں ہے۔ یہ ایک سرکاری رسالہ ہے۔ آپ کو کسی مستند تخلیق کار کی تخلیق لوٹا کر ذلیل کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔ آپ کو مجھ سے معافی مانگنی چاہیئے۔"

تاج پیامی صاحب کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ چونکہ آج کل سرکاری رسالہ ہے، اس لئے غالباً ان کی غزلیں لوٹا دی گئیں۔ ان کی غزلیں چھپ جاتیں تو شاید بے چارے مدیر کو اپنی ملازمت سے ہی ہاتھ دھونا پڑتا۔ جہاں تک تخلیقات کی تذلیل کا سوال ہے کم از کم تاج پیامی جیسے لوگوں کو اس کا اس لئے برا نہیں ماننا چاہیئے کہ وہ اپنی تخلیقات کے ذریعے پوری اردو شاعری کی تذلیل کر رہے ہیں۔ ہم آرہ کے ان شاعروں اور ادیبوں سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں جنہیں آئے دن اس مستند شاعر کو جھیلنا پڑتا ہوگا۔

آخر میں ہم "آج کل" کے قارئین سے سفارش کرتے ہیں کہ وہ "آج کل" کا بلونت سنگھ نمبر ضرور خرید لیں۔ دس روپے تو بلونت سے متعلق اور خود ان کی نگارشات سے ہی وصول ہو جائیں گے۔ پروین کمار اشک اور تاج پیامی "سرِ مفت نظر" کے طور پر دیر تک آپ کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کرتے رہیں گے۔

فضیل جعفری، ایڈیٹر روزنامہ انقلاب
بمبئی

● اس قدر کم صفحات میں اتنے جامع، وقیع اور مکمل فکر و فن اور شخصیت کی ترجمانی بڑے سلیقے، محنت اور لگن کی طالب ہوتی ہے۔ اختر الایمان نمبر، جذبی نمبر اور تازہ بلونت سنگھ نمبر آپ کی خوش سلیقگی کے نقش کو چمکائے رکھیں گے۔ لیکن اس شمارے میں جناب پروین کمار اشک کا خط پڑھ کر بہت دکھ اور افسوس ہوا۔ موصوف نے جس متعصبانہ ذہنیت اور ادبی غنڈہ گردی کا مظاہرہ کیا ہے وہ انتہائی بیہودگی اور بدتہذیبی کا مظہر ہے۔

ممبر پارلیمنٹ کی دھونس، مقدمہ بازی کی دھمکی اور سند میں سوال اٹھانے کی وارننگ دے کر وہ اپنے کلام کو "مطلق کے ساتھ سال میں دو بار" چھپوانا چاہتے ہیں۔ خواہ وہ کلام کیسا ہو۔ شاید وہ اپنی کتابوں پر دوست ادیبوں اور ایڈیٹروں کے لکھے ہوئے پیش لفظ مقدمہ، تبصرہ یا خطوط میں تعریف و توصیف کو وہ کسی یونیورسٹی کی ڈگری تصور کرتے ہیں جس کے بل بوتے پر وہ اعلیٰ ادبی منصب پر تقرر کئے جانے کے اہل ہو گئے ہیں۔ بھائی۔ اس طرح کی بیشتر تحریریں محبت، مروت، دوستی اور حوصلہ افزائی کے لئے لکھی جاتی ہیں اور ان کا مقصد اور مطلب ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ وہ کسی ادبی سند کا درجہ رکھتی ہیں۔ دوسری بات یہ کہ اگر آپ کی تحریر میں یا کلام میں توانائی ہے، جان ہے، صداقت ہے اور فن کاری ہے تو دیر بدیر اس کو ضرور تسلیم کیا جائے گا۔ خواہ وہ پہلے چھپے یا بعد میں اور ڈرا دھمکا کر آپ چھپوا بھی لیں تو کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اس طرح ذات اور عقائد کی بنیاد پر ادب میں رزد و بخشش کا فائدہ اٹھانے کا رویہ افسوسناک بھی ہے اور غلط بھی۔

میں اس رویے کی پرزور مذمت کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ تمام قارئین میری تائید کریں گے۔ اور ادب میں فرقہ واریت پھیلانے کے اس رویے اور احساس کی پوری شدت سے مخالفت اور مذمت کریں گے۔

منظور ہاشمی، علی گڑھ

● ۱۱۲ صفحے میں بے حد معیاری بلونت سنگھ نمبر پر میری جانب سے بہت بہت مبارکباد قبول کریں۔ اداریہ بذات خود مضمون ہے۔ محمد قمر الہدیٰ کا اشاریہ تقریباً نامکمل ہے۔ سمیر سنگھ کا مضمون کچھ اور تفصیل چاہتا ہے۔ شکنتلا سرپٹھیا کا مضمون انکشافی ہے۔ اپیندرناتھ اشک نے جم کر لکھا ہے۔ ان کے مضمون سے اور شمس الرحمٰن فاروقی کے مضمون سے مجھ جیسے ادب کے طالب علم نے بھی استفادہ کیا۔ ان دونوں مضامین سے مختلف گوشے کی وضاحت ہوتی ہے۔ اور بلونت سنگھ پر کام کرنے والوں کے لئے آسانیاں پیدا ہوں گی، اس کا یقین ہے۔ وارث علوی نے کینوس مختصر لیا ہے، لیکن حق ادا کیا ہے۔ انور خاں اور حسین الحق، ساتھ ہی عابد حسن منٹو کے مضامین بھی توجہ طلب ہیں — دیویندر اسر اور مشرف عالم ذوقی کے مضامین انفرادیت رکھتے ہیں۔ ڈھیر ساری تصویریں دے کر آپ نے اس نمبر کو منفرد بنا دیا ہے۔ ایک بار پھر مبارکباد قبول کریں۔

"کہتی ہے خلق خدا" کے تحت پروین کمار اشک اور تاج پیامی کے خطوط پڑھ کر حیران رہ گیا۔ یعنی ایڈیٹر کا فیصلہ آخری ہوتا ہے۔ اپنے رسالے کے مزاج و معیار پر پورا اترنے کے بعد ہی وہ کسی تخلیق کا انتخاب کرتا ہے۔ خیر زور زبردستی کا حق قطعی مناسب نہیں ہے۔ "آج کل" اردو کا بڑا رسالہ ہے۔ ساتھ ہی سرکاری آرگن بھی ہے۔ اس کی اپنی پالیسی ہے۔ حذف و اضافہ اور رد و قبول کرنے کا اختیار مدیر کو ہونا ہی چاہئے۔ یہیں پہ جبیں ہو کر اور دھمکیاں یا کالیاں دے کر تخلیق چھپوانے کا یہ انداز مجھے پسند نہیں آیا۔ بلکہ اشک صاحب اور تاج صاحب کے رویے سے تکلیف پہنچی ہے۔

مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور، بہار

● بلونت سنگھ نمبر کی رسمی تعریف غیر ضروری ہے۔ واقعی یہ نمبر محنت سے مرتب کیا گیا ہے۔ ایک زمانے میں بلونت سنگھ کا شمار نمایاں صف کے افسانہ نگاروں میں ہوتا تھا۔ وہ "پنجاب نگار" کہلاتے تھے۔ بعض اعتبار سے کرشن چندر (زبان اور اسلوب) اور احمد ندیم قاسمی (پنجاب کے دیہات کی پیش کش) کے قبیلے سے تعلق رکھنے کے باوجود وہ اپنی الگ پہچان رکھتے تھے۔ مگر انہیں بہت جلد فراموش کر دیا گیا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ ہو کہ جس پنجاب کی دیہی زندگی کے وہ نباض اور عکاس تھے۔ وہ پنجاب کی تقسیم کے بعد ٹوٹ پھوٹ گیا اور وہ معاشرہ بکھر گیا جس میں پنجاب کے ان جری، بانکے جوانوں کی انفرادیت نے بال و پر نکالے تھے جو بلونت سنگھ کے افسانوں کے مرکزی کردار رہے۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آزادی کے چند سال بعد بلونت سنگھ نے بھی اپیندرناتھ اشک، دیویندر ستیارتھی، گربچن سنگھ وغیرہ کی طرح ہندی کی طرف زیادہ پینگیں بڑھائیں اور اردو جو حیات و موت کی کشمکش میں مبتلا تھی (اور ہے) وہ ہندوں کی طرف غیریت کی نظر سے دیکھنے لگی جو اس کی رتیب کی ننگا و غلط انداز کے لئے رشتہ خطی ہو رہے تھے۔ ایک اور وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ۱۹۶۵ء کے بعد اردو افسانے کا مزاج بھی بدل گیا اور اپنے پیش روؤں کو رد کرنا، نئے لکھنے والوں کا طرۂ امتیاز ٹھہرا۔

ہر حال وجوہ جو بھی ہوں، انہیں بلونت سنگھ سے بے اعتنائی کا جواز نہیں بنایا جا سکتا۔ "آج کل" نے اس کی تلافی کی ایک کوشش کی ہے۔ (اس سے پہلے "کتاب نما" نے بھی بلونت سنگھ پر ایک گوشہ شائع کیا تھا)

بلونت سنگھ کے پہلے دو مجموعے "جگا" اور "تارو پود" ہیں۔ دونوں مجموعے مکتبہ اردو لاہور نے شائع کئے تھے۔ میں ۴۳ء سے ۴۷ء۔ ۱۹۴۵ء تک مکتبہ اردو کی مطبوعات دیکھتا رہا ہوں۔ ان میں سن اشاعت شاذ ہی ہوتا تھا۔ جب چودھری برکت علی اور چودھری نذیر احمد کے درمیان کاروبار کی تقسیم ہوئی تو مطبوعات بھی تقسیم ہوئیں۔ چودھری برکت علی کے پاس مکتبہ اردو اور ادب لطیف رہ گئے۔ چودھری نذیر احمد نے مکتبہ جدید قائم کیا اور اپنا رسالہ "سویرا" جاری کیا جو نیا ادارہ کی جانب سے نکلتا رہا۔ سویرا کے آخری دور ۴۸ء۔ ۱۹۴۷ء کے شماروں کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ "جگا" اور "کالے کوس" نیا ادارہ کے یہاں دستیاب تھے۔

آپ کے نمبر میں کہیں مجھے بلونت سنگھ کے افسانے "خدا کی وصیت" کا نام نہیں ملا ہے۔ اگر میری یادداشت غلط نہیں کرتی تو یہ افسانہ ۱۹۴۵ء میں

"ادبی دنیا" میں چھپا تھا۔ یہ شمارہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں ہونا چاہیے۔ میں اسے بلونت سنگھ کے بہت عمدہ افسانوں میں شمار کرتا ہوں۔ شاید یہ افسانہ اُن کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہوا۔ میں سمجھتا ہوں کہ فکشن کے وہ نوجوان طالب علم جو اردو افسانے کے سنہری دَور سے واقف ہونا چاہتے ہیں، انہیں زیادہ نہیں تو کم از کم ۴۴ء سے ۱۹۴۶ء تک کے تین رسائل "ادبی دنیا" "ساقی" اور "ادبِ لطیف" کی فائلوں کو ضرور دیکھنا چاہیئے۔ اس سنہری دَور کا ایک سنہرا نام بلونت سنگھ بھی ہے۔
مظہر امام، دہلی

● "آج کل" جنوری ۱۹۹۵ء کا شمارہ بلونت سنگھ نمبر کی شکل میں نمودار ہوا۔ یہ نمبر بہت وقیع اور ناقابلِ فراموش رہے گا۔ اس کے لئے آپ کو جس قدر داد دی جائے کم ہے۔ آپ کی مدیرانہ صلاحیت اور سطحِ نظر و انتخاب غیر معمولی مدیر کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔ نمبر نکالنا کوئی بڑی بات نہیں۔ لیکن انتخاب بھلے و تدوین اور رطب و یابس سے پاک چیزوں کو منظرِ عام پر لانے، جس سے فن اور فن کار کی قدر و قیمت کا بخوبی اندازہ اور اس کے فکر و فن کا منصفانہ جائزہ اور محاکمہ اس سے مدیر کی سطحِ نظر اور عالمانہ بلند نگہی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔
قیصر زماں، گریڈیہہ

● بلونت سنگھ نمبر سے اچھا اور کوئی تحفہ نہ ہو سکتا تھا جو آپ نے "آجکل" کے قاری کو نئے سال کی آمد پر دیا۔ میری جانب سے اتنا اچھا نمبر نکالنے پر آپ کو اور "آج کل" کے پورے عملے کو مبارکباد!
یوں تو اس شمارے میں شامل سبھی مضامین خوب ہیں جو بلونت سنگھ کے فن یا ان کی شخصیت کے کسی نہ کسی پہلو کو اجاگر کرتے ہیں۔ لیکن ان سب میں شمس الرحمٰن فاروقی کا مضمون مجھے بہت اچھا لگا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ میرے کسی تعصب کی وجہ سے ہو، لیکن اتنی بات ضرور عرض کروں گا اور بغیر کسی ہچکچاہٹ کے برصغیر میں ان کی جیسی مدلل تحریریں کہیں نظر نہیں آتیں۔
اس شمارے میں پہلے دو خطوط پڑھ کر میری تو ہنسی چھوٹ گئی۔ اور آپ کی ایمان داری پر رشک آیا۔
جس طرح ۱۹۹۴ء میں آپ نے "آج کل" کو ایک انفرادیت بخشی اسی طرح مجھے اُمید ہے کہ آپ ۱۹۹۵ میں اس کو مزید پُروقار بنائیں گے۔
ساجد حمید، سنوگہ

● بلونت سنگھ نمبر دیکھا۔ دیگر دستاویزی نمبروں کی طرح یہ نمبر بھی گوناگوں خوبیوں کا حامل ہے اور بلاشبہ اپنی ان خوبیوں کی وجہ سے ادب کی دنیا میں تادیر یاد کیا جاتا رہے گا۔ سجاد صاحب! آپ نے آکر پتہ نہیں کیا افسوں پھونکا کہ "آج کل" کی کایا کلپ ہو گئی۔ اس شاندار کامیابی پر مبارکباد قبول فرمایئے۔
فاروق شفق، کلکتہ

● آپ کی ادارت میں جو نمبر نکل رہے ہیں وہ آپ کی سوجھ بوجھ اور صلاحیت کے بیّن ثبوت ہیں۔ ہر شمارہ اپنے گزشتہ شمارے سے نمایاں ہی ہوتا ہے۔ آپ کے اداریوں کے بارے میں بھی یہی بات کہی جا سکتی ہے کہ ہر اداریہ کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ اب اس کے بعد کچھ نہیں کہنا ہے۔ آپ کا کہا ہوا حرفِ آخر ہے۔ مگر جب اگلا رسالہ آتا ہے تو لگتا ہے کہ ابھی تو مزید کہنے کی گنجائش تھی۔ بقول شخصے ؎

کہاں تمنّا کا آخری قدم یا رب

محمد حنیف، سندیلہ

● بلونت سنگھ نمبر کے دو عدد خطوط نے تمام قارئین کو چونکا دیا ہے — وہ تاج پیامی صاحب اور پروین کمار اشک صاحب کے خط سے یقینی بدظن اور بدگمان نظر آتے ہیں۔ ان دونوں صاحبان کی اپنی پہچان خواہ کچھ ہو، لیکن ادبی دائرے میں پچھلے شمارے میں شائع شدہ ان کے خط ہمیشہ ایک غیر ادبی، کم معیار اور اخلاق سے جدا تحریر تصوّر کی جائے گی۔
مسرور قیصر، مونگیر

● میں مدھیہ پردیش کے جس شہر میں رہتا ہوں، وہاں اردو کے رسائل نہیں کے برابر آتے ہیں۔ یہاں تو صورتِ حال یہ ہے کہ مسجدوں میں بھی ہندی دکھائی دیتی ہے۔
"آج کل" فروری میں آپ کا اداریہ غور و فکر کی راہیں ہموار کرتا ہے۔
"...... اس صورتِ حال پر ماتم کیا جائے، خوشی کا اظہار کیا جائے، کیا کیا جائے سمجھ میں نہیں آتا۔ ؎
حیران ہوں کہ روؤں یا پیٹوں جگر کو میں
...... اور بقول رشید حسن خاں اب صحیح اردو بولنے والے اور صحیح اردو لکھنے والے بہت ہی کم لوگ رہ گئے ہیں......"
[اداریہ ص: ۲]

آپ کی تحریریں کیوں بولتی ہیں میرے بھائی۔ جانور نہیں بولنے سے تکلیف اُٹھاتا ہے اور آدمی بولنے سے۔ آپ کے اداریے کے چند جملوں نے ذہن کو متحرک کیا ہے۔ آپ نے اپنی باتیں رشید حسن خاں صاحب کے جس قول پر ختم کی ہیں وہیں سے میں اپنی باتیں شروع کرتا ہوں۔
ہندوستان میں اردو اخباروں کی تعداد تو ہندی کے بعد دوسرے نمبر پر ضرور ہوگی۔ مگر کیا ہم نے کبھی غور کیا کہ آزادی کے بعد ہمارے اخبار کا کون سا مزاج سامنے آیا ہے۔ آزادی کے بعد جو نسل سامنے آئی ہے اُسے ہم نے اب تک کیا دیا؟ کیا اردو صحافت نے مشن کے بدلے ایک پیشے کی شکل نہیں اختیار کر لی ہے۔ اخبار معصوموں اور بے گناہوں کی لاشوں کی تصویر کی بجائے دہشت گردوں کی تصویر کچھ اس طرح چھاپتے ہیں جیسے نادرشاہی حکمراں دشمنوں کی گردن چوراہے پر لٹکا دیتے تھے۔ ہم اب تک پتھروں سے سر ٹکرا رہے ہیں۔ مگر کمبخت یہ سر بھی ایسا ہے کہ پھوٹتا نہیں!
ایک عرصے سے اردو زبان و ادب پر بہت کچھ لکھا جاتا رہا ہے۔ اب تک کیا ہوا؟ کچھ لوگ بولیں گے، لکھیں گے۔ ہم یہ کر رہے ہیں۔ ہم اردو کے لئے وہ کر رہے ہیں۔ جلسوں کی قرار دادوں کے ساتھ اپنے نام کو بحروفِ جلی شائع کروانے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ چند جذباتی کلمات

اداہوتے ہیں۔ مگر آزادی کے بعد سے لے کر اب تک کہیں کچھ نہیں، کوئی عمل نہیں۔ بس جذبات ہی جذبات۔ الفاظ ہی الفاظ۔

مکالمے / اداکاری / مکھوٹے / ملمعے — اور پھر پردہ گر جاتا ہے۔ تماشائی سب اپنے اپنے گھر واپس۔ باقی بچ جاتا ہے حساب کتاب!

بٹوارہ آمدنی کا / شہرت کا نام آوری کا / کس کو کیا ملا؟ اس کی فکر ہے۔ مگر آنے والی نسل کو ہم کیا دے رہے ہیں اس کی فکر نہیں۔ آج کی مائیں اردو نہیں جانتیں۔ اردو ہمارے گھروں سے غائب ہو رہی ہے۔ ۲۱ ویں صدی میں جب آپ داخل ہوں گے تو جانتے ہیں آپ کو پڑھنے / سننے والا کون رہے گا۔ صرف اور صرف تخلیق کاروں کا حلقہ۔

آج پٹنہ یونیورسٹی اور مگدھ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے والا ایم اے اردو کا طالب علم ایک سروے کے دوران پوچھے گئے سوال کے جواب میں ادبی رسائل کا نام "منیر" اور "غالب" لکھتا ہے۔ عہدِ حاضر کے افسانہ نگاروں میں راجندر سنگھ بیدی اور کرشن چندر کا نام لیتا ہے۔

یہی صورتِ حال ہے یا میرے! آنے والی نسل کے سامنے ہم کیا پروس رہے ہیں۔ آنے والے کل میں یہی اردو کے اساتذہ بنیں گے اور پھر تیار ہوگی جاہلوں کی ایک بھیڑ۔

خورشید حیات، بلاسپور

● شمس کنول صاحب کا فلم ایکٹریس دیویکا رانی پر مقالہ نظر سے گزرا۔ شمس کنول نے بڑا پیارا مضمون لکھا ہے۔ موصوف جس موضوع پر بھی لکھتے ہیں خوب لکھتے ہیں۔ چنانچہ زیرِ نظر مقالہ جامع اور دلچسپ ہی نہیں بلکہ معلومات افزا بھی ہے۔

دیویکا رانی یقیناً انڈین فلم انڈسٹری کی ایک ایسی فن کارہ تھی جس کے مداحوں میں پنڈت نہرو بھی شامل تھے۔ اس اداکارہ پر اتنا جامع مضمون اب تک تو میری نظر سے نہیں گزرا۔ ویسے سعادت حسن منٹو نے بھی اشوک کمار پر ایک بہت ہی بے لاگ مضمون "منٹو اور فلمی شخصیتیں" میں لکھا ہے۔ کیونکہ منٹو اس دور میں نہ صرف فلم انڈسٹری سے منسلک تھے بلکہ دادا منی اشوک کمار کے بہت قریبی دوست بھی تھے۔ لیکن منٹو نے اپنے اس مضمون میں دیویکا رانی کا کوئی خاص ذکر نہیں کیا ہے جبکہ شمس کنول نے دیویکا رانی پر اشوک کمار کے تاثرات بھی قلمبند کئے ہیں جو اشوک کمار نے ان سے ایک ملاقات میں ظاہر کئے ہیں۔ شمس کنول کا یہ مضمون دیویکا رانی پر ہی نہیں بلکہ بمبئی ٹاکیز کی ایک مکمل تاریخ ہے۔ ان کی تحقیق و تلاش قابلِ قدر ہے۔ بہت محنت سے انہوں نے یہ مضمون لکھا ہے۔

عروج احمد عروج، نیا جالنہ، مہاراشٹر

● فروری کا شمارہ قارئین کے ہاتھوں میں آگیا۔ برق رفتاری کے ساتھ شماروں کا اجراء آپ ہی کا حصہ ہے۔

تبصرے اور شمس کنول کا "بین الاقوامی شہرت یافتہ دیویکا رانی فلمی دنیا کی خاتونِ اول" خاصے کی چیزیں ہیں۔

احمد انیس، لکھنؤ

● اداریہ ایک مرتبہ پھر اہلِ اردو کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ آپ نے بجا فرمایا۔ "پہلے کے شاعر کم از کم دو دو دل جمع کرتے تھے پھر دیوان شائع کرتے تھے۔ اب شاید یہ بات بھی ختم ہوگئی۔" دیویکا رانی پر شمس کنول کا تفصیلی مقالہ رانی صاحبہ کے بارے میں بہت سی جانکاریاں فراہم کرتا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر مقالات بھی بے حد معلوماتی ہیں۔

محمد وجیہہ احمد تصور، جھنیاں، ضلع سہرسہ

● اس شمارے میں شمس کنول نے فلموں کی خاتونِ اول پر جس گہرے تحقیقی انداز میں قلم اٹھایا ہے، اس نے برسوں بعد فلموں سے دلچسپی رکھنے والے مجھ جیسے بے شمار تشنگان کو مطمئن و مسرور کر دیا اور "گنبد کے کبوتر" جیسے دلکش، بامعنی، پُراثر افسانے کی ستائش کے لئے شوکت حیات صحیح معنوں میں تعریف کے مستحق ہیں کہ انہوں نے معنویت سے بھرپور الفاظ چھوٹے چھوٹے جملوں اور گہرے مکالموں کے بوتے پر ماحول، فضا اور کرداروں کو زندگی بخشی۔ قاری کو اوّل تا آخر اپنی جاندار تحریر کے طلسم میں گرفتار کئے رکھا۔ ہر دو قلم کاروں اور 'آج کل' کو مبارکباد!

، بھوپال

● 'آج کل' کا تازہ شمارہ (فروری ۱۹۹۵ء) باصرہ نواز ہوا۔ آپ کا اداریہ پُر مغز ہی نہیں بلکہ فکر انگیز بھی ہے۔ یہ واقعی ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ اردو کے اچھے نثار انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔

دیویندر اسّر، اندر ناتھ چودھری اور سپدا نند کے مضامین اچھے ہیں۔ جناب شمس کنول نے فلموں کی خاتونِ اوّل' دیویکا رانی کی شخصیت، فن، ڈسپلن اور انتظامی خصوصیات کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ جناب سید آفتاب احمد نے بھی اپنے مضمون میں فنِ نقاشی کا اس کی ابتدا سے مختلف ادوار میں اس کے ارتقا اور اس کے مختلف اسکول اور مراکز کا خوب جائزہ لیا ہے۔ منظومات میں علی جواد زیدی، صہبا وحید، شمیم جے پوری، معصوم مرزا، خالد محمود اور ارشد کمال کی تخلیقات بے حد پسند آئیں۔ دیگر تخلیقات بھی بُری نہیں۔ افسانے بھی اچھے ہیں۔ آپ کا یہ اقدام بھی قابلِ صد قدر و تحسین ہے کہ آپ نے اس بار تبصروں میں نثری تصانیف کو ہی ترجیح دی۔ مبارکباد قبول فرمائیے۔

شاغل ادیب، حیدرآباد

● شمس کنول صاحب کا مضمون "فلموں کی خاتونِ اوّل: دیویکا رانی" بہت اچھا مضمون ہے۔ شمس کنول صاحب نے بامبے ٹاکیز کے ذکر میں فلم "محل" کا ذکر نہیں کیا جو کہ ضروری تھا اور بامبے ٹاکیز میں سعادت حسن منٹو، اوپیندر ناتھ اشک، منشی پریم چند اور اختر حسین رائے پوری کا قطعی ذکر نہیں کیا۔ بہرحال چند خامیوں کے باوجود ان کا مضمون خاصا دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔

محمد خالد عابدی، بھوپال

●●

نامقبول ہو ہے آگے :

کلام بہت پسند تھا ان کے کلمات کے مقابلے میں ہر شخص کا کلام ہیچ سمجھتے تھے۔ ایک دن اتفاقاً دیوانِ حافظ کھول کر پڑھنا شروع کیا تو انہیں کچھ لطف نہ آیا۔ ابھی وہ یہ خیال کر ہی رہے تھے کہ خواجہ کے کلام میں شیخ کا سا مزہ نہیں کہ ہوا کے جھونکے نے دیوان کے ورق الٹ دئے اور ترجمان کے سامنے یہ شعر تھا:

چو بشنوی سخن اہلِ دل مگو کہ خطاست
سخن شناس نہ ای دلبرا خطا اینجاست

۱۲۔ ایک فال شیخ علی حزیں سے بھی منسوب کی جاتی ہے۔ شیخ غزل میں اپنے نزدیک خواجہ صاحب کا تتبع کرتے تھے۔ مشہور ہے کہ ایک دن اسی بات کے دریافت کرنے کو کہ مجھے کہاں تک اس تتبع میں کامیابی حاصل ہے۔ دیوانِ حافظ میں فال دیکھی تو اس میں یہ بیت نکلی:

کہ شعرِ تر انگیزد خاطر کہ حزیں باشد
یک نکتہ ازیں دفتر گفتیم و ہمیں باشد

یہ اور اسی قسم کے واقعات کافی شہرت رکھتے ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک اس کا باعث کوئی کرامت یا غیر معمولی کرشمہ نہیں بلکہ وہ مقبولیت ہے جس نے حافظ کی عزت لوگوں کے دل میں بہت بڑھا دی۔ ان کی غزلوں میں حسنِ بیان کے علاوہ عشقِ مجازی کے پیرائے میں عشقِ حقیقی کا بیان ہے جس نے انہیں ہر طبقہ میں مقبول بنا دیا ہے۔ ایک طرف جہاں اس سے آزاد طبع نوجوان لطف اٹھاتے ہیں تو دوسری طرف مشائخ حال و قال کی مجلسوں میں اس پر وجد کرتے ہیں۔ جس طرح درویشوں کی دلچسپی کا مرکز ہیں اسی طرح امیروں اور بادشاہوں کی پسند کا باعث ہو۔ یہ انسان کی فطرت میں داخل ہے کہ وہ آئندہ کا حال جاننا چاہتا ہے۔

ہاتھ دیکھنا، جیوتش، نجوم، رمل، جفر، فال، شگون سب اسی خواہش کے پورا کرنے کے ذرائع ہیں جن سے غیب کی باتیں معلوم ہوتی رہیں۔ ساتھ ہی یہ خاصیت بھی ہے کہ جس شخص سے غیر معمولی عقیدت ہو جائے اُسے معمولی ہستیوں سے بلند سمجھا جانے لگتا ہے اور دل خود بخود اس سے غیر معمولی اور فوق العادت کرشموں کی توقع کرنے لگتا ہے بلکہ یہ تو اکثر دیکھا گیا ہے کہ اس کی معمولی باتوں میں بھی اُسے بڑی گہرائیاں اور وسعتیں نظر آنے لگتی ہیں۔ تصوف چونکہ کلامِ حافظ کا اہم جزو ہے اس لئے مذہبی عقیدت کا پہلو اس میں یقیناً موجود تھا۔ اور لوگ اُسے اللہ والے بزرگ اور صاحبِ کرامت صوفی کا کلام سمجھ کے اس کی قدر کرتے تھے اور اسے متبرک بھی سمجھتے تھے، اس لئے بہت ممکن ہے کہ دنیاداروں اور ہوا و ہوس کے بندوں میں ان کی اپنی خواہش کی تکمیل کی دھن میں دیوانِ حافظ سے فال نکالنے کا خیال پیدا ہوا ہو اور حسنِ اتفاق سے نتیجہ صحیح بھی نکلا ہو اور یہ بات رفتہ رفتہ مشہور ہو گئی ہو۔ یہ بات کچھ ایسی غیر معمولی نہیں۔ لیکن انسان چونکہ عجیب باتیں پیش کرنے اور سننے کا مشتاق رہتا ہے، اس لئے ایسے اتفاقات کرامتوں کی طرف کھینچ لئے جاتے ہیں۔

—— اس میں تو کوئی شک نہیں کہ دیوانِ حافظ سے فال دیکھنے کی روایت کم و بیش اسی طرح پڑی ہے۔ لیکن اس خیال کو بعض مثالوں سے تقویت ہوتی ہے کہ حافظ کا طرزِ بیان اور شاعری کا انداز کچھ ایسا ہے کہ الفاظ عموماً ایسے حاوی اور پہلو دار ہوتے ہیں کہ شعر کے متعدد معنی نکالے جا سکتے ہیں

لذتِ خاموش

(سانیٹ)

شامِ گلشن پہ بہاروں کے سمے لہرائے!
نگہِ شوق نے شاداب نظارے دیکھے!
شفق و نور کے دریا کے کنارے دیکھے!
جگمگاتے ہوئے تاروں کے سمے لہرائے!

کون آیا مرے سینے میں یہ مخمورِ جمال؟
کس کی آواز سے سرشار ہوئی دنیائے شباب؟
کس کی آنکھوں میں چھلکتی ہے یہ صہبائے شباب؟
بزمِ کونین ہوئی جاتی ہے مسحورِ جمال!

چار سو رقص کناں زمزمۂ تاروں کا سماں!
محفلِ دہر پہ عشرت کا سماں طاری ہے!
ذرے ذرے پہ کوئی حسنِ جواں طاری ہے!
دلِ آفاق پہ چھایا ہے بہاروں کا سماں!

ایسے عالم میں ہوں، دنیا کا مجھے ہوش نہیں!
زندگی، لذتِ خاموش ہے، خاموش نہیں

اختر شیرانی

ستارے

شیر محمد کراچوی

ستارو مسکراؤ جھلملاؤ
فضا سے ظلمتِ دوراں مٹاؤ
مرا دل ہے تمہارے دل سے ملحق
کہیں ایسا نہ ہو تم ٹوٹ جاؤ

چمک اب وہ ستاروں میں نہیں ہے
فضا میں آبشاروں میں نہیں ہے
کوئی انگڑائی لینے کو ہوا ہے
قرار اب بے قراروں میں نہیں ہے

مدیرِ اعلیٰ: وقار عظیم — نائب مدیران: فضل حق قریشی، بھگت سروپ کھنّہ، سید آفاق حسین آفاق — شمارہ: ۱۵ اپریل ۱۹۴۷ء
پندرہ روزہ "آجکل" —— قیمت: چھ آنے
ادارہ مطبوعاتِ متحدہ

Regd. No. D.L.-12033/95
R.N. 948/57 (Delhi Post)

Licenced U (DN)—50 to post without pre-payment
NDPSO New Delhi

Vol.53 No.9 Rs.10/- Ajkal (Urdu) April., 1995

۱۹۴۸ء اور ۱۹۵۰ء کی دو یادگار گروپ تصویریں :
دائیں سے کھڑے ہوئے : عرش ملسیانی ، دیویندر ستیارتھی اور جگن ناتھ آزاد
دائیں سے بیٹھے ہوئے : کرشن چندر ، جوش اور مجاز

دائیں سے بائیں : سید احمد ، کاوش بدری ، جگن ناتھ آزاد ، بسمل سعیدی ، جوش ملیح آبادی ،
عرش ملسیانی اور نریش خیامی

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi
Printed by Aravali Printers and Publishers Pvt. Ltd., W-30 Okhla Industrial Area, Phase-II, New Delhi-110020